
ماہنامہ
کرن
اکتوبر 2020
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

بیاد محمود بابر فیصل

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے



0317 2266944

کرن کتاب

مستقل سلسلے

اکتوبر 2020
جلد 42 شمارہ 7
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: [illegible] کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

کیا جانیے اُفق کے اُدھر کیا طلسم ہے
لوٹے نہیں زمیں پر اک بار جو گئے

آج اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے۔ جو پیدائش کی گھڑی سے انسان کے ساتھ چلتی ہے اور ایک دن اچانک اس کو ساتھ لے جاتی ہے۔

اکتوبر آیا ہے تو یادوں کے کتنے در کھل گئے ہیں۔ کتنی یادوں نے دل پر دستک دی ہے۔ جو جانِ انجمن تھا، وہ کہاں چلا گیا۔

محمود بابر فیصل جانِ انجمن ہی نہیں، خود اپنی ذات میں انجمن تھے۔ انہیں شوق تھا میلہ لگانے کا۔ دوستوں کے درمیان وہ بہت خوش نظر آتے۔ دفتر میں بھی ان کے احباب کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ بابر صاحب خوب چہک رہے ہیں۔ چائے سے شغل ہو رہا ہے۔ ساتھ لکھنے کا عمل بھی جاری ہے۔ اس شور شرابے میں وہ کیسے لکھ لیتے تھے۔ یہ بھی ان کا ہی ہنر تھا۔

ان کے دم سے آفس میں رونق تھی لیکن بظاہر ہنستے بولتے لوگوں پر فقرے چست کرتے محمود بابر فیصل کا ایک اور روپ بھی تھا۔ بہت سنجیدہ، بہت حساس، بہت نرم دل۔ یہ روپ ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

"سیاہ رات کا سویرا" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے ان افسانوں میں زندگی کے تاریک پہلو کی عکاسی کی ہے۔ یہ زندگی سے محروم زندہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ وہ کس طرح جیتے ہیں۔ کس گھٹن میں سانس لیتے ہیں۔ غربت، افلاس اور جہالت کے اندھیروں نے ان کی بینائی بھی چھین لی ہے۔

ان کا ناول "کہنا کہ مسافر لوٹ گیا" ناامیدی، یاسیت اور دُنیا کی بے ثباتی کا عکاس ہے۔ وہ زندگی کی بے یقینی اور دُنیا کی بے ثباتی پر نوحہ نہیں کرتے بلکہ زندگی کی تصویر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس یہی محمود بابر فیصل جب ذوالقرنین کے روپ میں بہنوں کی محفل سجاتے ہیں۔ برجستہ شگفتہ جواب دیتے ہیں تو بالکل مختلف شخصیت کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

دُنیا میں ذہانت کی کمی نہیں۔ حاضر جواب، برجستہ گو بھی بہت ہیں۔ خوش شکل، خوش طبع لوگ بھی بہتیرے ہیں لیکن محمود بابر فیصل میں ان سب خوبیوں کے ساتھ کچھ اور بھی ایسا تھا کہ ایک طویل عرصہ بیت جانے کے باوجود آج بھی آفس کے لوگ ان کے ذکر پر اُداس ہو جاتے ہیں۔ ان کے دوست احباب ان کو بھول نہیں پائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیادِ محمود بابر فیصل،
- اداکارہ "عالیہ علی" کہتی ہیں "میری بھی سُنیے"،
- "میرے ہم سفر میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- "دیس میں نکلا ہو گا چاند" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- "سوزِ عشق" کوثر ناز کا ناولٹ،
- ادارہ "ذُباب رانا" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اس ماہ "اقصیٰ شہزاد" کے "مقابل ہے آئینہ"
- فرح بخاری کا مکمل ناول "کنارِ خواب جو"
- مصباح علی سید کا ناولٹ "کانچ سے سائباں"
- بینش مجید کا ناولٹ "ہوتے جو تم مہرباں"
- ایمل رضا، عمارہ خان، مزمل سلیم، فوزیہ سرور، فرحت جبیں، ثانیہ چوہدری، حرا احمد اور سمیعہ خالد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

کرن کتاب، معلوماتی، دلچسپ مضامین اور مزے دار ریسپیز کے ساتھ۔

حمد

کرم کی ابتدا ہے تُو، رحم کی انتہا ہے تُو
شہنشاہ لولاک ہے، ہر چیز پہ قادر ہے تُو

تیری نعمتیں، تیری عنایتیں سب کے لیے ہیں
کسی ایک کا نہیں، رب کائنات ہے تُو

تیرے ہی در پہ آتا ہے دُنیا کا ہر سوالی
خالی لوٹتا ہے کوئی نہ کسی کو لوٹنے دیتا ہے تُو

تیری عظمتیں کمال ہیں میں ہوں بے خبر
مولا بخش دے مجھے، موڑ لے اپنی طرف

مالک دو جہاں ہے تُو، خالقِ کائنات بھی
میرے مولا سب کو پالنے والا رازق ہے تُو

تیری بے نیازی بھی لاجواب ہے مولا
اپنے بھرے خزانوں سے ہمیں نوازتا ہے تُو

تیرے محبوبؐ کا اُمتی ہوں میں یارب
محشر میں بھرم رکھ لینا رسوا نہ ہونے دینا تُو

فخر صابری

نعت

میرا مقدر بھی تو چمکا دیا ہے
درِ پاک پر مجھ کو بلوا لیا ہے

کوئی حد نہیں مجھ کو اتنا ملا ہے
یہ مت پوچھیے مجھ کو کتنا ملا ہے

خدا کی قسم میں تو ہوں نام لیوا
کرم مجھ پہ سرکارؐ نے کر دیا ہے

ہے پیشِ نظر آج راہِ صداقت
خیالِ نبیؐ اب میرا رہنما ہے

جُھکی جا رہی ہے جبینِ محبّت
نگاہوں میں سرکار کا نقشِ پا ہے

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر وہ ہی وہ ہیں
تصوّر میں یہ حال میرا ہوا ہے

غنی کر دیا ہے محبّت نے اُنؐ کی
جہاں رشکِ اعظم پہ کرنے لگا ہے

محمد اعظم عظیم اعظم

بیادِ محمود بابر فیصل

باتیں ہماری یاد رہیں

رُخ چوہدری

میر تقی میر نے کہا تھا کہ

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا
جو کہتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا



اردو ادب سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے اس عمر سے شاعری پڑھی جب سیدھی سادی سی بات بھی سر پر سے گزر جایا کرتی ہے اور پھر ایسی شاعری جو ہزار ہا معنی لیے ہوئے ہو۔ اردو ادب کی طالبہ ہونے کی وجہ سے خوب شاعری اور شاعروں کو پڑھا مگر مندرجہ بالا شعر مجھے اس قدر پسند تھا کہ اکثر دہرایا کرتی گو کہ مطلب کچھ خاص سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب شاعر نے یہ شعر کہا ہوگا تو نجانے اس کے پیش نظر کیا بات ہوگی، کس کے لیے کہا ہوگا۔ مگر میں اس شعر کے پس منظر میں اپنی زندگی کی کچھ ایسی شخصیات کو دیکھتی ہوں جن سے میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ جن کو میں بہترین انسان دوست سمجھتی ہوں۔ ان شخصیات میں جناب محمود ریاض صاحب اور دوسری شخصیت جناب محمود بابر فیصل صاحب ہیں۔ نجانے کیوں اس شعر کو پڑھتے ہی مجھے بابر بھیا یاد آتے ہیں۔ ان کی شخصیت ان کی باتیں واقعی تھیں ہی ایسی کہ بھلائی نہ جاسکیں۔

آج ان کو ہم سے جدا ہوئے کتنے برس بیت گئے ہیں مگر یقین جانیے لگتا ہے وہ اب بھی ہم میں موجود ہیں۔ ان جیسی باتیں تو واقعی پھر نہ سنی گئیں۔ بابر بھائی بہت جواں عمری میں اس دار فانی سے چلے گئے مگر ان کی باتوں کی مہک ابھی تک ہے۔ میں آج ماضی کے آئینے میں دیکھتی ہوں تو ایک بہت ہی خوبرو، باوقار، بارعب سا شخص انگلیوں میں سگریٹ دبائے بات کر رہا ہے۔ اقبال بانو کے ساتھ ڈری سہمی رخ چوہدری ان کی نگاہ کا سوال بنتی ہے تو اقبال بانو میرا تعارف کراتی ہیں، تب وہ بڑے خلوص سے کرن میں لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہاتھ میں دبا سگریٹ رکھ کر مار کر کھول کر مجھ سے پوچھتے ہیں۔

"جی تو رخ چوہدری! افسانہ کی تاریخ تو دیں گی۔" دیوار پر لگے کلینڈر تک ان کا مارکر پہنچ چکا ہے۔

آپ خود سوچیے آپ کبھی جس شخصیت کو تصویروں میں دیکھتے رہے ہوں۔ ان کی تحریری برجستگی کے مداح ہوں۔ وہ شخص آپ کے سامنے بیٹھا آپ کو اتنا معتبر کردے تو زبان کا لڑکھڑانا لازمی



امر ہے نا!

"جی! دس تاریخ کو!"

اب نہ ذہن میں کوئی پلاٹ ہے نہ کوئی خاکہ ہے اور پانچ تاریخ کو آپ دس تاریخ تک افسانہ لانے کا وعدہ کریں تو سمجھ لیں کہ یہ اس شخص کی شخصیت کا رعب ہے، وقار ہے کہ انکار کی جرات نہیں۔

"جی تو آپ دیکھ لیجیے۔ دس کو رخ کرن کے لیے افسانہ لا رہی ہیں۔"

دس کے ہندسے کو مارکر سے دائرے میں قید کر کے انہوں نے ایڈیٹر صاحبہ کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرادیں مگر میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میرے لیے چار دن میں افسانہ لکھنا تقریباً ناممکن تھا مگر مقابل شخصیت کا اتنا رعب تھا کہ انکار بھی ناممکن تھا تب اللہ کا نام لیا اور ایک ہلکا پھلکا سا افسانہ دس تاریخ کو مکمل کر کے دے دیا۔ وہ افسانہ اللہ کے فضل و کرم سے اتنا پسند کیا گیا کہ میں حیران رہ گئی۔

بابر بھیا کی شخصیت جتنی ظاہری طور پر اچھی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ وہ اندر سے اچھے اور خوب صورت انسان تھے۔ ان کا حلقہ یاراں بہت وسیع تھا۔ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی مگر ان کا جو رویہ جو اخلاق اپنی رائٹرز کے ساتھ، ادارے کے ورکر کے ساتھ تھا وہ بے مثال تھا۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں اور اقبال بانو کرن کے آفس گئے تھے، خلاف معمول بہت خاموشی تھی۔ بابر بھائی کی موجودگی کا احساس تھا مگر ان کی مہکتی باتوں کی گونج نہیں تھی۔ شوخ کھنکتے قہقہے خاموشی کی بکل مارے ہوئے تھے۔ میں اور بانو اندر گئے تو خاموشی اور دھواں تھا۔ بانو نے اداسی اور اتنا غمگین نظر آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ خالدہ اسد کے ہاں جو رسالے جاتے تھے وہ اس اطلاع کے ساتھ واپس آگئے ہیں کہ خالدہ اسد آپریشن کے دوران اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں پھر وہ خاموش ہوگئے۔ اس وقت ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک پل کے لیے غیر حاضر نہیں ہوتی، جس کی باتوں کا فسوں ایک لحظہ کے لیے ختم نہیں ہوتا۔ اپنی رائٹرز اور اپنے سے وابستہ لوگوں سے محبت اور ہمدردی نے ان کو ہر دل عزیز بنایا ہوا تھا۔

بابر بھائی کی بڑی افسانوی سی شخصیت تھی جب تک لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور صرف پڑھنے کی حد تک محدود تھی تو ان کو بھی پڑھا "ذوالقرنین" کے نام سے "نہلے پہ دہلا" میں لڑکیاں ان کے نام کے کئی کئی حصے کر کے سوالات کرتیں اور وہ شوخ و شنگ جوابات دیتے۔ ذوالقرنین کے بارے میں مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ جس شخص کو محمود بابر فیصل سمجھ کر ملی ہوں وہی ذوالقرنین ہیں جو لڑکیوں کے غلط اور غیر معیاری سوالوں کے بھی ایسے جواب دیتے کہ اگر وہ سمجھ دار ہوئیں تو ان کی زندگی سنور گئی ہوگی۔

بابر بھائی کی سب سے بڑی خوبی جوان کو سب میں ممتاز کرتی تھی، وہ ان کا اخلاق تھا۔ ہر ایک سے اتنی محبت اور خلوص سے ملتے کہ اگلا خود کو معتبر سمجھنے لگتا۔ تو ابھی میرے چند ہی افسانے چھپے تھے، وہ بھی زیادہ تر خواتین اور شعاع میں کہ ہمیں کرن کی طرف سے کرن شام میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں جو ہر اعتبار سے جونیئر تھی۔ جانا بھی چاہ رہی تھی اور یہ خیال بھی ہمت توڑ رہا تھا کہ ابھی میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ابھی تو لوگ ڈھنگ سے میرا نام بھی نہیں جانتے مگر پھر اس شوق میں کہ وہاں اور بڑی بڑی رائٹرز سے ملاقات ہو جائے گی اور دوسرا میں اس ادارے کے روح رواں جناب محمود ریاض صاحب کو دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اپنے اس خوف کے ساتھ وہاں پہنچی تو بابر بھیا گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس طرح خوش ہوئے جیسے میں کوئی بڑی شخصیت ہوں پھر خلوص سے کہنے لگے۔

”ارے! رخ۔ تم اب آ رہی ہو۔ دیکھو، تمہارے انتظار میں کھڑا ہوں۔“

یہ ان کا اخلاق اور بڑا پن تھا کہ مجھ جیسی جونیئر کو انہوں نے اتنی عزت دی کہ کچھ دیر کے لیے مجھے بھی خوش فہمی ہونے لگی کہ میں شاید بڑی رائٹر بن گئی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ انہوں نے گیٹ پر کھڑے ہو کر اتنے ہی خلوص، اتنی محبت سے اپنے ہر آنے والے مہمان کو اسی طرح کہا ہوگا اور میری طرح سب کی مسافت کی کوفت عزت و راحت میں بدل گئی ہوگی۔

بابر بھائی بظاہر شوخ اور کھلنڈرے تھے مگر رشتوں کے سلسلے میں بے حد مودب! اپنے والد محمود ریاض صاحب کے احترام میں جلتا ہوا سگریٹ بجھانے کی کوشش میں ہاتھ جلا لیا کرتے تھے، ان کے بھائیوں ان کے دوستوں کے انٹرویوز پڑھ کر پتا چلا کہ وہ کتنے سعادت مند بیٹے تھے کتنے مخلص دوست تھے۔

۲۵ اکتوبر کو وہ شخص زندگی سے روٹھ گیا۔ جس کو دیکھ کر جس سے مل کر زندگی سے پیار ہو جایا کرتا تھا اور وہ شخص جس کی باتوں پر لوگ بے ساختہ مسکرا دیا کرتے تھے۔ اس نے اپنی جدائی کا غم دے کر جاتے جاتے سب کو رلا دیا۔

ہم جیسے مداحوں سمیت کون ایسا تھا جس نے بابر بھیا کے لیے دعا نہ کی ہوگی مگر موت کے آگے انسان ازل سے بے بس و مجبور ہے اور ابد تک رہے گا۔ مگر بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو دنیا سے تو چلے جاتے ہیں مگر ان کی باتوں سے، یادوں سے لوگوں کے دل آباد رہتے ہیں۔

ہم سے ان کا خونی رشتہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود لگتا تھا جیسے وہ ہمارے بہت عزیز ہیں۔ وہ خواتین کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی شوخ باتوں میں بھی لحاظ اور نصیحت ہوتی تھی وہ اپنے اخلاق اور خوب صورت باتوں کی مہک بن کر ہمیشہ دلوں میں رہیں گے۔

اس وقت تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ ابھی بھی کہیں موجود ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر گنگنا رہے ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
جو کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

بالکل درست ہے کہ ہم نہ ان کو بھول پائے ہیں۔ نہ ہی ان کی باتوں کو......ان کے رویوں کو ان کے خلوص کو۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی کو جنت کا بلند ترین مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆

زُباب رانا سے مُلاقات

شاہین رشید



دولت، عزت، شہرت، عروج و زوال سب اللہ تعالیٰ کی آزمائشیں ہیں جو اس آزمائش پر پورا اتر جاتا ہے وہ زندگی اور آخرت میں "امر" ہو جاتا ہے۔

آج کل چینلز بہت ہیں اور ان کا پیٹ بھرنے کے لیے ہر طرح کے پروگرامز کی ضرورت بھی ہے۔ ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے فنون لطیفہ کی کہ جو سب سے زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ہر چینل پہ بے حساب دکھائے بھی جاتے ہیں اور ان ڈراموں میں کام کرنے کے لیے لڑکیوں اور لڑکوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب نئے فنکار درکار ہوتے ہیں۔ اور جب نئے فنکار تھوڑی سی بھی شہرت پا لیتے ہیں تو پھر ان کے دماغ آسمانوں کو چھونے لگتے ہیں۔

خیر اس بار آپ کی ملاقات زباب رانا سے کروائیں گے۔ انہیں اس فیلڈ میں آئے ہوئے ابھی تقریباً تین سال ہو گئے ہیں۔ کچھ سیریلز مقبول بھی ہو گئے۔ بس پھر تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ چھوٹی عمر میں شہرت مل جائے تو کیا ہوتا ہے۔

O "کیا حال ہیں زباب؟"

☆ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

O "بہت فون کیے، بہت میسجز کیے مگر کوئی جواب نہیں ملا؟"

☆ "سوری، بہت مصروف تھی اور مصروف ہوں۔"

O "بہت پیاری بھی ہو اور پرفارمنس بھی بہترین ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے تھوڑا غرور ہے؟"

☆ "نہیں، نہیں...... ایسا کچھ نہیں ہے۔ مصروفیات کی وجہ سے کسی کو ٹائم نہیں دے پاتی۔"

O "کچھ لوگوں نے بتایا کہ آپ کو اکثر لوگ "باربی ڈول" کہتے ہیں...... ایسا ہے کیا؟"

☆ ہنستے ہوئے۔ "لوگوں کی محبت ہے۔ کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں اور جب کوئی میرا پیار سے نام پکارتا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ بس لوگوں کی محبت ہے کہ وہ مجھے باربی ڈول کہتے ہیں۔"

O "کتنا عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں؟"

☆ "یہی کوئی تین سال یا شاید اس سے کچھ زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں آئے ہوئے۔"

O "آپ بی اے آنرز کر رہی ہیں۔ اس فیلڈ کے لیے کوئی تجربہ تھا یا کوئی ٹریننگ لی آپ نے؟"

☆ "نہیں کوئی ٹریننگ نہیں لی۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ آرٹسٹ پیدائشی ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو پیدائشی آرٹسٹ سمجھتی ہوں...... اداکاری کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔"

O "گویا اداکاری سیکھنے کے لیے کسی اکیڈمی کی

ضرورت نہیں ہے؟"

☆ "نہیں بالکل بھی نہیں...... کسی اکیڈمی کی ضرورت نہیں ہے۔ اداکاری کبھی بھی گھول کر پلانے والی چیز نہیں ہے۔"

O "عموماً خداداد صلاحیت والے لوگوں کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اداکاری انہیں ورثے میں ملی ہے......تو کیا آپ کو بھی اداکاری ورثے میں ملی ہے؟"

☆ "ارے نہیں ...... بالکل بھی ورثے میں نہیں ملی، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ گھر والوں کو تو اس فیلڈ سے اور میری اداکاری سے دلچسپی ہی نہیں ہے تو غلط نہ ہوگا۔ تو بس اپنی فیملی میں، میں ہی ہوں جو اس فیلڈ میں آئی ہوں۔"

O "آپ کے ڈرامے دیکھتے تو ہوں گے؟"

☆ "ارے نہیں......میرے گھر والے میرے ڈرامے دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ میں خود ہی اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں اور خود ہی سوچتی ہوں کہ کہاں اچھا کیا اور کہاں برا کیا ہے۔"

O "آپ کی شکل بہت پیاری ہے۔ یقیناً بطور ماڈل ہی اس فیلڈ میں آئی ہوں گی؟"

☆ "جی، بالکل میں بطور ماڈل ہی اس فیلڈ میں آئی اور بطور ماڈل اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا اور اس کے بعد ڈراموں میں آئی۔"

O "ڈراموں میں آفرز تو فوراً آ گئی ہوں گی؟"

☆ "نہیں...... ایسا نہیں ہے ...... بلکہ تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک روز بڑے انہماک سے ایک ڈرامہ دیکھ رہی تھی کہ ایک معروف پروڈکشن ہاؤس سے مجھے کال آئی اور ایک سوپ سیریل میں کام کرنے کی پیشکش کردی۔ میں تو پہلے ہی منتظر تھی میں نے "یس" کر دیا۔ کیونکہ اداکاری کا جنون کی حد تک شوق ہے۔"

O "ہاں، وہ تو لگ رہا ہے تو پھر پہلا سیریل کون سا تھا؟"

☆ "پہلا سوپ تھا "نصیبوں جلی" جو کہ کافی مقبول ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے مزید سیریلز کی آفرز آنا شروع ہوگئی تھیں۔"

O "گڈ......اب تک کتنے سیریلز کر چکی ہیں آپ؟"





☆ ''بھئی سب سے پہلا سیریل جو میرے لیے بہت یادگار ہے اور جس کی وجہ سے میں مزید ڈراموں میں آئی وہ تو ''نصیبوں جلی'' تھا۔ پھر ''میرے خدایا۔ بندش۔ خالہ کی بیٹیاں۔ رشتے بکتے نہیں'' اور اب حال ہی میں ختم ہونے والا بلاک بسٹر ڈرامہ سیریل ''محبوب آپ کے قدموں میں'' تھا مجھے امید ہے کہ ''ہم ایوارڈ'' کے لیے ''سونیا'' کے کردار کے لیے میری نامزدگی ضرور ہوگی۔ ویسے سیریل ''میرے خدایا'' میں بہترین پرفارمر پر ''لکس ایوارڈ'' میں...... میں نامزد ہو چکی ہوں۔''

O ''بڑے اور سینئرز کے ساتھ کام آسان لگا یا مشکل؟''

☆ ''وہ فنکار جنہیں ہم کل تک ٹی وی اسکرین پہ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے ان کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور پھر ان کے ساتھ کام کر کے بھی بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر روبینہ اشرف صاحبہ اور جاوید شیخ کے ساتھ۔''

O ''اس فیلڈ میں کیا کشش نظر آئی، شہرت کی یا پیسوں کی؟''

☆ ''دونوں کی۔ شہرت کا تو خیر اپنا ہی مزا ہے اور پیسے میں ویسے ہی بہت کشش ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار میری کمائی کے دس ہزار میرے ہاتھ میں آئے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے دس لاکھ آ گئے ہوں۔ اتنی زیادہ خوشی ہوئی تھی مجھے۔''

O ''تو پھر ''اتنی بڑی'' رقم کو کہاں خرچ کیا؟''

☆ ''مسکراتے ہوئے سچ میں میرے لیے بہت بڑی رقم تھی اور میں نے اسے اپنے لیے ہی خرچ کیا۔ کیونکہ میرے گھر والوں کو میرے کام سے میری کمائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

O ''گویا فضول خرچ ہو؟''

☆ ''کہہ سکتی ہیں، جب ہاتھ میں پیسے ہوں تو پھر نہیں سوچتی کہ کہاں کہاں خرچ کرنے ہیں۔ بس خرچ کرنے ہیں البتہ خالی جیب ہو تو پھر بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا پڑتا ہے۔''

O ''مزید سوالات سے پہلے میں چاہوں گی کہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟''

☆ ''میں 3 جون 1988ء میں پیدا ہوئی۔ عمر چھپانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ اس لیے برملا اپنی ڈیٹ آف برتھ بتاتی ہوں۔ ہم دو بہنیں ہیں اور ہمارا ایک ہی بھائی ہے۔ والدین دونوں ہی جاگیردار ہیں اور ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں اور اسی لیے گھر بھر کی لاڈلی بھی ہوں۔''

O ''تب ہی وہ آپ کے ڈرامے نہیں دیکھتے؟''

☆ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ میری فیلڈ ہے اور میری فیلڈ کسی کو پسند نہیں تو اس سے کوئی محبت ختم تو نہیں ہوسکتی نا......''

O ''زباب آپ کا نام بڑا یونیک ہے...... کس نے رکھا اور اس کا مطلب کیا ہے؟''

☆ ''والد صاحب کے ایک قریبی دوست جو

کہ ایران میں رہتے ہیں انہوں نے میرا نام رکھا اور میرے نام کا مطلب ''شہد کی مکھی'' ہے۔ چونکہ یہ نیا اور یونیک نام تھا اس لیے سب کو پسند آیا اور سب کے مشورے سے رکھا گیا۔''

O ''پڑھنے میں دل لگتا تھا؟''

☆ ''بچپن میں تو پڑھائی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ مگر جب تھوڑی بڑی ہوئی تو احساس ہوا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے اچھی تعلیم بہت ضروری ہے اور پھر میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا۔''

O ''دور کون سا اچھا ہوتا ہے..... گزرا یا موجودہ؟''

☆ ''بچپن کا دور اچھا ہوتا ہے، بالکل ٹینشن فری ہوتا ہے جب دل چاہے سو جاؤ جب دل چاہے اٹھ جاؤ بہت بے فکری کا دور ہوتا ہے اور یہ دور بھی اچھا ہے کمائی کرنے والے کے سب نخرے برداشت کرتے ہیں۔''

O ''ذاتی زندگی کتنی متاثر ہوئی؟''

☆ ''جب اس فیلڈ میں قدم رکھا تو آگے پیچھے کی کچھ خبر نہیں تھی کہ کس کے ساتھ کیسی ڈیل کرنی ہے۔ کس طرح بات کرنی ہے تو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ کرنا سیکھ گئی ہوں۔ اب اس فیلڈ میں مزا آ رہا ہے۔''

O ''فلموں سے کیوں دور ہیں؟''

☆ ''میں تو دور نہیں رہنا چاہتی۔ بس ابھی تک کوئی اچھا پروجیکٹ نہیں ملا..... ویسے آج کل ایک پروجیکٹ کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ میری تو بہت خواہش ہے کہ میں فلم میں کام کروں۔''

O ''پاکستانی فلموں میں یا پڑوس میں؟''

☆ ''پڑوسیوں سے تو اب تعلقات ہی اچھے نہیں ہیں تو ان کے بارے میں کیا سوچنا..... ویسے بھی جو عزت، شہرت اپنا ملک دے سکتا ہے اور کوئی نہیں..... ویسے بھی مجھے صرف اپنی فلموں میں ہی کام



کرنا ہے کسی اور کی نہیں، خاص طور پر بالی ووڈ کی۔''

O ''ماشاء اللہ کم عرصے میں زیادہ شہرت مل گئی ہے تو یہ سب تمہاری محنت کا نتیجہ ہے یا قسمت اچھی ہے؟''

☆ ''میرا خیال ہے کہ قسمت اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قسمت ہی انسان کو بناتی ہے۔ اگر آپ کی قسمت اچھی ہے تو مٹی کو بھی ہاتھ لگائیں گی تو وہ سونا بن جائے گی۔ ورنہ سونا بھی مٹی ہو جائے گا۔''

O ''پریشان ہوتی ہیں تو کیا کرتی ہیں؟''

☆ ''تب اپنی ساری پریشانیاں اللہ کے سپرد کر دیتی ہوں کہ وہ جو کرے گا بہتر کرے گا اور وہ ہی پریشانیوں کو دور بھی کرے گا۔''

O ''نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہیں؟''

☆ ''کوشش تو بہت کرتی ہوں۔ مگر کرائسس میں تو بہت پابندی سے پڑھتی ہوں۔ اللہ ہماری نادانیوں کو سمجھتا ہے۔ مگر وہی غفور و رحیم ہے۔''

☆☆

میری بھی سنئے

عالیہ علی

شاہین رشید



1 ''نام؟''

''عالیہ علی۔''

2 ''کسی نے نام بگاڑا؟''

''نہیں......عالیہ کہتے ہیں یا کبھی کسی کو بہت پیار آجائے تو وہ علی کہہ دیتے ہیں۔''

3 ''جس سال میرا جنم ہوا؟''

''22 فروری 1989ء۔''

4 ''گھر میں بولی جانے والی زبان؟''

''اردو......اور پنجابی۔''

5 ''بہن بھائی؟''

''ہم سات بہنیں ہیں اور میرا نمبر چھٹا ہے۔ بدقسمتی سے والدین نہیں ہیں۔''

6 ''تعلیم؟''

''بی اے۔''

7 ''بچپن کی ایک پیاری عادت؟''

''میں میٹھا بہت کھاتی ہوں، کیونکہ مجھے پسند ہے اور بچپن میں جب میٹھے کی طلب ہوتی تھی تو چینی کھاتی تھی مگر کسی سے مانگتی نہیں تھی۔ تو مجھے تو اپنی یہ عادت اچھی لگتی تھی مگر امی کو بری کہ ایک تو میٹھا بہت کھاتی ہو اور پھر بتاتی بھی نہیں ہو۔''

8 ''میرا پہلا کمرشل؟''

''ایک ٹیلکم پاؤڈر کا کمرشل تھا۔ اچھا لگا تھا اپنے آپ کو اسکرین پہ دیکھ کر بس پھر تو چل سو چل۔ ڈرامے کمرشلز ملتے گئے اور کام ہوتا رہا۔''

9 ''مجھے یاد ہے؟''

''اپنی کمائی جو کہ صرف 506 روپے تھی اور اتفاق دیکھیں کہ گھر میں ہم صرف چار بہنیں تھیں کیونکہ تین بہنوں کی شادی ہوچکی ہے تو ہم چاروں بہنوں نے اس 500 روپے کی پارٹی کی تھی......اب تو 500 روپے پانچ دس روپے کی طرح ہوگئے ہیں۔''

10 ''مجھے اعتبار ہے؟''

''بیماری کی حالت میں مجھے صرف ڈاکٹرز پر اعتبار ہے۔ کیونکہ ان کی دوائیاں جلدی اثر انداز ہوجاتی ہے۔''

11 ''امی کی باتیں جو یاد آتی ہیں؟''

''میری امی ہمیشہ مجھے اسکول کے لیے دو لنچ باکس بنا کر دیتی تھیں کہ ایک تم نے کھانا ہے اور دوسرا کسی کے ساتھ بانٹ کے کھانا ہے۔ پھر کہتی تھیں کہ جھوٹ نہیں بولنا، کیونکہ جھوٹ سے سچ پر پردہ نہیں

پڑ سکتا اور اپنی کمائی کو ہمیشہ بانٹ کر کھانا۔ اس سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔''

12 ''سچی خوشی ملتی ہے؟''

''جب پرستار ملتے ہیں اور میرے ڈراموں اور خاص طور پر میرے کیے ہوئے کرداروں کی تعریف کرتے ہیں۔''

13 ''کس سیاست دان سے ملنے کی خواہش ہے؟''

''سیاست دان سے تو نہیں البتہ قاسم علی شاہ سے کیونکہ وہ بہت اچھے، مخلص اور نالج رکھنے والے انسان ہیں، پڑھے لکھے انسان ہیں، بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔''

14 ''پچھتاوا ہوتا ہے؟''

''ہاں بالکل ہوا۔ کیونکہ زندگی میں کچھ فیصلے ایسے ہوئے جو غلط ثابت ہوئے تو بس اسی کا پچھتاوا ہے۔''

15 ''اچھا پکا لیتی ہوں؟''

''پکانے سے لگاؤ ذرا کم ہی ہے۔ مگر ہاتھ میں لذت ہے اس لیے جو پکاتی ہوں اچھا پک جاتا ہے اور الحمدللہ پکانا مجھے سب کچھ آتا ہے۔''

16 ''کس کی مار اور کس کی ڈانٹ یاد آتی ہے؟''

''امی کی مار اور ابو کا پیار بہت یاد آتا ہے ویسے مار تو میں ٹیچر سے بھی کھاتی تھی۔''

17 ''میں نظر انداز کر دیتی ہوں؟''

''جب دو لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں تو میں بجائے ان کی باتیں سننے کے انہیں اگنور کرتی ہوں۔ پھر یا تو میں ہینڈ فری کانوں میں لگا لیتی ہوں یا پھر اس جگہ سے اٹھ جاتی ہوں۔''

18 ''میرے پسندیدہ چینل؟''

''میرا پسندیدہ چینل تو کارٹون چینل ہے اور اس کے بعد وہ چینل پسندیدہ ہو جاتا ہے جس پر میرا ڈرامہ آرہا ہوتا ہے۔''

19 ''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟''

''میں کبھی بھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتی۔ ہمیشہ اپنی غلطیاں نکالتی رہتی ہوں اور پھر کوشش کرتی ہوں کہ آئندہ ایسی غلطیاں دوبارہ نہ کروں۔''

20 ''ان کے ساتھ بھی کام کیا جنہیں کبھی فلم میں دیکھا کرتی تھیں؟''

''جی بالکل کیا۔ ایک فلم دیکھی تھی ''چوڑیاں'' اس میں صائمہ جی اور معمر رانا نے کام کیا تھا۔ پھر ایک ڈرامے میں ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا تو بہت خوشی بھی ہوئی تھی اور اچھا بھی لگا تھا۔''

21 ''معجزوں پر یقین ہے؟''

''بالکل ہے۔ معجزوں پر ہی یقین رکھتی ہوں۔ خوابوں پر یقین نہیں رکھتی۔''

22 ''پسندیدہ شہر؟''

''لاہور لاہور ہے اور جب بھی لاہور جاتی ہوں وہاں کی فوڈ اسٹریٹ ضرور جاتی ہوں کیونکہ مجھے وہاں کا کھانا بہت پسند ہے۔''

23 ''شادی کے لیے میری سوچ؟''



''شادی شریعت خداوندی بھی ہے، اس میں بہتری بھی ہے اور زندگی کا لائف پارٹنر بھی مل جاتا ہے۔''

24 ''باتیں دل میں رکھتی ہوں یا بتا دیتی ہوں؟''

''دل میں نہیں رکھتی، گھر والے کہتے ہیں کہ تمہاری زندگی میں کچھ اچھا ہو یا برا جب تک سب کو بتا نہیں دیتیں تمہیں سکون نہیں ملتا۔ تو کیا کروں یہ میری عادت ہے۔''

25 ''کبھی ماضی یاد آیا؟''

''بہت یاد آتا ہے۔ بہت سی باتوں پہ بہت رونا آتا ہے۔ والدین بہت یاد آتے ہیں۔ ان کو یاد کرکے بہت روتی ہوں۔ کبھی اپنی بے وقوفیوں کو سوچ کر ہنستی ہوں۔ کبھی افسردہ تو کبھی انجوائے کرتی ہوں ماضی میں جا کر۔''

26 ''فیشن کرنا پسند ہے یا سادگی؟''

''گھر پر ہوتی ہوں تو بہت سادگی میں ہوتی ہوں۔ جبکہ کہیں جاتی ہوں تو پھر اچھی طرح تیار ہو کر جاتی ہوں۔''

27 ''تیاری میں وقت لگتا ہے؟''

''ہر وقت شوٹ پہ رہنے سے تیار ہونے کی عادت ہو گئی ہے اس لیے کہیں بھی جاؤں جلدی تیار ہو جاتی ہوں۔''

28 ''خواتین میں پسندیدہ رائیٹر؟''

''مجھے نزہت سمن بہت پسند ہیں۔ ''بھروسا پیار تیرا'' جو بہت مقبول ہوا تھا۔ اس میں میں نے بھی کام کیا تھا۔''

29 ''کس چیز کے لیے کمپرومائز نہیں کر سکتیں؟''

''نیند کے لیے...... نیند کے لیے دنیا کی ہر چیز سائیڈ پہ رکھ دینے کو راضی ہو جاتی ہوں۔ کوئی کمپرومائز نہیں کرتی نیند پر۔''

30 ''کب بہت خوش ہوتی ہوں؟''

''جب کوئی اچھا اور نیکی کا کام کرتی ہوں تو بہت سکون ملتا ہے اور وہ دن میری زندگی کا بہت خوب صورت، پرسکون اور خوشی کا ہوتا ہے۔''

31 ''خواتین کے لیے میک اپ کتنا ضروری ہے؟''

''ضروری نہیں ہے۔ بس ایجاد ہو گیا ہے تو کر لیتے ہیں اور جب میک اپ نہیں ہوتا تھا تب بھی تو خواتین گزارہ کر لیتی تھیں۔ اب نہیں ہوگا تو ہم بھی کر لیں گے۔''

32 ''کیا چیز کبھی بھی کھا سکتی ہوں؟''

''کھجور مجھے بہت پسند ہے اور اسے میں کبھی بھی، کسی بھی وقت کھا سکتی ہوں۔''

33 ''نروس ہو گئی تھی......''

''جب پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تھا۔ بہت کپکپا رہی تھی میں، ڈائیلاگ بھی بولنے نہیں آ رہے تھے۔ مگر پھر جلدی سیٹ ہو گئی۔''

34 ''بیماری میں کیا کھانے کو دل چاہتا ہے؟''

''گول گپے اور دہی بھلے۔ یہ عادت بچپن سے ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں یہ دو چیزیں کھا کر ٹھیک بھی ہو جاتی تھی اور اب بھی ہو جاتی ہوں۔''

35 ''مستقل طور پر کس ملک میں رہنا چاہتی ہوں؟''

''صرف اور صرف اپنے ملک میں۔ پاکستان سے بڑھ کر کوئی ملک نہیں۔ اللہ ہمارے ملک کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔''

36 ''زندگی کیا ہے؟''

''زندگی آپ کی ''نیت'' آپ کا کردار۔ آپ کی شخصیت اور آپ کی تربیت کو واضح کرتی ہے۔ زندگی خدا کا تحفہ ہے اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔''

37 ''زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟''

''ہر انسان کو اپنی زندگی کا مقصد تلاش کرنا چاہیے میری کوشش ہے کہ میں زندگی میں کوئی ایسا کام کر جاؤں کہ لوگ مجھے یاد رکھیں اور میرا نام زندہ رہے۔''

38 ''موجودہ حکومت کے بارے میں آپ کی رائے؟''



”وہی جو سب کی ہے۔ کچھ نہیں کیا اس نے آ کر یعنی عمران خان نے اور سچ پوچھیں تو بہت مایوس کیا ہے اس نے۔“

39 ”ڈالر، پاؤنڈ اور درہم کمانے کو دل چاہتا ہے؟“

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ہاں اگر باہر کہیں مجھے اداکاری کی آفرز آئیں تو ضرور جاؤں گی۔ کیونکہ مجھے اداکاری کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔“

40 ”جب غصہ آتا ہے تو؟“

”کوشش کرتی ہوں کہ خاموش رہوں۔ کیونکہ غصے میں عموماً دل کی باتیں باہر آ جاتی ہیں اور پھر ہم اپنی باتوں سے بہت کچھ کھو دیتے ہیں۔ اس لیے بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں۔“

41 ”گھر میں کون کھانا پکانے کا ماہر ہے؟“

”ہم سب بہنیں کھانا بہت اچھا پکا لیتی ہیں۔ اس لیے کسی ایک کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ کون اچھا پکاتی ہیں اور نہیں۔“

42 ”شاپنگ میں پہلی ترجیح؟“

”میری بھانجیاں...... جب تک میں ان کے لیے کچھ خرید نہ لوں میری شاپنگ مکمل ہی نہیں ہوتی۔“

43 ”بی پی کو کس طرح نارمل کرتی ہوں؟“

”پانی پی کر، اپنے آپ کو کام میں مصروف کر کے اور کسی سے بات نہ کر کے۔“

44 ”اگر ہوسٹ ہوتی تو کس کا انٹرویو کرتی؟“

”مجھے محمد قوی خان بہت پسند ہیں۔ تو اگر ہوسٹ ہوتی تو ان کا انٹرویو تو ضرور کرتی۔“

45 ”پسندیدہ سیاست دان؟“

”مجھے بانی پاکستان قائداعظم بہت پسند ہیں۔ بے نظیر بھٹو بے انتہا پسند ہیں۔“

46 ”میری فیوچر پلاننگ؟“

”کوئی نہیں۔ جو آج ہے وہ ہی اپنا ہے۔ کل کا کچھ پتا نہیں ہے۔ بس میری خواہش ہے کہ میں جب تک جیوں ایک اچھی انسان بن کے جیوں۔“

47 ”گھبرا جاتی ہوں؟“

”جب کسی بہن کا یا کسی کا بھی فون ایسے ٹائم آ جائے جب توقع نہ کی جا رہی ہو تو نہ صرف میں گھبرا جاتی ہوں۔ بلکہ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے۔“

48 ”نفرت کرتی ہوں؟“

”نہیں نہیں...... اللہ نہ کرے۔ کسی سے نفرت نہیں کرتی، محبت بانٹو اور محبت لو والے فارمولے پر عمل کرتی ہوں اور درگزر کرنے والی بندی ہوں۔“

49 ”ایک بات جو میں سب سے کہنا چاہتی ہوں؟“

”کہ یہ نہ سوچا کریں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر اس چیز اور خوف کو لے کر بیٹھ گئے تو پھر دنیا میں آپ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ آپ وہ کریں جو آپ کا من چاہتا ہے۔“

50 ”میں خوف زدہ رہتی ہوں؟“

”آنے والے وقت سے، جدائیوں سے جو بچھڑ گئے ہیں وہ یاد آتے ہیں۔ بہت روتی ہوں کہ کیا اب ان سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ اپنے والدین بہت یاد آتے ہیں۔“

☆☆

مقابل ہے آئینہ

اقصیٰ شہزاد

ادارہ

س ''اصلی نام کیا ہے۔ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج ''اصلی نام اقصیٰ ناز ہے۔ جبکہ شہزاد لکھنا اچھا لگتا ہے۔ امی ، بھائی شہزاد اور بھائی سجیل (جیلی) عیشو اور عیشی کہتے ہیں بہنوئی ناز کہہ کے بلاتا ہے۔ اور بچپن کا ایک نام (ربڑ) ہاہاہا۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ کہتا ہے کہ بس تھوڑی توجہ دینے کی ضرورت ہے، نہیں تو کسی سے کم تم بھی نہیں ہو۔'' (آہم)

س ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''حسین صورتیں دیکھ کر دل سے اختیار ماشاء اللہ نکلتا ہے اور سوچتی ہوں کہ اللہ کسی کسی کو کتنا حسن عطا کرتا ہے۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''تو ضرور لیں، لیکن نکلے گا کچھ بھی نہیں۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''نہیں جی، بلکہ مجھے تو چڑیلیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہاہاہا۔''

س ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج ''مہمان اچھے لگتے ہیں لیکن ان کے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا، بس مل کر کمرے میں چلی جاتی ہوں۔''

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''کھانے میں میٹھا بہت پسند ہے۔ اور اگر آئس کریم کوئی ہر وقت کھلا دے تو آرام سے کھالوں گی ہاہاہا۔ جبکہ سبزیاں اتنی نہیں پسند اور گوشت سے تو بالکل نہیں لگتی۔''

س ''اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج ''جن کو پانچ سال کی حکومت ملی وہ کچھ نہ کر سکے میں ایک دن میں کیا کروں گی۔ ویسے چھوٹے بچے جو مانگ رہے ہوتے ہیں انہیں دیکھ کے بہت دکھ ہوتا ہے۔ تو بس ان کے لیے ہی کچھ کروں گی۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''علامہ اقبال اور احمد فراز۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''ہاں بھی اور نہیں بھی۔ بس غلط بات برداشت نہیں کرسکتی۔ غصہ بہت جلد آجاتا ہے۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج ''مرد حضرات ذمہ دار، سنجیدہ اور عورتیں جلد گھلنے ملنے والیں اور ہنس مکھ۔ سڑے ہوئے لوگ نہیں پسند۔''

س ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی؟''

ج ''تو ہم جو بجلی جانے پر بجلی والوں کو سنہرے القابات سے نوازتے ہیں۔ اور بجلی آنے پر اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ تو وہ کیسے کرتے۔''

س ''اللہ پاک کو یاد کرنے کا سب سے بہترین وقت؟''

ج ''فجر کے وقت اور رات کو عشاء کے وقت۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''امی کے بقول فضول خرچ کیونکہ میں ڈائجسٹ بہت لیتی ہوں اس لیے۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''
ج ''جی بالکل......''
س ''وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''
ج: ''مجھے پروا نہیں زمانے کی مجھے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا دنیا کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ اب کیا دنیا کے ڈر سے جینا چھوڑ دیں۔''
س ''آپ کسی سنسان رستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''
ج ''لگ جائے کیا مطلب لگا تھا وہ بھی دو بار اور قسمت اچھی تھی جو دونوں بار چودہ ٹیکے لگوانے سے بچ گئی۔''
س ''آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟''
ج: ''محبتیں پناہ مانگتی ہیں لوگ اس قدر بے وفا ہیں اب......!!''
س ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''
ج ''ان لوگوں کی جن پہ میں نے اعتبار کیا اور انہیں اپنا سمجھا۔''
س ''اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے؟''
ج ''ہاں جی! سمجھ جاتی ہوں اگلے کو کوئی کام آن پڑا ہے مجھ سے، اس لیے اتنی تعریفیں کر رہا ہے۔''
س ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''
ج ''جی، رائٹر کا نام دیکھتی ہوں اگر ڈائجسٹ رائٹر کے ڈرامے ہوں تو پھر اور بھی شوق سے دیکھتی ہوں۔''
س ''اگر دوستیں ناراض ہو جائیں تو کیسے مناتی ہیں؟''
ج: ''میرے ہر اداس پل میں میرا ساتھ چھوڑ جانا یہ کہاں کی الفتیں، یہ کہاں کی دوستی پہلے جب دوست ناراض ہوتی تھی تو جان پہ بن جاتی تھی اور اس کو منانے کے ہزار جتن کرتی تھی۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے۔''
س ''حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟''
ج ''حقیقی خوشی اب ہوگی جب اپنا نام ''مقابل ہے آئینہ'' میں دیکھوں گی۔ ہاہاہا۔''
س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''
ج ''صرف پڑھنے کی حد تک۔''
س ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''
ج ''کہ کسی پہ اعتبار مت کرو، اور نہ ہی کسی کو اپنا راز دار بناؤ۔''
س ''کوئی آخری بات؟''
ج ''آخری بات بس یہی کہ اب یہ شائع بھی ہو جائے۔ ہاہاہا۔
بس خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کو بھی رہنے دیں۔''

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاونٹ نمبر 0010000015680030 ، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500/ روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500/ روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 7000/ روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 8000/ روپے۔

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں انہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر و شاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا درد سر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے۔ نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بے عزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ ارسلہ کو اپنی دوست رومی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔

ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

دسویں قسط





وہ آفس کی ریوالنگ چیئر کی پشت سے سر ٹکائے اپنے بوجھل ذہن کو سہارا دینے کے لیے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ اور گزرنے والے لمحات سوائے اداسی الجھن اور پژمردگی کے کچھ نہیں ڈال رہے تھے اس کی جھولی میں۔

''ہم کیا سوچتے ہیں اور تقدیر ہمیں کیا دکھاتی ہے۔ یہی خدا کی طاقت کو جاننے پہچاننے اور ماننے کے لیے ہمارے ارادوں کا ٹوٹنا ضروری ہے۔''

اس نے مجروح انداز میں سانس بھری۔

''کیا وہ نفس کی تند موجوں میں بہہ جانے والا تنکا ثابت ہوا ہے۔ مگر نہیں۔ اس نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔''

دل تاویل دینے لگا۔

''مگر تھی تو فقط نفس کی تسکین، اس سے محبت تو نہیں۔'' وہ پھر بے چین ہو گیا۔

''نکاح کے لیے محبت شرط تو نہیں۔ کتنے بہت سے لوگ ہیں جو محبت کے بنا ازدواجی زندگی نارمل گزار رہے ہیں۔ ذہن اور دل الگ الگ سمتوں پر۔ مگر رات کی تاریکی انہیں ایک کر دیتی ہے۔''

وہ خود کو مطمئن کرنا چاہ رہا تھا اس بے قراری سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ عجیب تلخی اور اداسی نے اس پر غلبہ پالیا تھا۔ وہ مسلسل دو دن سے ایک ذہنی آزار سے گزر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کی زندگی مکڑی کی طرح نت نئے تجربات کے جال میں الجھ کر رہ گئی ہو۔

موبائل بجنے لگا۔ ہر چار پانچ منٹ بعد موبائل بج رہا تھا۔ مہوش اس سے مسلسل رابطہ کرنے کی کوشش میں تھیں۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ارسلہ میکے کیوں گئی ہے اور دو روز ہونے کو آئے وہ کیوں میکے سے نہیں لوٹی؟ اور اس طرح کے بہت سے سوالات جن کے جوابات اس کے پاس نہیں تھے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل آف کر دیا اور یونہی سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے ٹکائے لمبی گہری سانسوں کے ساتھ خود کو اعصابی کشیدگی سے باہر نکالنے کی ادنیٰ سی کوشش کی پھر ڈھیلے ہاتھ سے انٹرکام دبا کر کافی کا آرڈر دیا۔ اسے لگ رہا تھا دل و دماغ کے سب ہی راستے بند ہو گئے ہوں۔ کوئی سوچ کوئی خیال نہیں ابھرے گا۔ کوئی نقش نہیں ٹھہرے گا۔ شاید پژمردگی، بددلی کی آخری اسٹیج تھی۔

نہ فکر فردا...... نہ یاد ماضی
نہ چین دل کو...... نہ بے قراری
نہ وصل کی لرزشیں نظر میں
نہ بے بسی ہجر کے سمے کی
نہ حد سے گزرا ہوا جنوں وہ
نہ بے کلی ہے وہ پہلے جیسی
بس اک اداسی ہے دھیمی دھیمی
بس اک خموشی ہے بیکراں سی
بس ایک بے نام سی جلن ہے
بس ایک بے درد سی تھکن ہے
جو زندگی کے ادھورے پن کو
حدوں سے آگے بڑھا رہی ہے

☆☆☆

ارسلہ کا وجود اب اماں کو الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تھیں اسے۔ دوسرا دن گزرا تو وہ اسے گھیر بیٹھیں۔

''میکے میں ایک دن تم سے ٹھہرا جاتا نہیں ہے، اب دو روز ہو گئے تم یہاں ڈیرا ڈال کر بیٹھی ہو خیر تو ہے۔''

چائے کا کپ اس کے سامنے تپائی پر رکھ کر امی خود بھی ساتھ والی مسہری پر بیٹھ گئیں۔

وہ موبائل میں گیم کھیل رہی تھی امی کی بات پر ابرو اچکا کر دیکھا۔

''کیوں، کھٹکنے لگی ہوں کیا آپ کو!''

''خدا نہ کرے۔ کھٹکو گی کیوں۔ ایک وہم ستا رہا ہے رات سے سو پوچھ رہی ہوں۔''

''کیسا وہم؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''وہمی تو سدا کی ہیں آپ۔ بولیں، کیا وہم ستا رہا ہے۔'' اس نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے اماں کے متفکر چہرے کو دیکھا۔

''بس یہی کہ کہیں آبص سے جھگڑ وگڑ کر تو نہیں آ بیٹھیں میکے۔'' اماں نے بالآخر اپنا شک کھول دیا۔ جواباً اس نے اچھا خاصا زوردار قہقہہ لگایا کہ امی اسے گھورنے پر مجبور ہو گئیں۔

''ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں۔ تمہارے مزاج سے ویسے بھی ڈر رہتا ہے۔ نیلو ہوتی تو میں یہ سوال ہرگز نہ پوچھتی۔''

امی کا انداز فہمائشی تھا۔ اس کا بے وقت ہنسنا انہیں برا لگا۔

''ہاں بھئی...... نیلو سے تو یہ پوچھیں کہ کہیں احمر نے تمہیں دکھ تو نہیں پہنچا دیا۔ ساس نے دھکا دے کر نہیں نکال دیا۔ اس معصوم حسینہ سے تو آپ کو کسی برائی کی توقع ہی نہیں ہے نا۔''

''اچھا بس...... جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' امی بھڑک گئیں۔

''کس بات کا جواب دوں۔''

''یہی کہ دو دن سے یہاں آخر کیوں بیٹھی ہو۔''

''کوئی جھگڑا وگڑا کر کے نہیں آئی، اپنی مرضی سے آئی ہوں اور اپنی مرضی سے جاؤں گی۔'' وہ نظریں چرا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگی۔

''مرضی سے جاؤں گی مطلب۔ آج بھی نہیں جاؤ گی کیا؟'' امی نے چونک کر اسے گھورا۔

''کیا ہو گیا ہے امی آپ کو......! دو چار دن میکے میں ٹھہر بھی نہیں سکتی۔'' امی کی حیرت اسے جھنجلا گئی۔ ''مائیں تو انتظار کرتی ہیں کہ بیٹیاں شادی کے بعد میکے آئیں آپ ہیں کہ دو دن میں مجھ سے بے زار ہو گئیں۔'' وہ یکدم آنسو بہانے لگی۔ اماں سٹپٹا گئیں۔

''ارے۔ نہیں نہیں...... میرا مقصد تمہاری دل آزاری کرنا نہیں تھا میں تو بس تحقیق کر رہی تھی۔ خوشی سے آئی ہو تو جم جم رہو۔'' امی پیار سے اس کا کندھا تھپکنے لگیں۔ ''ماں ہونے کے ناطے، وسوسے تو اٹھتے ہیں۔ تم کبھی بیا کے اصرار پر بھی نہیں ٹھہرتی ہونا۔ بلکہ ہمارے یہاں تو رات کا کھانا بھی کھا کر نہیں جاتی تھیں، اب یکدم بنا بتائے ٹھہر گئی ہو تو وہم ستانے لگے تھے۔'' اماں پیار سے اس کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ''بیٹی کسے پیاری نہیں ہوتی۔''

''کمرے میں داخل ہوتی اریبہ کو صاف محسوس ہوا کہ وہ محض ٹسوے بہا رہی تھی۔ مصنوعی پن واضح تھا۔ وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے اماں کی باتوں پر دلی رنج پہنچا ہو۔ اور اماں وضاحتیں دیے جا رہی تھیں۔ اسے پیار سے پچکار رہی تھیں۔

''چلو دل پر مت لو۔ تمہیں خوش باش دیکھتی ہوں تو منوں بوجھ اتر جاتا ہے۔ دل شاد ہو جاتا ہے پگلی۔ بس

پلے خوشی سے آؤ خوش ہو کر جاؤ۔"
"وہ لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ گئی۔
"آپ کے خیال میں تو میں لڑاکو جھگڑالو ہوں نا، بس لڑ جھگڑ سکتی ہوں۔"
"آئے لو، ایسا کب کہا میں نے کہ تم جھگڑالو ہو۔ خیر سے اتنے بڑے گھر کی بہو ہو۔ شان سے آتی جاتی ہو عزت بنا کر رکھی ہے اپنی۔ جھگڑالوں کیوں ہونے لگیں۔" امی نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر سہلایا۔ "اور سچ کہوں تمہاری عزت ہماری عزت ہے۔ اور تم تو بڑی سمجھ دار اور صابر شاکر نکلیں۔ آبص کی اتنی بڑی کمزوری کو بھی سہہ رہی ہو۔ ان کے دھوکے کو بھول کر خوش باش رہتی ہو۔"
اماں کو کچھ زیادہ ہی ارسلہ پر فدا ہوتے دیکھ کر اریبہ کو دل ہی دل میں ہنسی آنے لگی۔ اس کا دل چاہا وہ کہہ دے اماں سے کہ "آپی سے بھلائی کی امید تو ہے نہیں۔ کہیں نہ کہیں ان کا کچھ فائدہ ہی ہو رہا ہوگا جبھی صبر شکر سے بیٹھی ہیں سسرال، بلیک میلر نہ ہوں تو۔" وہ الماری کی طرف بڑھ گئی اور دھلے ہوئے کپڑے قرینے سے ایک ایک کر کے رکھنے لگی۔
"کھانا لگادوں۔ بھوک لگ رہی ہوگی تمہیں۔" امی مسہری سے اٹھتے ہوئے بولیں۔
"نہیں، ابھی بھوک نہیں ہے۔" اس نے تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے رکھا پھر پنکھے کو دیکھا۔ حبس کا احساس ہو رہا تھا، اے سی کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔
"بھوک کہاں سے ہوگی آپی۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو پیزا آرڈر کیا تھا آپ نے اور ڈٹ کر کھایا تھا۔ اریبہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔ پھر مسکراہٹ دبائی جواباً وہ اسے گھورنے لگی۔
"تمہیں بڑی جلن ہوگئی۔ پزا آرڈر کیا تھا۔"
"لیں۔ جلن کیوں ہونے لگی۔ آپ نے تو مجھے بھی آفر کیا تھا میں تو اماں کو بتا رہی ہوں آپ کے بھوک نہ لگنے کی وجہ۔"
"اچھا بس، بیا تمہاری بھی زبان بڑی کھلتی جا رہی ہے دیکھ رہی ہوں میں۔" امی نے اسے آنکھیں دکھائیں جن میں تنبیہ تھی۔ وہ مسکرا کر کندھے اچکا کر چپ ہوگئی۔
ارسلہ کو مزید تپ چڑھ گئی۔ اس کی مسکراہٹ اسے طنزیہ لگی تھی یا اس کے اپنے ہی دل کا چور تھا۔
"اسے تو مجھے تپا کر مزا آتا ہے اب اسے بھی چلتا کیجیے...... کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر۔" وہ اسے گھورتی سرہانے سے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں مصروف ہوگئی۔
"یہی سوچ رہی ہوں۔ عقیلہ تو کب سے کہہ رہی ہے۔ وعدے لے چکی ہے مجھ سے کہ بیا کو میری بہو بنانا ہے۔ نہیں بنایا تو خفا ہو جاؤں گی۔ سارے رشتے توڑ دوں گی۔" اماں پلٹ کر کمرے سے نکلتے ہوئے بولیں۔ اریبہ یکدم اس ذکر پر ٹپٹا گئی جبکہ ارسلہ کا ہاتھ موبائل پر مگر نظریں اماں پر جم گئیں۔
"یہ عقیلہ خالہ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے......" اس نے جھٹکے سے موبائل پٹخا اور مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اپنے گھر میں بطور ملازمہ وہ اریبہ کو لے جانا چاہتی ہیں۔ بڑھاپے کا سہارا چاہیے۔" "خبردار، اماں جو ایسا ویسا سوچا بھی آپ نے۔" وہ اماں کی طرف لپکی۔
"ارے یہ تمہیں کیا ہوگیا۔" اماں رک کر پلٹیں اور تعجب سے اسے دیکھا۔ "یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ملازمہ کیوں سمجھنے لگی عقیلہ بہو کو۔"
"تو آپ کے خیال میں شہزادی بنا کر رکھیں گی۔" وہ استہزائیہ ہنسی اور اریبہ کو گھورا۔ "اس کے لیے رشتوں

کی کیا کمی ہے آپ کو۔"

"نہیں کوئی کمی نہیں...... وبائی مرض کی طرح پھوٹے پڑے ہیں رشتے تو۔" اماں اسے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

"بہت مل جائیں گے سکندر سے اچھے۔" وہ اماں کے پیچھے لپکتی کمرے سے نکلی۔ اریبہ دم سادھے کھڑی رہ گئی۔

"یہ آپی سکندر بھائی کی اتنی دشمن کیوں ہو رہی ہیں، سکندر بھائی سے تو ان کی بہت اچھی دوستی تھی۔ ٹھیک ہے خود شادی نہیں کی، نہ کرنی تھی مگر میرے معاملے میں کیوں پھڈے ڈال رہی ہیں۔" اس نے جھنجلا کر الماری کا پٹ بند کیا اور صحن میں سے آتی امی اور ارسلہ کی آواز پر متوجہ ہو گئی۔

"ایک رشتہ ہے میری نظر میں بیا کے لیے۔" وہ اماں کے کندھے کو تھام کر اپنی رخ ان کا طرف کرتے ہوئے خاصی جذباتی دکھائی دی۔

"کیسا رشتہ۔" اماں نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"آبص کا کزن ہے۔"

"بس رہنے دو تم۔" اماں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے نہیں بیاہنا اتنے بڑے گھر میں بیا کو...... اور ایک گھر میں دو بہنوں کو تو بالکل بھی نہیں۔" "تم خیر سے رچ بس جاؤ، یہی بہت ہے۔" اماں ہاتھ جھاڑ کر فریج کی طرف بڑھیں۔

"ارے واہ! میں کیوں نہیں بسوں گی اور رچوں گی تو ایسا...... خیر، آپ کی مرضی، لڑکا باہر سے آیا ہے مطلب لندن سے۔"

"اماں سنی ان سنی کر کے فریج سے چٹنی کے لیے دھنیا پودینہ نکالنے لگیں۔

"تو آپ نے طے کر لیا ہے اریبہ کو اس جہنم میں دھکیلنے کا۔" وہ استہزائیہ نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی۔

نہیں...... ایسا کچھ طے نہیں کیا مگر یہ بھی طے نہیں کیا کہ نہیں دیں گے۔ اور تم ذرا کم ہی جان کھاؤ میری اور جا کر اپنے موبائل میں گیم کھیلو۔ بیا کو کہاں بیاہنا ہے کہاں نہیں...... یہ میرا اور تمہارے ابا کا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔" اماں کے لہجے میں برہمی جھلکنے لگی تھی۔ "اور ہاں اپنے گھر جانے کی کرو۔" بیاہی بیٹیاں بلاوجہ میکے بیٹھی اچھی نہیں لگتیں۔" ان کا لہجہ حکمیہ تھا۔

ارسلہ کو اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے وہ جواب دینے کے بجائے پیر پٹختی کمرے میں لوٹ آئی۔ اریبہ پر نگاہ پڑی تو دماغ میں بے نام سی کھولن ہونے لگی۔

"سنو۔ اماں سے صاف صاف کہہ دینا کہ تمہیں سکندر سے شادی نہیں کرنی۔" وہ استری اسٹینڈ کے پاس آئی۔ جہاں اریبہ استری کے لیے کپڑے نکالے پلگ لگا رہی تھی۔

"سنا تم نے۔ اسی طرح انکار کر دینا جیسے میں نے کر دیا تھا۔" اس نے سلگتی نظروں سے اریبہ کو گھورا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"مم...... میں۔"

"ہاں، دیکھو مجھے، کیسا سسرال ملا ہے عش کر رہی ہوں آج اماں کی بات مان لیتی تو نیلو کی طرح زندگی تنگی سے گزار رہی ہوتی۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو آپا! اماں میرے لیے اچھا ہی سوچیں گی برا تو نہیں۔" وہ حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے بولی مگر ارسلہ کو طیش کے عالم میں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"مطلب تمہیں سکندر کا رشتہ قبول ہے۔ عقیلہ خالہ کی کوٹھڑی میں جا کر دفن ہو جانا چاہتی ہو۔"

"میرے خدا۔ یہ کیسی باتیں کیے جا رہی ہیں آپ......" اسے بہت گراں گزر رہا تھا ارسلہ کا یہ لہجہ یہ جملے۔

"اتنا کشادہ تو گھر ہے ان کا، اور پھر خالہ بالکل امی کی طرح ہی چاہتی ہیں ہمیں۔" وہ ذرا سا رکی پھر جلدی سے بولی۔ "سکندر بھائی بھی تو بہت اچھے ہیں کیا کمی ہے ان میں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی تھی۔ ارسلہ نے چونک کر دیکھا اسے یوں جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

وہ یکدم نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"اور سب سے بڑی بات کہ سکندر بھائی مجھے پسند......"

"بس......" ارسلہ نے ہاتھ اٹھا کر یکدم چیخ کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور غصے سے استری اسٹینڈ پر پھیلی قمیص کھینچ کر زمین پر پھینکی اور آنکھیں چڑھا کر اسے دیکھا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"ہاں ہیں......شادی کرنا چاہتی ہوں ان سے۔" وہ خوف سے لرزتے ہوئے بھی جذبات میں کہہ گئی۔ مگر دوسرے پل یوں گھبرا کر نگاہیں چرانے لگی جیسے نو آموز چور رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔

"وہ......وہ میرا مطلب ہے امی کہیں گی تو میں کرلوں گی۔" اس کے حواس بری طرح بکھرنے لگے تھے۔ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں، ارسلہ کے دائیں طرف سے کھسکتی سرعت سے دروازے سے نکل بھاگی۔

ارسلہ کے اعصاب بری طرح چٹخنے لگے تھے۔ جیسے ڈھیر سارا دھواں آنکھوں کے راستے دماغ پر چڑھ گیا ہو۔ اس نے نہایت درجے حیرانی اور صدمے کی سی کیفیت میں بیا کو کمرے سے بھاگتے دیکھا۔ وہ اس دروازے سے کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھر کر غائب ہوگئی تھی۔

اس کے چشم تصور میں لمحہ بھر کے لیے ایک مانوس سراپا ابھر کر ٹوٹ گیا۔ اس کا دل پسلیوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

آبص رات گئے گھر لوٹا تو مہوش کو اپنا منتظر پایا۔ دو روز سے وہ رات دیر سے گھر آنے لگا تھا اور یہ بات اکبر جیلانی اور مہوش دونوں کے لیے پریشان کن تھی۔

"آپ کیوں جاگ رہی ہیں اب تک۔" وہ لابی سے گزرنے لگا تو مہوش کو لابی کے صوفے پر بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" وہ صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف چلی آئیں۔

"میرا انتظار نہ کیا کریں سو جایا کریں۔ بس یونہی دوستوں میں نکل گیا تھا۔" وہ اسٹک پر دباؤ ڈال کر پلٹنے لگا۔

"دوستوں سے تو تم نے عرصہ ہوا کنارا کرلیا ہے، میں جانتی ہوں تم اکیلے تھے۔" مہوش ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"کوئی کام تھا کیا مجھ سے۔"

"ہاں......ادھر بیٹھو کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"سوری، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے تامل کیا۔ انداز بے مہر سا تھا۔

"تمہاری تھکن سے واقف ہوں اس کا احساس بھی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا یہ تھکن کیسے اترے گی۔ میرے بس میں ہوتا تو......"

"پلیز......" وہ یکدم ان کی بات کاٹ گیا ایک استہزائیہ آمیز مسکراہٹ لبوں پر پھیل کر منجمد ہوگئی۔ "جو

پوچھنا چاہتی ہیں وہ پوچھیے۔'' وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ مہوش بے بسی محسوس کر کے رہ گئیں۔

''ارسلہ میکے کیوں گئی ہے؟''

''میکے کیوں جاتی ہیں لڑکیاں۔ شاید پیرنٹس سے ملنے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''وہ بھی اسی لیے گئی ہوگی۔''

''میرا مطلب ہے وہ روٹھ کر تو نہیں گئی تمہاری پرمیشن سے گئی ہے نا۔ کوئی جھگڑا وغیرہ کر کے تو......!'' مہوش کے لہجے میں فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''جھگڑے وہاں ہوتے ہیں جہاں انسیت ہوا یکسپیکٹیشن (توقعات) رکھی جائیں۔'' ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اور مہوش کو یوں دیکھا جیسے تائید چاہ رہا ہو۔ پھر ہلکی سانس بھر کر کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے ''سو جایئے آپ بھی۔''

''آبص......اسے کال کر کے بلا لو۔ دو روز ہو چکے ہیں۔'' مہوش نے اضطرابی انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گیا مگر پلٹا نہیں۔ ''تمہیں علم ہے نا کہ رومی کے رشتے کے سلسلے میں کل لڑکے والے آ رہے ہیں رسم کرنے اور ایسے میں ارسلہ کا ہونا از حد ضروری ہے اور رومی کی ساس میری بہت اچھی فرینڈ ہے۔ وہ دو روز کراچی رکے گی پھر اسلام آباد چلی جائے گی، ارسلہ سے وہ ضرور ملنا چاہے گی۔ گھر میں رومی کی رسم ہو اور گھر کی بہو موجود نہ ہو لوگوں کو شک ہوگا۔ بلاوجہ باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔''

''جی۔'' وہ عجیب طرح کی بے آرامی محسوس کر کے فقط سر ہلا گیا۔

''دیکھو، ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کسی چھوٹے موٹے جھگڑے کو طول دیں۔ بلکہ اگر کوئی بات ہے بھی تو پلیز اسے تم سمیٹ لو۔ اسے جا کر لے آؤ۔''

''میں کال کر دوں گا۔ گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے'' وہ بے مہری سے کہتا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

مہوش نے دل گرفتگی سے اسے دیکھا پھر پلٹ کر اپنے روم میں چلی آئیں۔

انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ آبص اور ارسلہ میں کوئی ان بن ہو گئی ہے۔ جس طرح ارسلہ صبح اٹھتے ہی میکے نکل گئی تھی اور واپس نہ لوٹی تھی، وہ کر شدید فکرمند تھیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح ان دونوں کے مابین ان فاصلوں کو ختم کریں۔ ارسلہ کی لالچی، فطرت اور بلا کی ہٹ دھرمی نے آبص کو مزید اس سے دور کر دیا تھا۔

''یہ سب تو پہلے روز سے ہی روشن تھا کہ آبص کے دل میں ارسلہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم اسی شادی پر مصر رہیں۔ تجربہ کرنا چاہ رہی تھیں نا......ہو گیا تجربہ۔'' اکبر انہیں متفکر دیکھ کر الٹا ڈپٹنے لگے۔ ''تجربہ وہ کنگھی ہے جو گنجا ہونے کے بعد ہاتھ میں آتی ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔

''اوفوہ! آپ تو مجھے اور ہولائے دے رہے ہیں۔ مجھے کل کی فکر ہے۔'' مہوش نے برا مان کر شوہر کو دیکھا جو بیڈ پر دراز تھے۔ اکبر جیلانی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ ''کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اب اس طرح کی مشکلات سے تو روز نمٹنا پڑے گا۔ چلو لیٹ جاؤ۔''

''مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا کہ اس لڑکی کی آنکھ پر لالچ کی پٹی بندھ جائے گی۔ اب ذرا سوچیے۔ کل کی لڑکی ہمیں بلیک میل کرے گی۔ میں پراپرٹی اس کے نام کر دوں۔ ہے کیا اس میں، پاگل سمجھا ہوا اس نے ہمیں۔'' مہوش غصے اور جھنجلاہٹ سے سلیپر پیروں سے اتار کر بیڈ پر لیٹ گئیں۔ ''آبص میں ذرا سی بھی عقل ہوتی نا تو وہ سیدھا کر کے رکھ دیتا اسے۔ مگر اسے تو کسی کی پروا نہیں ہے۔ ہر چیز سے لاتعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ بالکل بھی پروا نہیں ہے اسے میری۔''

''اچھا اب رونا تو بند کرو۔'' اکبر جیلانی نے ٹشو اٹھا کر ان کی طرف پھینکا۔
''چلو خیر ہے۔ صبح ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔ ابھی سو جاؤ تم اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ دس مسئلے ہیں۔''
اکبر جیلانی کروٹ بدل گئے۔ مگر مہوش کی آنکھوں سے تو گویا نیند روٹھ چکی تھی۔ ارسلہ کے لیے ان کے دل میں نفرت، تاسف اور غصہ دہک رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کوٹھی میں اس کا داخلہ ہمیشہ کے لیے ممنوع کر دیں۔ مگر ایک لاچاری اور بے بسی محسوس کر رہی تھیں۔ بہت کچھ کرنے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی......وہ فقط سلگ سکتی تھیں اور سلگ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ صبح صبح عقیلہ خالہ کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ عقیلہ خالہ نے ہی کھولا تھا اسے دیکھ کر خوش گوار حیرت سے لپک کر اسے گلے لگا لیا۔
''ارے......ایسے کیسے بنا بتائے چلی آئیں۔''
''اسی میں مزا ہے خالہ، آج سنڈے تھا سوچا آپ ماں بیٹا یقیناً فرصت میں ہوں گے۔'' وہ ان سے الگ ہوئی اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ ''سکندر سو رہا ہے کیا؟''
''ارے کہاں ......وہ تو سویرے ہی عادت کے مطابق جاگ جاتا ہے ناشتا کر کے اپنا کام لیے بیٹھا ہے آفس کا۔ اور یہ تم فون ہی کر لیتیں کچھ اہتمام کر لیتی تمہارے لیے۔'' خالہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چلی آئیں۔ ''آؤ کمرے میں چلو اے سی کھول دوں۔ یہاں کہاں بیٹھو گی۔'' وہ اسے صحن میں کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولیں۔
''میں تو تمہاری اور آبص کی دعوت کرنے کا سوچ رہی تھی۔ راحیلہ سے بات کی تو پتا چلا تم دبئی گئی ہوئی تھیں۔ خیر سے کیسا رہا ٹرپ۔'' خالہ بے حد لگاوٹ سے بولیں۔ انہیں ارسلہ کو اپنے گھر دیکھ کر بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔
''بہت زبردست۔ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اتنا مزا آیا۔'' وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے عقیلہ خالہ کے کشادہ سے کمرے میں داخل ہو گئیں جہاں سکندر بیڈ پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر اپنے کام میں مصروف تھا اسے دیکھ کر ذرا سا چونکا حیرت کے اظہار کے طور پر فقط ابرو اچکا کر رہ گیا۔
''تم آبص کے ساتھ آنا اب۔ اسے لے آؤ گی تو مجھے اچھا لگے گا۔ کوئی دن رکھ کر بتا دو۔ میں کچھ تیاری کر لوں گی۔'' وہ پردے برابر کر کے ریموٹ اٹھا کر اے سی کھولنے لگیں۔ وہ ارسلہ کے آگے پیچھے جا رہی تھیں سکندر کو تو کچھ ایسا ہی لگا۔ وہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر چکا تھا ایک طرف رکھتے ہوئے یونہی ارسلہ کی طرف دیکھا جو عقیلہ خالہ کی اس بات پر استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
''سوری خالہ۔ آبص کو تو نہیں لا سکتی میں یہاں۔''
''ارے......کیوں......کیوں نہیں لا سکتیں۔ خالہ نے معصومیت سے اسے دیکھا۔ جبکہ سکندر کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔
''وہ کیا ہے کہ آپ کا گھر آبص کے شایان شان نہیں ہے نا۔'' وہ دھیرے سے بولی پھر مسکین سی شکل بنا کر خالہ کے پھیکے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''کچھ اچھا امپریشن نہیں پڑے گا۔ اس لیے آپ کی بھی تو عزت ہے نا خالہ۔''
''میرا تو خیال ہے کہ یہ گھر تمہارے بھی شایان شان نہیں ہے پھر کیوں چلی آئیں تم'' سکندر بلبلا کر بولا۔

اسے اپنی ماں کا پھیکا پڑتا چہرہ اچھا خاصا تپا کر رکھ گیا تھا۔ وہ بدتمیز ہوتی جا رہی تھی۔ بے مروت ...... بدلحاظ ...... مگر اس حد تک کہ خالہ کا لحاظ بھی بالائے طاق رکھ دے گی سکندر کو اندازہ نہیں تھا۔

"دیکھ رہی ہیں خالہ، کتنی بدتمیزی سے بات کر رہا ہے یہ مجھ سے، مجھے گھر سے جانے کا کہہ رہا ہے۔" وہ گویا تنک گئی۔

"گھر سے جانے کا نہیں کہا ہے ابھی۔" جواباً ترشی سے بولا۔

"تو پھر کیا مطلب تھا۔" وہ سکندر کو گھورنے لگی۔

"صرف تمہاری بکواس کا جواب تھا یہ۔" وہ بیڈ سے اتر کر کمرے سے جانے لگا۔

"ارے یہ تم دونوں کیوں الجھ رہے ہو بلاوجہ آپس میں اور یہ تم کہاں جا رہے ہو۔ پہلی بار تو یہ آئی ہے ہمارے گھر۔" خالہ نے اسے روکنا چاہا۔

"آپ ہی سنیے اس کی شاندار گفتگو میں اپنے روم میں جا رہا ہوں۔ پہلی بار آئی ہے۔ احسان کر رہی ہے۔" وہ کڑختے لہجے میں اس پر ایک نظر ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ عقیلہ خالہ یوں نادم ہو گئیں گویا ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔

"نخرے دیکھو ذرا۔ ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ محترم کے مزاج ہی بگڑ گئے۔" اس نے جھلس کر دروازے کی طرف دیکھا پھر خالہ کو۔

"اسے چھوڑو۔ جانے کیا ہو جاتا ہے اسے کبھی کبھی۔ تم بیٹھو آرام سے میں کچھ کھانے کو لاؤں تمہارے لیے۔" عقیلہ خالہ پیار سے اس کے کندھے کو سہلایا۔ "اور ہاں کھانا کھا کر جانا اب بھاگنے کی نہ کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں خالہ، کھانا کھا کر ہی جاؤں گی۔ چکن کڑھائی بنالیں۔ بہت دنوں سے نہیں کھائی کڑھائی میں نے، وہ بھی آپ کے ہاتھ کی۔" کہتے ہوئے ان کے بیڈ پر اطمینان سے لیٹ گئی۔ خالہ سر ہلا کر کمرے سے نکل گئیں۔

وہ چت لیٹی سکندر کے رویے پر غور کرنے لگی۔ وہ اتنا تنک مزاج کبھی نہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی اور کڑوی کسیلی باتوں کو بھی تحمل سے سہہ جایا کرتا تھا۔ کڑوے گھونٹ مسکرا کر پی لیا کرتا تھا اور اب یکدم اکھڑ انداز ...... اسے سکندر کا یہ رویہ بہت برا لگا اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ تاہم وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی۔ وہ پورا کر کے جانا چاہتی تھی۔ وہ یونہی کچھ دیر پرسکون انداز میں چت لیٹی رہی پھر کچھ سوچ کر اٹھی پیروں میں چپلیں پھنسائیں اور کمرے سے نکلی۔ خالہ باورچی خانے میں مصروف نظر آئیں وہ سکندر کے کمرے میں چلی آئی۔

"وہ نہا کر نکلا تھا۔ براؤن شلوار سوٹ زیب تن کیے۔ ڈریسنگ کے آئینے کے سامنے کھڑا آگے کے بٹن بند کر رہا تھا اسے اندر آتے دیکھا مگر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہ کیا۔

وہ ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالتی اس کے نزدیک سے ہو کر اس کے بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"بہت بدل گئے ہو تم سکندر۔" وہ اس کے سراپے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ جواباً سکندر نے ذرا سا نگاہوں کا رخ موڑ کر اس پر نگاہ پھینکی پھر برش اٹھا کر بالوں پر پھیرنے لگا۔

"تغیر تو زندگی ہے، جمود موت ہے۔ ہر شے بدلتی ہے انسان میں تبدیلی تو فطری ہے۔"

"اوف ......! اب فلسفہ جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بیڈ سے اٹھی۔ تم اچھے دوست نہیں رہے اب ...... یہ کہنے کا مطلب ہے میرا۔"

"اچھا کزن ہوں۔ یہ کافی نہیں ہے تمہارے لیے۔" وہ یکسر بے کیفیت لہجے میں کہہ کر برش ایک طرف رکھ کر پلٹا۔

''کزن سے سجن نہیں بن سکے، اس کی تلملاہٹیں لگتا ہے!! ابھی باقی ہیں۔'' وہ یکدم ہنسی۔
''بکومت...... اس نے پلٹ کر تیز نظروں سے اسے گھورا۔
''بلاوجہ الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔ جب ملنے آئی ہو تو عزت سے ملو، جلی کٹی کیوں سنا رہی ہو۔'' اس نے برامان کر اپنا موبائل اٹھایا پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو امی کے روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''
''یہاں کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ وہ پلٹتے پلٹتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
''اس سے پہلے بھی میں تمہارے کمرے میں آ کر بیٹھتی تھی تم نے آج سے پہلے تو کبھی نہیں نکالا اپنے روم سے'' وہ تپ کر بیڈ کے کنارے سے اٹھی۔
''پہلے اور بات تھی۔ وہ نظریں کترا گیا پھر جلدی سے بولا۔'' امی کے ساتھ بیٹھتے ہیں وہ تمہارے آنے سے خوش ہیں تمہیں بہت یاد کرتی رہی ہیں۔''
''اور تم...... تم نے کبھی یاد کیا ہے۔ میری کمی کو محسوس کیا یا نہیں۔'' وہ یکدم اس کے آگے آ کر کھڑی ہوگئی۔
سکندر کا اٹھتا ہوا قدم رک گیا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا وہ خاص بے باک نگاہوں سے اسے کھوج رہی تھی۔ سکندر کو جانے کیوں اس کے انداز سے ایسا ہی لگا وہ اس کے دل کا حال جاننا چاہتی ہو۔
تو کیا وہ وہ جذبے ڈھونڈ رہی تھی جو ہمیشہ ارسلہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جگمگانے لگتے تھے۔ وہ روشنیاں تلاش رہی تھی جو اسے دیکھ کر آنکھوں میں اجاگر ہو جایا کرتی تھیں۔
سکندر کو اپنے اعصاب سخت تاروں کی طرح اکڑتے محسوس ہونے لگے۔
''اس طرح کی فضول اور لایعنی باتوں کا مقصد۔'' اس کے لہجے میں خفگی کا تاثر نمایاں تھا۔''
وہ دھیرے سے ہنس دی۔ گلابی لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں سے پھوٹتی مسکراہٹ اب بھی دلکش تھی۔ ہاں اب اس کے خوب صورت چہرے پر تھوڑی سی پختگی آ گئی تھی۔ چہرہ بھر سا گیا تھا، یوں دلکشی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔
سکندر نے الجھ کر اسے دیکھا پھر کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔
''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے تم کسی خاص مقصد کے تحت آئی ہو۔'' وہ اب اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
ارسلہ ابرو اچکا کر ہنسی۔
''خوب، میرے بارے میں اندازے تو اب بھی بالکل درست لگاتے ہو۔ چلو اس کا مطلب ہے۔ مجھے اور میری اداؤں کو بھولے نہیں ہو۔'' وہ بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔
سکندر لب بھینچتے نظروں کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔
''تم میری خالہ زاد ہو۔ بھولنے کی کیا بات ہے۔ مرور تو نہیں گئی ہو شادی ہی ہوئی ہے......'' وہ اپنے اعصاب کس حد تک نارمل رکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔ ''خیر، جو کہنے آئی ہو وہ کہو۔ میں سن رہا ہوں بے کار کی تمہید مت باندھو۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ساتھ اسے بھی سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اس کا لہجہ پراعتماد تھا۔ ارسلہ فوری ردعمل کے طور پر فقط اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''مجھے آبص کی معذوری کے بارے میں جان کر خاصا افسوس ہوا اور یہ کہ......'' سکندر بولتے بولتے رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہیں بتانے آئی ہوگی۔ وہ غصے سے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے بولی۔
''تمہیں یہ بات کس نے بتائی۔ کمال ہے، خبریں یہاں تک پہنچ گئیں۔'' وہ تیکھے چتون سے اسے دیکھنے لگی۔ ''یقیناً اریبہ نے ہی بتائی ہوگی۔''
''سوری۔ اگر تمہیں برا لگا تو......''
''برا تو یہ لگ رہا ہے کہ تمہارے اریبہ سے بڑے تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔'' وہ اصل مقصد پر آتے ہو۔

گویا پھنکارتے ہوئے بولی۔
''اسے اپنے جال میں پھانس رہے ہو۔ شرم کی بات ہے سکندر۔ اپنے سے دس سال چھوٹی لڑکی پر بری نظر رکھتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی۔''
''وہاٹ...... کیا بکواس کر رہی ہو تم۔'' سکندر یوں جھٹکے سے کرسی سے اٹھا جیسے کرسی پر کرنٹ چھوڑ دیا گیا ہو۔
''بیا کی آنکھوں میں نے تمہارے لیے پسندیدگی کے رنگ دیکھے ہیں اور یہ رنگ تم سے چھپے ہوئے ہوں ایسا تو ہو نہیں سکتا۔'' وہ کمینگی سے ہنسی۔ ''وہ تمہارے نام کی تسبیح پڑھتی نظر آ رہی ہے۔ خالہ اسے بہو بنانے کے لیے امی کے پاس چکر کاٹ رہی ہیں بلکہ وعدے لے رہی ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر سکندر پر گویا چڑھ دوڑی۔ ''تمہیں کچھ خبر نہ ہو ایسا تو ممکن نہیں۔''
سکندر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، اس کا دل چاہا ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے حسین تھوبڑے پر دے مارے کہ وہ الٹ کر دور جا گرے۔ اس کی ناک کے کنارے غصے کے ابال کو دبانے سے سرخ ہونے لگے۔
''اور وہ اریبہ صاحبہ...... بالکل تیار ہے یہ کفن پہننے کو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ساتھ ہی ہنسی۔ مگر اس کی ہنسی یک دم رک گئی۔ سکندر نے جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر زور سے موڑ دیا۔
''آؤچ......'' وہ بلبلا کر چیخی۔
''ایسی بکواس کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اپنی بہن کے کردار پر کیچڑ اچھال رہی ہو۔ بکواس کیے جا رہی ہو۔ بے بنیاد الزام لگائے جا رہی ہو۔''
''بہن کے نہیں، تمہارے کردار پر روشنی ڈال رہی ہوں۔'' وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخی۔
''میرے کردار کی پڑتال کرنے والی تم ہوتی کون ہو...... اور رہی بیا کی پسند ناپسندیدگی کا سوال تو یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم اپنی ذات تک محدود رہو۔'' سکندر کا لہجہ پھنکارتا ہوا تھا۔ وہ اسے دیوار پر دھکیل گیا۔
ارسلہ ایک لمحے ردعمل کے طور پر فقط اسے گھور کر رہ گئی۔ پھر یک دم ہنسی۔
''بہت زیادہ غصہ نہیں آ گیا تمہیں۔ ایک عام سی بات پر۔''
''یہ عام سی بات نہیں ہے، بہت خاص طریقے سے سوچ سمجھ کر کر رہی ہو۔'' وہ چٹختے اعصاب کے ساتھ بولا۔ ''بچہ نہیں ہوں، سب سمجھتا ہوں۔''
''چلو۔ یہی سمجھ لو۔'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی۔
اس کی ڈھٹائی پر سکندر نے متاسفانہ سی سانس بھری۔
''تم چاہتی کیا ہو، اس طرح بے کار لایعنی باتیں کر کے۔'' وہ رائٹنگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''اول تو میری اریبہ کے بارے میں اس طرح کی کوئی سوچ، کوئی خیال نہیں۔ بہن سمجھتا ہوں اسے...... چھوٹی بہن۔ اور امی کی جہاں تک بات ہے، یہ سچ ہے امی بیا کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔'' وہ قدرتے تحمل سے کہنے لگا۔ اس کے خیال میں اس کی غلط فہمی کو دور کرنا ضروری تھا۔ بات اس کے کردار تک آئی تھی۔ وہ کیسے برداشت کر جاتا۔
''خالہ کو چھوڑو۔ تم کیا چاہتے ہو، صرف یہ بتا دو مجھے۔'' وہ اس کی بات کاٹ گئی۔
سکندر نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ پھر دھیرے سے مسکرایا۔
''یہ بتاؤ، تم کیا سننا چاہتی ہو میرے منہ سے۔'' اس کی مسکراہٹ میں چھپا طنز تلخی ارسلہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ یک دم نظریں چرا گئی اور دھیرے سے بولی۔

''میں چاہتی ہوں، اریبہ کو کوئی امیر کبیر شخص ملے۔ وہ بھی دنیا کے مزے اٹھائے، میری طرح عیش کرے۔''

''ہوں.....'' سکندر کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ ''میری بھی یہی دعا ہے کہ اسے تمہارے جیسی زندگی ملے، مگر تم کوشش کرو۔ مجھ سے کیا ایکسپکٹ کر رہی ہو۔''

''صرف یہی کہ تم خالہ کی یہ ضد ختم کردو کہ وہ بیا کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اور دل سے اسے بہو بنانے کا خیال نکال دیں۔'' وہ بلاتمہید بولی۔

''چلو، کردوں گا۔ وہ نکال دیں گی۔'' وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔ ارسلہ کا چہرہ یک لخت دمکنے لگا۔ ''مگر اس کے لیے تمہیں ایک گارنٹی دینا ہوگی مجھے۔'' وہ انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

''گارنٹی..... کیسے گارنٹی۔''

''یہی کہ اریبہ کے لیے تمہیں ایک امیر کبیر خاندان کا رشتہ لانا ہوگا۔ اس کی شادی کی ذمہ داری تمہیں اٹھانی ہوگی۔ ایک مہینے کے اندر اندر۔''

''کیا آ..... یہ کیا فضول بات ہوئی۔'' وہ برامان کر بولی۔

''فضول بات نہیں ہے۔ بہت سنجیدہ بات ہے۔ خالہ کی ذمہ داری تمہیں اٹھانی ہوگی۔''

''میں..... میں کیوں اٹھانے لگی ذمہ داری۔'' وہ بدکی اور الجھ کر سکندر کو گھورا۔

''تو پھر بیا کے ہر معاملے سے، خاص کر شادی کے معاملے سے پرے ہٹ جاؤ۔ اس کی شادی کہاں، کس سے اور کب ہوتی ہے اس کا فیصلہ خالہ خالو کو کرنے دو۔'' سکندر دبے دبے غصے سے بولا۔

''اوہ.....'' ارسلہ کے دماغ پر جیسے ضرب سی پڑی۔ وہ یک دم کرسی دھکیل کر جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

''تو یہ کہو کہ تمہاری بھی نیت میں فتور ہے۔ خالہ کا تو فقط کندھا استعمال ہو رہا ہے۔'' وہ زہرخند ہنسی کے ساتھ بولی مگر سکندر کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسے اسی اطمینان سے دیکھتا رہا۔

''شادی کرنا چاہتے ہو تم بھی اس سے۔ صاف کہونا۔'' وہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

سکندر کرسی سے اٹھا۔

''اول تو ایسا کچھ نہیں اور بالفرض ہو بھی تو تمہیں اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں اس شادی میں دلچسپی رکھتا ہوں یا نہیں۔ تم مسز آبص ہو اور مسز آبص بن کر اپنی دنیا کے مزے اڑاؤ۔ اور بیا کی فکر ہے تو جا کر خود اسے سمجھاؤ۔ مجھے نہیں۔ اور یہاں آ کر اپنی فضول بکواس آئندہ مت کرنا۔ آج کردی۔ اب آؤ تو عزت سے آنا تو جواباً بھی عزت ملے گی۔'' سکندر کا لہجہ برہم بھی تھا اور سخت بھی۔ اس کے لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ گم ہو چکی تھی، اس نے دروازے کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا گویا کہہ رہا ہو۔ ''اب جاسکتی ہو۔''

ارسلہ کے لبوں پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ بھی سکڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر آڑھے ترچھے بل پڑے تھے۔ تاہم سکندر کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کردیا اور جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

سکندر نے تلخی سے لب بھینچ لیے۔ عجیب بے بسی محسوس کر کے رہ گیا۔ عجیب تاسف کی زد میں آ کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر کرسی پر ڈھے گیا اور آزردگی اور دل گرفتگی سے اس واقعہ پر سوچنے لگا۔

اسے لگا کوئی آگ لگا کر چلی گئی ہو۔ بچے کچھے سارے جذبے راکھ کر کے چلی گئی ہو۔ اسے ماضی کے ان لمحات پر پچھتاوا ہونے لگا جو اس نے ارسلہ کی یاد میں رو کر گزارے تھے۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکال کر لبوں سے لگائی اور اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔ دوسرے پل ننھا بے ضرر سا شعلہ چمکنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھا،

سلیپر پیروں سے اتار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

کاش تھوڑا سا بھرم ہی رہنے دے جاتی۔ اپنی چاہت پر تھوڑا سا فخر تو رہ جاتا کہ جسے چاہا وہ اتنی بے مول نہ تھی۔ اتنی عام سی عورت نہ تھی۔

☆☆☆

ارسلہ گھر پہنچی تو اماں پریشان نظر آئیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم۔ موبائل بھی اپنا یہیں چھوڑ گئی تھیں۔ آبص کا فون آ رہا تھا پھر گھر کے نمبر پر فون کیا، میں نے جھوٹ بول دیا کہ ذرا نیلو کی طرف گئی ہے۔'' اماں کی اٹکی سانس بحال ہوئی تھی۔ ''بتا کر تو جاتیں، ناحق جھوٹ بولنا پڑا۔''

آبص کے فون کا سن کر وہ ٹھٹکی۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''جہنم میں۔'' وہ جھنجلا کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''آبص کو فون کر لو۔ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ تین بار کال کر چکا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بات کرا دیجیے گا۔''

اماں کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ کمرے میں جا چکی تھی۔ اماں نے حیرت سے اریبہ کی طرف دیکھا۔

''دیکھا اس کے مزاج۔ حد کرتی ہے ایک تو جھوٹ بول کر جاتی ہے، دوسرا کسی کی بات کو خاطر میں نہیں لاتی۔''

اماں خفگی سے اس کے کمرے میں جانے لگیں تو اریبہ نے انہیں جلدی سے روک دیا۔ وہ خود بھی ارسلہ کے رویے پر الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس کے خیال میں اسے کوئی مسئلہ ضرور درپیش تھا، وہ یقیناً آبص سے لڑ کر آئی تھی۔ تاہم وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے تیور دیکھ کر اماں کو بھی اسی غرض سے روک دیا۔

ادھر ارسلہ تیکھے چتون سے کمرے میں آ کر اپنا بیگ نکال کر کپڑے اور اپنی بکھری دوسری چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ٹھونسنے کے انداز میں ڈالنے لگی۔ پھر بیگ ایک طرف رکھا اور ڈرائیور کو کال کر کے جلدی آنے کا کہہ کر موبائل مسہری پر پٹخ دیا۔ غصے سے برا حال تھا۔ لگ رہا تھا خون دماغ پر ٹھوکریں مار رہا ہو۔

''بھاڑ میں گئے یہ کنگلے۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' وہ کمرے میں ٹہلنے لگی اور سوچ سوچ کر کھولتی رہی۔

''سکندر سمجھتا کیا ہے خود کو۔ ایویں ہی اس کے پاس چلی گئی۔ خوش فہمی دیکھ ذرا اس کی۔ ہنہہ...... جیسے میں اس کے ہاتھ پیر جوڑ کر اسے روکوں گی کہ اریبہ سے شادی نہ کرے۔ نظر باز...... کمینہ کہیں کا۔ اور یہ گھنی میسنی کرتی رہے اس کنگلے سے شادی۔'' وہ ٹہل ٹہل کر تھک گئی تو مسہری کے کونے پر ٹک گئی مگر دماغ کی کھولن تھی کہ کم نہ ہو رہی تھی۔

اریبہ کھڑکی سے اسے دیکھ دیکھ کر سوچے جا رہی تھی کہ آخر آپی کو غصہ کس بات پر ہے۔ خالہ کا اسے بہو بنانے پر یا خود اس کا سکندر کو پسند کرنے پر۔

اسے خالہ کا فون آیا تھا، وہ چھوٹتے ہی بولیں۔ ارسلہ اس طرح ان کے گھر سے کیوں چلی گئی۔ وہ گھر پہنچے تو اسے کہنا خالہ ناراض ہیں۔ کھانا بھی کھا کر نہیں گئی۔ اس نے خالہ کے فون کا نہ اماں کو بتایا، نہ ارسلہ کو۔ مگر بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔

☆☆☆

نادیہ شاہ کی آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ موبائل پر وقت دیکھ کر یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اف۔ اتنی دیر ہوگئی، میں سوتی رہ گئی۔" وہ منہ دھو کر بال لپیٹتی کمرے سے باہر آئی تو امی اس کے لیے ناشتا تیار کررہی تھیں۔

"آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔" وہ ان کا بنایا ناشتا اٹھا کر میز پر رکھنے لگی۔

"رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ فجر پڑھ کر سوئی ہو، پھر کیا جگاتی۔ چلو، ایک دن کی چھٹی سے کچھ نہیں ہوتا۔ ناشتا کرو۔" امی فلاسک میز پر رکھ کر خود بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں اور کپ اپنے آگے کر کے فلاسک سے چائے انڈیلنے لگیں۔

اس نے چور نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔ رات بھر اس کی بے قراری، کروٹیں بدلنا، بے چین رہنا امی پر گویا عیاں ہوگیا تھا۔

"صبا کا فون آیا تھا کیا؟" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"وہ خود آئی تھی۔"

"ارے، اور آپ نے پھر بھی نہیں جگایا۔ کمال کرتی ہیں امی! آپ بھی۔"

"وہ خود جلدی میں تھی۔ میں نے کہا بیٹھ جاؤ، جگاتی ہوں مگر اس نے منع کردیا۔ کہا رہنے دیں، آرام کرنے دیں۔ میں تو بس یوں ہی ملنے چلی آئی تھی۔"

اس نے امی کی بات سنتے ہی چائے کا کپ واپس میز پر رکھ دیا اور اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا، تب امی نے ٹوکا۔

"اوں ہوں۔ پہلے ناشتا تو کرلو۔ کرتی رہنا پھر اسے فون۔ کون سا بھاگی جارہی ہے وہ کہیں۔ چلو، اطمینان سے ناشتا کرو۔" انہوں نے موبائل اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا، اس کی پہنچ سے دور۔ وہ چپ رہ گئی۔

"ارے ہاں، بتانا ہی بھول گئی۔ آپا کا فون آیا تھا۔ بتارہی تھیں حمزہ کل پاکستان پہنچ رہا ہے۔" امی کرسی سے اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں اور یاد آنے پر بولیں۔

اس نے حیرانی سے پلکیں اٹھائیں۔ "خیریت۔"

"اپنے کسی دوست کی شادی اٹینڈ کرنے آرہا ہے۔"

وہ یک دم ایک بے آرامی سی محسوس کرنے لگی۔ یکسر بے کیفیت آواز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"تم گھر پر ہو آج تو چلو میں مارکیٹ ہو آؤں گی۔ گھر کی کچھ چیزیں لینی تھیں۔ حمزہ آرہا ہے تو ہونے والے داماد کی خاطر مدارت بھی تو کرنی ہوگی نا۔" امی یہ کہتی اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئیں اور کچن کا پھیلاوا سمیٹنے میں مصروف ہوگئیں۔

ادھر اس سے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہ کیا گیا۔ وہ دو نوالے کھا کر چائے کا مگ اور موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس نے جلدی سے واٹس ایپ کھولا تو صبا نے آبص کی شادی کی کچھ تصاویر بھیجی تھیں۔ ایک حسین لڑکی کے ہمراہ بیٹھا وہ خود بھی سجیلا شہزادہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر چہرے پر بلا کی سنجیدگی بلکہ سناٹا دکھائی دے رہا تھا۔ صحرا جیسا سناٹا۔ جانے نادیہ کو تو ایسا ہی لگا۔

اس نے صبا کے میسجز کھولے۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ ذہن ان تصویروں پر منتشر ہو رہا تھا جیسے صور پھونک دیا گیا ہو۔ جسم و جاں کی دنیا میں ہر شے دھنکی اون کی طرح بکھرتی چلی جارہی ہو۔

"آبص کی شادی ہوگئی ہے نادیہ! تم شاید میری اس بات کا یقین نہ کرتیں اس لیے میں نے ثبوت کے طور پر یہ تصاویر بھیجی ہیں۔ لڑکی کے گھر کا مطلب آبص کے سسرال کے گھر کا ایڈریس بھی سینڈ کیا ہے، ذرا لوکیشن

غور کرنا...... اور دیکھو پلیز، رنجیدہ مت ہونا۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ یہ خبر بھی سنی تھی کہ ڈیڑھ سال پہلے آبص کا ایکسیڈنٹ بھی ہوا تھا، باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔"

اس نے ڈھیلے ہاتھ سے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ دل سینے میں یوں دبتا ہوا محسوس ہونے لگا جیسے کسی بھاری پتھر کے نیچے جا رہا ہو۔ سانس بھی مشکل سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ کیا کر دیا صبا! تم نے۔" اس نے موبائل کو اجڑی آنکھوں سے دیکھا۔ میری ساری خوش فہمیوں کو نچوڑ کر رکھ دیا تم نے۔ ساری امید، آس سب چھین لی تم نے۔ امید جینے کا بڑا سہارا ہے۔ امید پیروں کے نیچے زمین کی طرح ہوتی ہے، جب تک زمین پیروں کے نیچے رہے انسان جم کر کھڑا رہتا ہے۔ تم نے تو یہ زمین ہی کھینچ لی صبا!"

وہ بیڈ کراؤن سے لگ کر بیٹھ گئی اور دل کے ٹوٹنے کی صدائیں سننے لگی۔

"مگر نہیں۔ تم نے نہیں آبص نے توڑ ڈالیں۔ تمہارا کیا قصور ہے بھلا۔ میں ہی تمہارے پیچھے پڑی تھی کہ آبص کے بارے میں معلومات دو۔ بہت سی باتیں چھپی رہیں تو انسان سکھی رہتا ہے۔"

وہ اپنے دل کے ٹوٹنے کی صدائیں سننے لگی۔

"تم سوچنا بھی مت کہ میں کبھی پیچھے ہٹوں گی۔ تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔" آبص کی محبت آمیز پراعتماد آواز اسے اپنے کانوں میں آج بھی سنائی دینے لگی۔ وہ یک دم جیسے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا، اپنی گہری دمکتی آنکھوں میں اسے پانے کے خواب سجائے۔

"میرا ساتھ دو گی نا۔" وہ اس سے وعدے لے رہا تھا یا تسلی چاہ رہا تھا۔ "پیچھے تو نہیں ہٹ جاؤ گی۔"

"سارے وعدے لے لیں، بس مجھے میری نظروں میں کبھی نہ گرا دینا۔"

"مطلب؟"

"عزت پر حرف آیا تو اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکوں گی۔ قدموں کو ڈگمگانے سے بچاؤ گے تو پورا ساتھ دوں گی۔"

"دوں گی۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔ جو روح بن جائے، وہ الگ نہیں ہوتا۔ یہ میرا وعدہ ہے تمہاری عزت کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کروں گا۔"

وہ نڈھال سی تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاید تمام سوچوں سے چھٹکارا پانے کی ادنیٰ سی کوشش تھی اس کی۔ تب موبائل کی گھنٹی بجنے لگی، یہ گھنٹی اس کے تھکے پژمردہ اعصاب کو عجیب تکلیف دہ لگنے لگی۔ اس نے موبائل اٹھا کر آف کر دیا۔ وہ جانتی تھیں دوسری طرف بے چین صبا ہوگی۔ اس وقت وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر صبا کو چین کہاں۔ وہ شام اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ دل گرفتی سے کہہ رہی تھی۔

"اسی لیے تمہیں منع کرتی تھی مگر نہیں، تمہیں تو جانے کیا سمائی کہ آبص کے بارے میں پتا کروانے کی...... کروا لیا پتا...... کیا ملا۔" اس کی اجڑی حالت دیکھ کر صبا تاسف سے اسے گھرکنے لگی۔

"اچھا ہی ہوا نا۔ میری خوش فہمیاں ختم ہو گئیں۔ آس کا دامن چھوٹ جائے تو زندہ رہنا سیکھ جاؤں گی۔" وہ کرب سے بولی۔

اس کی شکستگی آزردگی صبا کو تکلیف پہنچا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس نے کچھ غلط کر دیا، آبص کی تصویریں اسے بھیج کر اس کی شادی کا بتا کر۔ اسے خوش نما امید و آس کی بستی سے نکال کر حقیقت کے سمت کھردرے جنگل میں لا کر پٹخ دیا تھا۔ مگر...... وہ کیا کرتی۔ اسے اس دھوکے سے نکالنا ضروری تھا تا کہ وہ حمزہ کے ساتھ زندگی کی شروعات کر سکے۔

"حوصلہ کرو نادیہ! تم تو بہادر لڑکی ہو۔" وہ اسے تھپکنے لگی۔

"ایک حوصلہ ہی تو تھا، وہ بھی بکھر گیا۔" وہ آزردگی سے بولی۔
"ایک کمزور عورت کے لیے یہ آزمائش بہت زیادہ ہے صبا...... بہت زیادہ۔" اس کی آواز بھیگنے لگی اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔
صبا نے بے اختیار اس کا سر اپنے کندھے سے لگانا چاہا تو وہ کسی ٹوٹی ڈال کی طرح اس کے سینے سے لگ گئی اور ضبط نہ کر سکی۔ اس لاوے کو بہا بیٹھی جو ایک عرصے سے اس کے دل میں پکتا رہا تھا۔
کتنی عجیب بات ہے، ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں۔ بنا سوچ کر قدم اٹھا لیتے ہیں۔ ان راستوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں جس پر کوئی منزل نہیں آتی۔ شاید رسک لیتے ہیں اور سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔
صبا اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے تھپکنے لگی۔ اس کے سلگتے آنسوؤں نے کمرے کی فضا کو بھی اداس اور ملول کر دیا تھا۔ صبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی تسلی تشفی کا معاملہ کس طرح کرے۔
امی تو کب سے دروازے پر کھڑی تھیں پھر دل گرفتہ سی پلٹ گئیں۔

درد بس ریت نہیں ہے کہ اسے
روند کر آگے بڑھ جائیں

درد صحرا ہے
دہکتا ہوا ظالم صحرا
پاؤں پڑ جائے جو اک بار تو جیون جل جائے
رات کسی بیتے ہوئے عشق کی یادوں میں
گزار آئے ہو
تم کہ ویران کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ خالی کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ بکھرے کبھی ایسے تو نہ تھے
اے دلِ عشق زدہ!

امی افسردہ سی اپنے کمرے میں لوٹ آئیں اور بدن سے چادر اتار کر مسہری پر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئیں، جیسے پیروں میں جہان بھر کا بوجھ سمٹ آیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں۔
"ایک جذباتی قدم، نفس کی لحہ بھر کی بے لگامی کتنے بڑے بڑے دکھ جھولی میں ڈال جاتی ہے کہ ازالہ ممکن نہیں رہتا۔ تلافی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ گزرے وقت کا فقط ماتم رہ جاتا ہے۔"
اور وہ خود، کس کس بات کا ماتم کرتیں۔ اپنی کن کن کوتاہیوں کو روتیں۔ آج ایک عرصے بعد اپنے شوہر کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ وہ زندہ ہوتے تو شاید ان کی بیٹی یوں کسی غیر مرد کی محبت پر قربان نہ ہوتی۔ یہ لغزش اس سے سرزد نہ ہوتی۔ وہ یوں مہوش جیلانی کے ہاتھوں ذلت نہ اٹھاتی۔ ان کی بیٹی یوں گھٹ گھٹ کر نہ جی رہ ہوتی۔

یہ راہ چلتی محبتیں جھولی میں کچھ نہیں ڈالتیں۔
ڈالتی ہیں تو فقط ذلت، رسوائی......
ضمیر کی خلش ......ملال اور پچھتاوے......

وہ اٹھیں۔ وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر نادیہ شاہ کے سکون کے لیے دعائیں مانگنے لگیں۔ اپنی کوتاہیوں پر گڑگڑا کر معافیاں مانگنے لگیں۔ انہیں یقین تھا ان کا رب انہیں ضرور معاف کر دے گا۔

☆☆☆

تھا نہ مسئلہ کیسی جیت کا نہ کوئی ہار کی بات تھی
میرے اعتبار کا معاملہ تیرے اختیار کی بات تھی
کوئی جستجو بھی نہیں رہی مگر اب سکوں بھی نہ رہا
وہ جو بے قراریاں دے گئی وہی تو قرار کی بات تھی

امی نے اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ چائے کا مگ تھامے کھڑکی کے پاس کھڑی تھی، وہ اندر آ گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔ شاید وہ خیالوں میں بہت دور پہنچی ہوئی تھی۔ ماضی کے کسی منظر میں گم تھی۔ امی کی طرف خالی نظروں سے دیکھا پھر ہلکے سے بے مقصد مسکرادی۔

"کچھ خاص نہیں۔ موسم بدل رہا ہے، لگتا ہے سردیوں کی آمد ہے۔ خشک سا ہو رہا ہے۔" وہ باہر جھانکنے لگی۔

"تمہارے دل کا موسم بدلے گا تب مجھے سکون ملے گا۔" امی دھیرے سے بولیں۔ اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا پھر ہلکی سانس بھر کر پلٹ کر کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

"میں جانتی ہوں، حمزہ کے آنے پر تم اپ سیٹ ہو جاتی ہو۔" امی بھی مسہری پر آ کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ نظریں جھکا گئی۔ پھر دھیرے سے بڑبڑائی۔ "شاید ایسی ہی بات ہو۔"

امی کہہ رہی تھیں۔

"حمزہ بہت خوش تھا۔ میں نے تو اسے بہت کہا کہ یہیں رہ جائے، کہاں ہوٹلوں میں خوار ہوتا پھرے گا۔ مگر نہیں مانا۔ خیر، اس کی مرضی۔ گھر بھی تو ہمارا چھوٹا سا ہے، دو کمروں میں کہاں اسے سہولت ملے گی۔ پہلے کی بات اور تھی اب داماد بن گیا ہے تو...... ایک بے نام سا تکلف آ جاتا ہے۔"

امی مسکرا رہی تھیں۔ حمزہ کے آنے پر وہ ہمیشہ اسی طرح خوش دکھائی دیتی تھیں۔ انہیں حمزہ سے بڑی امیدیں تھیں، بہت تقویت ملی تھی اس کے آنے سے انہیں۔

"اس نے مجھ سے ایک ریکویسٹ کی ہے نادی!" امی چند لمحے توقف کے بعد بولیں۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ریکویسٹ کیسی؟"

"دیکھو نادیہ! وہ کوئی غیر نہیں ہے، تمہارا کزن ہے اور دوسرا تمہارا منگیتر بھی ہے۔ گو کہ کچھ مناسب تو نہیں تھا مگر مجھے اس کی ریکویسٹ اتنی نامناسب بھی نہیں لگی۔"

یہ شاید تمہید بھی جو امی باندھ رہی تھیں۔ اسے یا شاید خود کو آگے کی بات کرنے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ وہ چپ رہی۔ امی خود ہی بولیں۔

"دراصل وہ تمہارے ساتھ ڈنر پر جانا چاہتا ہے۔"

چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے بے اختیار سر اٹھا کر امی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ مچل گیا۔ امی نظریں چرا گئیں۔

"جب مناسب نہیں ہے تو پھر نامناسب کیوں نہیں لگی یہ ریکویسٹ آپ کو۔" وہ برا مان کر بولی۔

"میں نے کہا نا، وہ غیر نہیں ہے کزن ہے تمہارا۔ اور پھر تم آبص کے ساتھ بھی تو......"

"امی......" وہ یک دم تڑپ سی گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ......"

"امی پلیز۔" اس نے شدید کرب سے گزرتے ہوئے چائے کا مگ تپائی پر رکھ دیا۔ "جو غلطی میں کر چکی ہوں، اب اسے دوبارہ دہرانا نہیں چاہتی۔ آبص کے ساتھ گھوم پھر کر میں نے کوئی نیکیاں نہیں کمائیں کہ اب

[illegible] ''اس کا لہجہ پست ہو گیا۔
''ٹھیک ہے، میں اسے منع کردوں گی۔'' امی مایوس سی ہو گئیں۔
رات بھر کی بے خوابی اور سوچوں کی یلغار نے اسے پہلے ہی مضمحل کر ڈالا تھا، اس پر حمزہ کی اچانک آمد نے رہی سہی کسر پوری کر ڈالی تھی اور اب اس کی یہ انوکھی خواہش۔
''وہ کیوں ملنا چاہتا ہے۔ گھر پر مل سکتے ہیں اور آج وہ آیا تو تھا، ملاقات تو ہو گئی۔ دو گھنٹے بیٹھا رہا وہ۔'' وہ امی کو اٹھتے دیکھ کر الجھ کر بولی۔
''تم دونوں کے درمیان عجیب قسم کے فاصلے ہیں، وہ تمہارے رویے سے شاید الجھا ہوا ہے۔ اسی لیے مل کر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوگا جو میری موجودگی میں نہیں کر سکتا ہو۔ خیر، میں منع کردوں گی، جیسی تمہاری مرضی۔'' امی کمرے سے نکلنے لگیں۔
''سنیے۔'' وہ اضطراری انداز میں انہیں پکار بیٹھی۔ ''اسے کہہ دیجیے گا کہ کل لنچ میں اس کے ساتھ کرلوں گی۔ ڈنر پر جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔''
امی نے پلٹ کر خوش گوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔
''میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ تم بہل جاؤ اور دیکھو تنہا انسان نہیں بہل سکتا۔ کوئی اچھا ساتھی ہو تو غم ختم نہ بھی ہو تو اس کا احساس ہلکا ضرور پڑ جاتا ہے۔ وقت ہر غم بھلا دیتا ہے نادی۔ اگر انسان بھولنا چاہے تو بہت سی راہیں نکل آتی ہیں۔ زخموں کو کھرچنے سے فقط لہو ہی رستا ہے، اذیت ہی سیوا ہوتی ہے ان پر کھرنڈ آنے دو۔ کم از کم زخموں کا منہ تو ڈھکا رہتا ہے اور مجھے یقین ہے حمزہ تمہارے لیے ایک اچھا ساتھی ثابت ہوگا۔ تم خوش رہو گی اس کے ساتھ۔ اللہ نے شرعی رشتوں میں بہت سکون، بہت راحت رکھی ہے۔ اس کی رضا پر راضی ہو کر تو دیکھو۔ وہ سارے درد سمیٹ لے گا۔ اس سے بڑا طاقت ور، مہربان، رحیم و کریم کوئی نہیں ہے۔'' امی اسے تھپک کر چلی گئیں۔ اس نے ایک پر ملال سانس بھرتے ہوئے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔

☆☆☆

سفید شلوار سوٹ میں ملبوس دراز قد، سڈول جسم کا مالک حمزہ آج خاصا تر و تازہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نادیہ شاہ کی سنگت میں خود کو مسرور محسوس کر رہا تھا۔
''اتنی ہی خاموش رہتی ہو یا میرے سامنے ہو جاتی ہو۔'' وہ گاڑی چلاتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی نادیہ شاہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
''تمہارے سامنے شاید ہو جاتی ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔
''اوہ۔ یعنی میں بولتی بند کر دیتا ہوں تمہاری۔'' اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''واؤ۔ مجھے تو ابھی تک معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے اندر یہ کوالٹی بھی ہے۔ مقابل کو خاموش کر دینے کی۔ سحر میں جکڑ لینے کی۔'' اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔ اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ وہ جواباً ابرو کو جنبش دے کر مسکرایا۔
وہ اس کی ذہنی قلبی کیفیت سے آگاہ نہیں تھا۔ ہوتا تو شاید یہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ہرگز نہ کھیل رہی ہوتی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔
''خاموشی کا بھی اپنا ہی حسن ہے۔ کبھی کبھی خامشی بھی اثر انگیز ہوتی ہے اور بے حد معنی خیز۔'' وہ کہہ رہا تھا، اسے یوں آنکھیں موندے دیکھ کر شاید بہت خوب صورت معنی تلاش کر رہا تھا۔ ''مگر جب حد سے بڑھ جائے طویل ہونے لگے تو الجھن بھی ہونے لگتی ہے اور وحشت بھی۔'' ساتھ ہی ساتھ وہ سی ڈی پلیئر سیٹ کر رہا تھا۔ شاید وہ میوزک سننا چاہ رہا تھا۔

''تم میری خاموشی سے فیسی نیٹ ہو رہے ہو یا بور'' اس نے آنکھیں کھولیں۔

''ارے کہاں۔ تم خاموش رہو یا بولو۔ میں تو دونوں صورتوں میں تمہاری ہمراہی میں فیسی نیٹ ہوتا ہوں۔ جب من چاہا ساتھی ساتھ ہو تو کون کافر بور ہو سکتا ہے۔ تمہاری خاموشی بھی کلام لگتی ہے مجھے۔'' وہ پلیئر آن کرنے لگا۔ ''تم بس یوں ہی میرے ہمراہ بیٹھی رہو، میں تمہیں میوزک سناتا ہوں۔ سچ کہوں، میوزک کا مزا بھی اس وقت بڑھ جاتا ہے۔ جب آپ کے ہمراہ آپ کا ہم سفر ہو۔''

وہ کچھ نہ کہہ سکی، فقط اس پر ایک نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

یہ تو بہت چھوٹی چھوٹی توقعات تھیں، جو ایک مرد یا عورت اپنی منگیتر سے وابستہ کر لیتے ہیں یا از خود وابستہ ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی تھا وہ ان لمحات میں اس کے ساتھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ہمراہی اچھے دوست کی طرح اسے تقویت پہنچا رہی تھی۔ اس کا منتشر ذہن معمول پر آ رہا تھا۔ ورنہ تو لگ رہا تھا اعصاب چٹخ جائیں گے۔

وہ دونوں لنچ کر کے کیفے سے باہر آئے تو نادیہ کو احساس ہوا وہ بہت زیادہ مخلص، سادہ اور سچا آدمی ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی۔ تعلیم اور تعلیم کے بعد جاب...... اس نے اپنے والدین کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔

وہ گاڑی بھگائے جا رہا تھا۔ وہ اندیشے میں گھر گئی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں اسے جتا چکا تھا کہ امی بہت جلد نکاح کے لیے آ رہی ہیں پاکستان اور یہ کہ اب وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے جائے گا اور وہ سوچ رہی تھی کہ ایسے مخلص بندے کو دھوکا دینا گناہ کبیرہ سے بھی بڑھ کر کچھ ہوگا۔

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرالوں اگر برا نہ لگے
جو ڈوبنا ہے تو اتنے سکون سے ڈوبو
کہ آس پاس کی لہروں کو بھی پتا نہ لگے

وہ میوزک سنتے ہوئے خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہا تھا۔ بالکل منچلے کالج بوائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔'' وہ عجیب مضطربانہ لہجے میں بولی۔ حمزہ نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

''دل تو نہیں چاہ رہا ہے مگر خیر......''

نہ جانے کیا ہے کسی کی اداس آنکھوں میں
وہ منہ چھپا کے بھی جائے تو بے وفا نہ لگے

نادیہ نے ہاتھ بڑھا کر سی ڈی پلیئر کا بٹن بند کر دیا۔ یکلخت گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ حمزہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے حمزہ!'' وہ دھیرے سے بولی۔ اس کی آواز بے لچک اور بے حد سرد تھی۔

☆☆

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

اعتذار

اس ماہ نگہت عبداللہ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کی قسط نہ لکھ سکیں۔
اس ماہ ان کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ اس لیے قارئین سے معذرت۔ ان شاء اللہ، آئندہ ماہ بہنیں ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کی قسط پڑھ سکیں گی۔

ایمل رضا

مغرب کے بعد

"مغرب کے بعد جنازہ ہے ان کے بڑے بھائی کا...... یاد سے بتا دیجیے گا۔" آواز کہہ کر جانے کو مڑی۔

"کن کا......؟ کن کی بات کر رہے ہیں آپ......؟" اندر سے ڈری سہمی سی آواز آئی۔ جوان ہوتی کوئل جیسی آواز۔ جس میں پروں کی سی نرمی تھی اور جڑوں کی سی سختی۔

"کیا یہ زہرہ بیگم کا گھر نہیں ہے۔؟"

زہرہ بیگم نہیں...... زہرہ بی بی...... اس کا ہی گھر ہے لیکن آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ اماں کا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

تو اندر سے آنے والی جوان آواز اس کی بیٹی کی تھی۔ بتانے والے نے چند لمحوں کے لیے ساری صورت حال پر غور کیا۔ کیا اسے آگے کچھ بولنا چاہیے؟

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہو رہی...... میں ان کے ہی بڑے بھائی کی بات کر رہا ہوں۔ آج صبح فجر کے وقت ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مغرب کے بعد جنازہ ہے۔ آپ بس اتنا کیجیے گا کہ زہرہ بیگم آئیں تو انہیں یہ پیغام دے دیجیے گا۔"

"اچھا......" تذبذب میں کہا گیا۔ پھر جلدی سے اگلا سوال پوچھ لیا گیا۔ "پتا کیا ہے۔ کس جگہ ہے جنازہ......؟" اس کے سوال پر باہر خاموشی سے بڑھ کر سناٹا چھا گیا۔ جیسے پیغام دینے والا سرے سے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"کس جگہ ہے جنازہ......؟" سارا کو پھر سے سوال دہرانا پڑا۔

"ہیرا منڈی......" آدمی نے جتنی ہلکی آواز سے کہا اتنی ہی تیز آواز سے ڈھائی مرلے کا ٹوٹا پھوٹا گھر سارا کے وجود کے اوپر آ گرا۔

☆☆☆

اماں آئی اور اس نے روز کی طرح سبزی کو تخت پر رکھا اور اپنے پرانے برقعے کی گرہ کھولنے لگی۔

"زہرہ بیگم......" سارہ نے دروازہ بند کر کے پلٹ کر کہا۔ ماں نے مڑ کر اپنی ہی کوکھ جنی کو دیکھا۔ جس کا لہجہ آج اس کی کوکھ کا انداز نہ لیے ہوئے تھا۔

"تیرا کوئی بھائی بھی ہے اماں......؟"

ماں کو چپ لگ گئی۔

"میں نے پوچھا کہ تیرا کوئی بھائی ہے۔" آواز کٹاری کی طرح تیز تھی۔

"کیا ہو گیا ہے سارا...... تجھے پتا تو ہے کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔"

"تو پھر وہ جو ہیرا منڈی میں مر گیا ہے وہ کون ہے۔"

ماں کے چہرے کے سارے سفید رنگ کافوری پڑ گئے۔

"کس نے کہا تجھ سے......؟"

"ایک آدمی آیا تھا۔ کہنے لگا کہ زہرہ بیگم آئے تو یہ پیغام دے دینا انہیں۔" بیگم پر خاص زور دے کر کہا تھا اس نے۔

بوڑھی ماں کو پہلے تو یقین ہی نہ آیا اور جب آیا تو تیزی سے پلٹی دروازے کی طرف اور آنسو ملی آواز میں چلائی۔

"ویرے......"

لیکن دروازے پر پہنچ کر وہ وہاں ہی ساکت ہوگئی۔ سارہ نے دروازے پر تالا ڈال رکھا تھا۔ شک کی چابی دیسی تالے میں ڈال کر ذہن کے سار کواڑ بند کر لیے گئے تھے۔ اب زنگ جو اُترا تھا تو خون کا ذرہ ذرہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"کیا تھی تو اماں...... کیا ہے تو...... اتنا بڑا دھوکا...... اتنا بڑا فریب...... تو طوائف زادی ہے۔"

اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اس طوائف زادی کا بھائی آج ہی مر گیا ہے۔ وہ تو بس یہ سوچ رہی تھی کہ اس کی عزت کا جنازہ آج نکل گیا ہے۔

"بول اماں......"

"ہاں......" ماں نے وہ اعتراف کر لیا جو وہ سالوں سے چھپاتی آ رہی تھی۔

"پھر مجھ سے کیوں چھپایا تو نے یہ سب...... میں ایک گندہ خون ہوں۔ چھی...... گھن آ رہی ہے



مجھے خود سے اور......'' تجھ سے بھی......وہ کہہ نہ سکی۔
''اسی لیے......'' اس کا شارہ اس کے لہجے کی طرف تھا۔
''کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا خون تو اب بھی وہ ہی ہے ناں...... بازاری......''
''اچھا اب تجھے پتا چل ہی گیا ہے تو...... مجھے جانے دے۔''
''کہاں......؟'' وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
''اپنے بھائی کی میت پر......''
''کل تک تو تیرا کوئی بھائی نہیں تھا۔''
''کہاں نا جھوٹ بولتی رہی تھی میں......''
''پھر اس ہی جھوٹ کو اب اپنی زندگی سمجھ لے۔ میری زندگی میں تو تو وہاں جانے سے رہی۔''
''ایسے کیوں کہہ رہی ہے سارہ۔ وہ میرا بھائی نہیں میرا باپ تھا۔ پالا ہے اس نے مجھے۔''
''پھر سوچ لے۔ پالنے والے کے پاس جانا ہے۔ یا اس کے پاس رہنا ہے جس کو تو نے پالا ہے۔ تو چاہتی ہے کہ میں تجھے اس بدنام محلے میں جانے دوں۔''
''میں منہ لپیٹ کر چلی جاؤں گی۔''
''منہ لپیٹ کر جائے گی۔ یہاں عزت دفن ہو جائے گی تیرے بھائی کے ساتھ ساتھ میری......اور میرے غیر مند باپ کی......دیکھ اماں ...... تو نے اسے سالوں سے نہیں دیکھا ہوا۔ نہ ہی تو ملی ہے اس سے......تو سمجھ اب بھی نہیں ہے وہ......''
''کیسے نہیں ہے وہ...... میں ملی نہیں اس سے، لیکن وہ زندہ رہا ہے میرے دل کے اندر......''
''سمجھ اب اندر بھی مر گیا ہے۔ دیکھ اماں۔ میں تجھ سے کبھی اس بابت کچھ نہیں پوچھوں گی کہ تو کیا تھی، کبھی طعنہ نہیں دوں گی۔ لیکن اب اس مرے ہوئے کہ پاس نہ جا۔''
''سارہ...... وہ میرا باپ تھا۔ مجھے اپنی ماں سے بڑھ کر پیارا ہے وہ...... مجھے اس کا آخری بار دیدار تو کرنے دے۔''
''اچھا چل...... چلی جانا۔ قبرستان چلی جانا۔ وہاں جا کر چہرہ دیکھ لینا اس کا......''
''قبرستان جا کر......؟ جب اس کا جنازہ پڑھا جا چکا ہوگا۔ اس کے بعد کیسے دیکھوں اس کا چہرہ...... کیسے بے حرمتی کروں اس کے چہرے کی...... میں نے تو آج تک اس کے آگے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی...... ہاں سکینہ کر لیتی تھی کبھی کبھی......اور میں اسے ہمیشہ ٹوکا کرتی تھی۔'' روتی ماں ماضی میں جا کھوئی۔ ''بڑا مان تھا بھائی کو مجھ پر...... میری محبت پر......اپنی محبت کی قدر پر......اور میں اکثر سوچتی تھی کہ جو مان بھائی کو مجھ پر ہے کیا وہ میں ساری عمر نباہ پاؤں گی؟ اور میرے دل کا ڈر ایک دن میرے سامنے آ کھڑا ہوا...... میں وہ مان نہیں نباہ پائی سارہ......اسے توڑ کر چلی آئی......وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی محبت میں کسی کو شریک نہ کروں گی۔ لیکن میں نے کر دیا۔ تیرے باپ کو......سنا تھا کہ محبت ایسی چیز ہے کہ اندھا کر دیتی ہے۔ میں تو اندھی ہونے کے ساتھ ساتھ بہری بھی ہو گئی۔ بھائی کی لوریاں جو ہر وقت کانوں میں گونجتی رہتی تھیں، سب بھول گئی۔
محلے میں نئی نئی بجلی آئی تھی۔ بھائی کا دوست یاور ہمارے گھر بجلی کا میٹر لگانے آیا تھا۔ گھر میں روشنی کرتے کرتے وہ میری آنکھوں میں اندھیرا کر گیا۔ بھائی نے مجھے کبھی نہ روکا اس سے ملنے سے......وہ جانتا تھا کہ میں اس کو چھوڑ کر کہیں جا ہی نہیں سکتی......لیکن میں چلی آئی۔
جس رات میں زیوارت کی پوٹلی سنبھالے اپنے گھر سے یاور کے ساتھ بھاگ رہی تھی، عین اسی وقت بھائی کے کمرے کا دروازہ کھٹاک سے کھلا تھا، اور پھر اپنے آپ ہی بند ہو گیا تھا۔ بتی جلی تھی اور پھر بجھا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ بھائی نے مجھے گھر سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور وہ خود ہی چھپ گیا تھا۔ اس نے گھر کی ساری بتیاں بند کر دیں تھیں تا کہ کوئی مجھے یہ نقب لگاتے ہوئے دیکھ نہ سکے۔ یاور کا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں تو زمین میں ہی گڑ چکی ہوتی ...... وہاں ہی...... جیسے آج گڑ گئی

ہوں۔ میں نے واپس جانا چاہا، لیکن یاور نے مجھے جانے نہ دیا۔ اور مرتے وقت بھی وعدہ لے لیا کہ میں کبھی دوبارہ اپنے گھر نہ جاؤں گی۔"

"تو اب کیوں وہ وعدہ توڑ رہی ہے۔"

"کیوں کہ میں خود ٹوٹ چکی ہوں۔ یاور نے بھائی کی زندگی کا وعدہ لیا تھا۔ اب تو وہ مر چکا ہے۔ ہائے کیسے کیسے احسان ہے اس کے اس گھر پر...... میرے پازیبیں آج بھی تین بار وہ ہی خرید چکا ہے۔ یہ گھر بھی سستے میں اس نے دلوایا، باقی کے پیسے اس نے ادا کیے...... سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ پتا نہیں...... جبکہ مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے جانے دے سارہ۔ مجھے جانے دے۔ گناہ کا تعلق نفس سے تو ہو سکتا ہے لیکن رشتے سے نہیں...... یہ ہی بات میں آخری دم تک یاور کو بھی سمجھاتی رہی تھی۔ خدا کے لیے تو سمجھ جا۔"

"میں نہیں سمجھوں گی اماں.... میں نہیں سمجھوں گی۔ میرے اندر میرے غیرت مند باپ کا خون ہے۔ میں تجھے کیسے جانے دے سکتی ہوں۔"

"اس بات کی ہی لاج رکھ لے کہ ہماری غربت کو وہ کتنی بار خرید چکا ہے۔ میں نے اس کی محبت کا مان توڑا، لیکن وہ اپنی محبت کے مان مرتے دم تک نبھاتا رہا...... لیکن...... اب...... میں اُس کے روح کا مان نہیں توڑوں گی۔ دیکھ سارہ مغرب ہونے والی ہے۔ جنازے کا وقت قریب آچکا ہے۔"

"اور اگر میں نہ جانے دوں تو......"

"جاؤں گی تو میں ضرور...... اور آج ہر حال میں اپنے بھائی سے ملوں گی۔"

"پھر گھر واپس آکر میرا جنازہ پڑھنے کی تیاری کر لینا...... کیونکہ اگر تو وہاں گئی تو میں میں خود پر تیل چھڑک کر خود کو آگ لگالوں گی۔"

شام رفتہ رفتہ سرکنے لگی تھی۔ دونوں ایک دوجے کو دیکھ رہی تھیں۔

"یاور سے بھی میں یہ ہی کہتی رہ گئی تھی کہ شرمندگی گناہ سے تو ہو سکتی ہے۔ رشتے سے نہیں...... اور وہ میرا بھائی ہے۔ میرا کوئی گناہ نہیں ہے، میرا رشتہ ہے۔ تجھے بھی یہ ہی کہتی ہوں۔ روح کے مان جسم کے مان سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی روح کا مان نباہنے دے۔ ورنہ تجھے میری روح کا مان نباہنا پڑے گا۔ میری قبر پر اس گھر کی مٹی ڈالنی پڑے گی۔"

"جب وقت آئے گا میں ڈال دوں گی۔ تو فکر نہ کر...... لیکن آج میں تجھے وہاں جانے دوں گی...... اس بات کو ذہن سے نکال دے۔" سارہ دوٹوک کہہ کر اندر چلی گئی۔

ماں تالا لگے دروازے کی چوکھٹ پر ہی بیٹھی رہی......

"اور آج میں وہاں جا کر رہوں گی۔ اپنے بھائی سے مل کر رہوں گی۔" آنسو پونچھتی ماں بڑبڑائی۔ نجانے یہ لحہ کیسا تھا۔ بدشگونی یا انہونی...... یا ماں کا مان ایسا تھا کہ اسے توڑنے کو قدرت کا بھی دل نہ چاہتا تھا۔

مغرب کا سورج رفتہ رفتہ عشاء میں بدلنے لگا تھا۔ پھر یہ رات انہی جامد لمحوں میں گزر گئی۔

سارہ رات کے کسی پہر اُٹھی تو اس نے چوکھٹ کے پاس بیٹھی ماں کو دیکھا، وہ قریب آئی تو دھک سے رہ گئی۔ ماں نے وہ کر دکھایا تھا جو وہ رات بھر کہتی رہی تھی۔ بنا تالا توڑے وہ جا چکی تھی۔

یہ اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد کی بات ہے۔

ہیرا منڈی کی صبح ساری رات جاگ کر اب سو رہی تھی۔ ایک لڑکی جس کی لمبی شال گلی کی گرد آلود زمین کو چھو رہی تھی۔ بوجھل قدم اُٹھاتے ہوئے آخر والے مکان تک جا رہی تھی۔ پھر دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا تھا، اور ایک موٹی توند والا آدمی نمودار ہوا تھا۔

"جی......؟ کیا کام ہے؟"

"آنگن کی مٹی چاہیے۔"

"کس لیے......؟"

"زہرہ بیگم کی قبر پر ڈالنے کے لیے...... اندر بتا دیں کہ کل رات ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ آج مغرب کے بعد جنازہ ہے۔"

☆☆

ناولٹ

کوثر ناز

سوزِ عشق

اور آج اسے گھر کے عین سامنے پکڑ لیا گیا تھا۔

وہ کئی روز سے پوری کالونی والوں سے الگ الگ اوقات میں اس محل نما گھر کے مکینوں کی بابت دریافت کرتی لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک ہوگئی تھی کچھ اس کی چمڑی ایشیائی تھی سو کالونی کے افراد نے باقاعدہ اس پر نظر رکھتے ہوئے محل نما گھر کے مالک تک اطلاع پہنچادی تھی۔ سب ہی محتاط ہوگئے تھے وہ جو بڑی بہادر بن کر اپنا ملک چھوڑ کر اس تفتیش کے لیے آئی تھی اب گھر کے مالک کی وحشت ناک نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹانگوں کو لرزتا ہوا پارہی تھی۔

"کس گروہ نے تمہیں بھیجا ہے یہاں؟" وہ روانی سے انگریزی بولتے ہوئے قہر ڈھانے کو تیار کھڑے تھے اور وہ خود کو نالائق شاگرد گردانتے ہوئے استاد کے پوچھے گئے سوال کے جواب میں منہ پر قفل لگا کر سر جھکائے کھڑی تھی۔

"دیکھو لڑکی! سچ سچ بتادو، ورنہ مجھے پولیس کو بلانے میں چند منٹ بھی نہیں لگیں گے۔" گھنگریالے بالوں والی سیاہ فارم عورت جو شاید مالک مکان کی بیوی تھی نے پولیس کی دھمکی دی تو اس کے خطا ہوتے ہوئے اوسان نے کچھ کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"میں پاکستانی ہوں۔" تھوک نگلتے ہوئے تمہید باندھی گئی۔

"تو؟" وہ کس قدر نفرت سے بولا تھا اس کے اندر تک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

"سر۔ دراصل میں ایک نیوز فرم سے ہوں اور میں نے آپ کی کامیابی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے، اور اسی حوالے سے میں آپ سے انٹرویو کرنا چاہ رہی تھی۔" وہ اب جھجک کو دور کیے اس شخص سے مخاطب تھی جس کے بارعب چہرے سے وہ اس کے ماضی کے متعلق تمام تر اندازے لگا لینا چاہتی تھی۔ وہ مطمئن نہیں ہو پایا تھا لیکن اسے اب جواز مل گیا تھا سو وہ خاصی پرسکون ہوگئی تھی، اب یقیناً سب ویسے ہی ہونا تھا جیسے وہ سوچ کر آئی تھی۔

"تو پھر وہ تفتیش جو کالونی والوں سے کررہی تھیں اس کے بارے میں کیا صفائی پیش کریں گی آپ؟" نگاہوں میں غالباً ایکسرے مشین فٹ تھی یا پھر اسے ہی ایسا لگا تھا۔ اس نے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اسکارف کو اپنے گردن کے گرد ٹھیک سے لپیٹتے ہوئے بالوں کی چند آوارہ لٹوں کو درست کیا۔

"ہمارا یہ کام ہے سر۔ پہلے ہم اپنے طور پر جو کچھ معلومات حاصل کرسکتے ہیں وہ کرتے ہیں اور پھر انٹرویو کرتے ہیں۔ آپ میرا پاسپورٹ دیکھ سکتے ہیں، بلکہ چاہیں تو ہوٹل کا ایڈریس بھی لے سکتے ہیں۔ بلکہ میں لکھتی ہوں آپ یہ دیکھ سکتے ہیں۔" نوری آدم نے اس شخص کی نگاہ میں آخر تک بے اعتباری دیکھی تو خالص پیشہ ورانہ انداز کی سی اداکاری کرتے ہوئے جیب ٹٹولی اور پھر مایوس سا ہوکر ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"جلدی میں یاد نہیں رہا میں اپنا کارڈ لے کر نہیں آئی لیکن آپ انٹرنیٹ پر چیک کرسکتے ہیں "نوری آدم" لکھ کر۔" وہ چٹکی بجا کر کہتے ہوئے سامنے موجود شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مکمل

اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ مزید کچھ متاثر ہوتے ہوئے اس شخص کے رویے نے بھی اسے اعتماد بخشا تھا۔ نوری آدم نے پھر سے ماہرانہ انداز میں باتیں شروع کیں تو وہ مطمئن ہو کر اسے گھر لے آئے۔

''کیا لیں گی آپ؟'' وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھے تھے جہاں دنیا کے بہترین آرٹ کے نمونے دیواروں پر آویزاں تھے۔ ان کی بیوی اور بچوں کی تصاویر دوسری دیوار پر نسب تھیں اور ان ہی تصاویر سے الگ قدرے پرانی تصویر میں وہ کسی عورت کے ساتھ موجود تھے جوانی جوانی میں خاصی حسین دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ مسکرادی۔

''کیا لیں گی آپ؟'' اس شخص کی بیوی نے تصویر پر نگاہ جماتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تھا، نوری آدم اپنے حواس میں لوٹی۔ سیاہ فارم عورت کی نگاہ میں عجیب ہی کچھ تھا۔

''جج...... جی...... جی...... پانی۔'' وہ مصنوعی



انداز میں مسکراتے ہوئے نگاہ پھر تصویر پر جما چکی تھی۔
وہ پہلی عورت بے انتہا حسین تھی ایسی ہو!
تصویر تو اس کمرے میں بھی تھی جہاں وہ پچھلے کئی سالوں سے رہائش پذیر تھی۔ اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلا۔
"یہ....." نوری آدم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے پوچھنا چاہا تھا وہ اس کے لب کھولنے سے پہلے ہی بول اٹھے۔
"یہ میری پہلی بیوی ہیں۔" پہلی بیوی کے ذکر پر وہ کسی قدر آزردہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ سوالات پوچھی جا رہی تھی، ویسے ویسے اس پر یہ کھلتا جا رہا تھا کہ ماضی میں لیے گئے فیصلوں پر وہ کس قدر آزردہ محسوس ہو رہے تھے، ایک افسوس تھا۔ ایک قلق تھا۔ ایک بے چینی سی تھی جس نے سب کچھ دے کر بھی خلا سا چھوڑ دیا تھا۔
"اور آپ کی دوسری بیوی کا تعلق کہاں سے ہیں، کیا نام ہے ان کا؟"
وہ اپنے سوال کا جواب لینے کے بعد مختلف سوال کرتی انہیں مطمئن کرنے لگی کہ وہ ایک رپوٹر ہی ہے ورنہ تو دوسرے جواب کے بعد ہی اس میں وہاں بیٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن بحالت مجبوری اسے یہ ذمہ داری نبھانی ہی تھی۔

☆☆☆

اسے نہ بارشوں سے عشق تھا نہ ہی تنہائیاں اس کی اولین چاہت۔ اسے نہ زمانے سے سروکار تھا نہ ہی ستائش درکار تھی۔ لیکن برسات اسے آنسوؤں کے ذریعے سونپ دی گئی تھی۔ تنہائیاں اس کے نصیب کی سیاہی کی بدولت جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی مل گئی تھیں تو زمانے کی آس و نراس میں ڈوبی باتیں اس کے کانوں میں پڑتیں تو دل ڈوب ڈوب کر ابھرنے لگتا۔ ستائش تو کبھی زندگی کا حصہ رہی ہی نہ تھی لیکن جھڑکیاں بھی تو بات بے بات قسمت کی دہلیز پر آ براجمان ہوئی تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں کو چندھیا کر دیکھنے کی کوشش کرتی تو ہر دیکھنے والی نگاہ اس کی جانب مبذول ہو جایا کرتی اور سارے رنگ پھیکے پڑ جاتے، پھر جو نظر آتا وہ بس ہمدردی ہوتی یا کراہیت۔
مکمل انسان ادھوری انسانیت لیے اس سے ہمدردی کرنے کو آگے بڑھتے، سہارا دیتے تو اپنی لمس شناسی کے باعث لوگوں کے دلوں کا حال جان لیا کرتی۔ اس ادھوری سی ذات کی لڑکی کو مکمل لمس شناسی کا تحفہ عطا کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی ذات میں موجود خلا کبھی نہیں بھر سکا۔
جان لٹاتی والدہ بھی جب اس کے لبوں کی جانب چمچہ بڑھاتیں تو عیسیٰ کے خدا سے اپنے شکوے شکایات کا پنڈورا باکس کھول لیتیں۔ تب اس کی بھوک مر جاتی لیکن پیٹ بھر جایا کرتا۔ یوں بھی اس کی ہڈیوں سے چپکی کھال میں گوشت کی تہ نہیں جم سکی، نخرے کرنے اور فرمائشیں کرنے کی اسے اجازت کبھی تھی نہیں کہ وہ دنیا کے رنگوں سے نا آشنا تھی سو پہننے کا سلیقہ جو بچپن میں تھا وہ اب صرف تصاویر تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔
والد صاحب کو بیٹی سے صرف اتنی سی ہی ہمدردی تھی کہ وہ زمانے بھر کی دولت اپنی اکلوتی اولاد کے لیے جمع کرتے کرتے شہر کے امیر ترین شخص بن چکے تھے مزید انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔

☆☆☆

"اے عیسیٰ کے خدا....." عیسیٰ کے خدا کو پکارتے ہوئے اس کا دل لرز جایا کرتا۔ لبوں پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ شکوے کرنے کی ہمت تو کبھی تھی ہی نہیں لیکن ان بند آنکھوں سے مانگتی بھی تو کیا مانگتی؟ اس کی نگاہ کائنات کے حسن سے خیرہ نہیں ہو سکتی تھی کہ کوئی خواہش من کی دہلیز پر آن وارد ہوتی۔
"میرے لیے اس دنیا میں ایسا کیا ہے جس کے لیے مجھے زندہ رکھا گیا ہے؟" آج پہلی بار ایسا تھا کہ وہ کوئی سوال پوچھ رہی تھی ورنہ تو ہر بار خاموشی ہی سوال ہوا کرتی۔ خاموشی ہی شکوہ ہوا کرتی اور دل میں ٹھاٹھیں مارتا غمِ بیکراں کا سمندر بھی خاموشی سے ہی آنکھوں کی دہلیز سے بہہ جایا کرتا۔

یہ روس کے شہر ماسکو کا وہ چرچ تھا جس میں ہر اتوار اس کی حاضری لازمی ہوا کرتی۔ وہ ہر بار عیسیٰ کے خدا کو پکارتی اور خاموشی ہو جاتی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی ہے جو اس بند چرچ میں اس کی حاضری سے واقفیت رکھتا ہے، کوئی ہے جو اس کے ان کہے غموں کو سنتا ہے۔ کوئی ہے جسے اس کے خاموشی سے بہتے ہوئے آنسو بھی نظر آتے ہیں۔ قیمتی لباس سے چھپانے کی کوشش کی گئی ادھوری ذات کے راز سے واقف ہے۔ وہ لوگوں کے جانے اور ان کی مخصوص عبادت کے بعد تادیر وہیں بیٹھی عیسیٰ کے خدا کو اپنی خاموشی سے مخاطب کیا کرتی۔ وہ سارے غم کہہ سناتی جن کی وجہ سے اضطراب اس کی ادھوری ذات کا حصہ بن گیا تھا۔

آج بھی وہ وہیں بیٹھی تھی، تب ہی چرچ کے فادر اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے ''بی بلیسڈ'' کی دعا دے کر گئے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ اگر اسی طرح ''بلیسڈ'' رہنا ہے تو پھر اس کے ہونے کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ فادر کے قدموں کی آواز دور جاتی ہوئی سنائی دی تو لب کھولے۔

''ایسا کون ہے جسے میری ضرورت ہے؟ اور ایک آنکھوں سے اندھی لڑکی کس طرح کسی کی ضرورت پوری کرسکتی ہے؟'' اس کے لب آہستگی سے ہل رہے تھے۔ لیکن جواب ندارد تھا۔ وہ مایوس نہیں ہوئی لیکن تڑپ اٹھی تھی کہ اگر وہ پچھلے پندرہ سال سے اس کی خاموشی کی زبان سمجھتی رہی ہے۔ خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتی رہی ہے تو پھر عیسیٰ کا خدا اس سے ایک بار بات کیوں نہیں کر لیتا؟

''میں نے آج بہت آس سے پکارا تھا۔ آج تو عیسیٰ کے خدا کو بولنا چاہیے تھا۔ آج تو مجھے امید کا وہ سرا تھمانا چاہیے تھا کہ جسے پا کر میں چرچ سے باہر قدم رکھتے ہوئے پر امید ہوتی۔ آج تو اسے مجھے ٹوٹنے سے بچانا چاہیے تھا۔

عجیب تڑپا دینے والا لہجہ تھا جو بھی سنتا قدم روک دیتا۔ تڑپ تھی کہ دل کو چیر دینے والی تھی۔ آنسو تھے کہ سب بہا کر لے جانے والے تھے۔ وہ اٹھی، چھڑی کو سیدھا کیا اور پھر قدم آگے رکھتے ہی کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ گرنے کو تھی کہ کسی نے تھام لیا۔ اور سسکیوں کا تمام شور یکدم سکوت میں تبدیل ہو گیا۔ اندھیرے میں ایک لو جگمگا اٹھی۔ یہ وہ پہلا لمس تھا جس میں نہ ہمدردی تھی، نہ کراہیت تھی نہ ہی اس کی توہین کرنے کا جذبہ۔ یہ وہ بازو تھے جن میں تحفظ تھا اور بے شک یہی تو سب کچھ تھا۔

''عیسیٰؑ کا خدا بولتا ہے لیکن اس سے بات کرنے کے لیے چرچ نہیں آنا پڑتا، وہ ہر گھر اور ہر اس جگہ مل جایا کرتا ہے جہاں اسے تلاش کیا جائے۔ تم سالہا سال اس جگہ عیسیٰؑ کے خدا سے مخاطب ہونے آتی رہی ہو لیکن عیسیٰؑ کے خدا کے پاس تو وہ صلاحیت ہے کہ وہ تم سے کسی بھی جگہ مخاطب ہوسکتا ہے۔'' وہ اسے انتہائی سلیقے سے اٹھاتے ہوئے دور ہٹا تھا وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ چھڑی سے زمین کو جان بوجھ کر ٹٹولا، تاکہ خفت مٹائی جاسکے، تاکہ کسی کو احساس نہ ہو وہ اپنے ہونے پر شرمندہ ہے۔

''مجھے علم ہے سب۔'' اس کے چہرے پر ایک پل کے لیے سختی سی چھا گئی تھی۔ سامنے والے کے چہرے پر بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔

''تو پھر شکوے شکایات کیسے؟'' اس بار وہ مسکرا دیا تھا لیکن ایلیسا کے چہرے پر سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

''معذرت کہ آپ کو سننے کا میرا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں فادر کو یہ دینے آیا تھا وہ یہ لائبریری چھوڑ آئے تھے۔'' ہاتھ میں پکڑی کتاب آگے کرتے ہوئے وہ بولا تو ایلیسا کے چہرے کے نقوش معمول پر آئے۔

وہ انتہائی خوب صورت لڑکی تھی، حسن سے بھرپور۔ کھڑے نقوش لیے وہ کسی کے بھی دل میں گھر کرسکتی تھی۔ یہ تاثیر احمد کا پہلا اندازہ تھا جو اس نے ایلیسا کو دیکھنے کے بعد لگایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹک اور آنکھوں کے ڈھیلوں کو معمول سے زیادہ گھومے ہوئے دیکھا تو مسکرا دیا۔ ایلیسا کچھ کہے بغیر آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے آگے بڑھنے لگی تو اس نے بھی ایک طرف ہونے میں غنیمت

جانی۔ لیکن وہ دیر تک دور جانے والی لڑکی کی اپنی جگہ سے پھری آنکھوں کو سوچتے ہوئے گم رہا اور پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

عجیب اتفاق تھا کہ وہ جس روز سے چرچ سے آئی تھی اس لڑکے کی آواز اس کی سماعتوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی تھی۔ کم گو تو تھی ہی لیکن اسی قدر گم صم بھی ہو گئی تھی کہ میوزک جو اس کی واحد دلچسپی تھا وہ اسے بھی کسی حد تک بھول بیٹھی تھی۔

ماریا خود آج کل اس کے رویے پر پریشان بولائی بولائی سی پھرتی رہتی۔ ماریا وہ لڑکی تھی جو اس کی آنکھوں کے آخری آپریشن یعنی پندرہ برس کی عمر سے اس کی ساتھی تھی، جب ڈاکٹرز نے اس تیسرے آپریشن کو آخری آپریشن کہہ کر اس کی پھر سے دیکھنے کی امیدوں پر بند باندھا تھا۔ اس کے والد کی کوششوں کو لگام لگا دیا تھا اور اسی بندش کے بعد جس کی آنکھ سے وہ دنیا کو دیکھتی اور پھر اندازے لگایا کرتی تھی۔ ماریا ہی وہ لڑکی تھی جو اس کے ساتھ ہنستی اور جب وہ اداس ہوتی تو کسی نہ کسی زبان کا میوزک لا کر اس کی سماعتوں کو محظوظ ہونے کا موقع دیا کرتی۔

''ایلیسا کیا ہوا ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔'' ماریا کمرے کا چکر کاٹ کر پھر اس کے سامنے آن ٹکی تو ایلیسا نے بالکونی کی جانب سے چہرہ پھیر کر اس کی جانب کیا۔

''مجھے کیا ہو سکتا ہے ماریا؟'' سوال پر سوال تھا اور چہرے پر مسکراہٹ۔

''وہی تم سے پوچھ رہی ہوں۔'' ماریا کی آواز میں جھنجلاہٹ محسوس ہوئی تو کرب کے آثار ایلیسا کے چہرے پر نمودار ہو گئے۔

''تم بھی بیزار ہو گئی ہو مجھ سے؟''

ماریا نے اس کے تجزیے پر سر تھام لیا۔

''تم کبھی کبھی بہت فضول باتیں کرتی ہو۔'' ماریا نے ایلیسا کا ہاتھ تھام کر خفگی سے کہا، وہ محسوس کر سکتی تھی ماریا کس قدر سچی ہے۔

ماریا کا چناؤ بھی تو اس نے یہی لمس محسوس کر کے کیا تھا۔ جب والد صاحب نے ڈھیروں لڑکیاں اس کے سامنے لا کھڑی کیں جس کو چاہو ساتھی چن لو تو اس نے ماریا کے ہاتھ کا پہلا لمس پاتے ہی اسے آگے کی جانب کھینچ لیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ ایسے ماریا کی اور ماریا کو اس کی کس قدر ضرورت تھی۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟'' وہ اب سوال بدل کر پوچھ رہی تھی۔ ماریا ہنس دی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' لہجے میں کھنک نہیں تھی لیکن اندازہ تھا کہ سب معمول پر ہوگا۔ اس کا دیسی شوہر اپنے ملک سے لوٹے گا تو وہ تب کھنکے گی۔

''اتنی خوب صورت لڑکی کے گھر میں سب ٹھیک ہی ہوتا ہوگا۔'' وہ پھر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''ظاہر ہے۔'' وہ شرما سی گئی۔

ماریا جس طرح آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے نقوش اسے ازبر کروایا کرتی تھی وہ تصور کی آنکھ سے اسے بے تحاشا حسین لگا کرتی۔ وہ لمحے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیا کرتے تھے۔

''ماریا!'' وہ سوچوں سے پُر لہجے میں بولی۔

ماریا جو ہاتھ میں پہنی چاندنی کی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے خود بھی ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے اپنی سیاہ فراک سے نکلتے پیروں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی مصروف سے انداز میں گویا ہوئی۔

''ہوں۔''

''اس بار ہم میوزک نہیں سنیں گے۔''

''تو پھر کیا سنیں گے؟'' فوراً سے پیشتر رک کر اس نے ایلیسا کی جانب دیکھا۔ جو زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

''اس بار تم مجھے محبت کی کوئی انوکھی داستان سناؤ گی۔'' وہ حیران سی ایلیسا کی طرف پلٹی۔

''سب خیر تو ہے؟ یہ اداسی یہ غیر حاضر دماغی۔'' ماریا چھیڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ایلیسا کا چھت پھاڑ قہقہہ کمرے میں گونجا۔ یعنی وہ اس کے راز کو پا گئی تھی تبھی سنجیدگی سے گویا

ہوئی۔
"آنکھوں کی اندھی لڑکی محبت نہیں دیکھ سکتی۔"
"محسوس تو کر سکتی ہے؟"
"پہلی ملاقات میں کیا پتا چلتا ہے؟"
"یعنی ملاقات تو ہوئی۔"
"بس یونہی......سر راہ چلتے چلتے۔"
اور پھر ماریا ایلیسا کا سر کھانے بیٹھ گئی وہ دیر تک اسے ایسا کچھ نہ ہونے کے بارے میں تسلی دیتی رہی اور ماریا اس نوجوان کو کھوج نکالنے کا عزم ظاہر کرتی رہی۔

☆☆☆

وہ ایک خوب صورت صبح تھی جب بارش برسنے کو بے تاب اور ہوا کی آوارگی عروج پر تھی تب ہی ایسے موسم کی دلدادہ ماریا، ایلیسا کے لاکھ انکار کے باوجود اسے لائبریری گھسیٹ لائی تا کہ محبت کی کوئی انوکھی داستان خریدی جا سکے۔
"ایسے موسم میں یہاں آنے کی کیا تک بنتی ہے؟ اگر بارش شروع ہوگئی تو......؟"
وہ خفا، خفا سی تھی اور ماریا سنی ان سنی کرتے ہوئے، ہوا کے تیز جھونکوں سے بھرپور طریقے سے محظوظ ہوتے ہوئے اسے کیفے کے سامنے سے گزار کر لائبریری کے اندرونی حصے کی جانب لے آئی۔
"یہاں پر عشق کی داستانیں کس طرف ہیں۔"
وہ لہجے میں چھپی شوخی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے شاید کسی شخص سے پوچھ رہی تھی۔ ایلیسا منہ ایک طرف کر کے مسکرادی۔ وہ بھلا کہاں جانتی تھی کہ کسی کی نگاہ اسی کی طرف جمی ہوئی ہے جہاں کھڑی وہ مسکرا رہی تھی۔
"جہاں بھی نظر ڈالیں وہیں مل جائیں گی۔ خصوصاً مشرق کی سمت۔" وہ انتہائی مؤدب انداز میں استہزائیہ جملہ کہہ رہا تھا۔
ایلیسا نے فوراً سے پیشتر ماریا کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ ردعمل سامنے موجود نوجوان کو جہاں بے تحاشا بھایا تھا وہیں ماریا کو بھی چونکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران سی حیران تھی۔ ایلیسا نے ماریا کا بازو کھینچ کر قریب کرتے ہوئے کان میں ایک سرگوشی کی تو وہ ہنس پڑی۔ نگاہ سامنے مسکراتے ہوئے شخص پر پڑی تو پھر بس وہیں ٹھہر گئیں۔

☆☆☆

"ایک عالم کو بے خبر رکھ کر محترمہ ایشیاء کے حسین ترین مرد پر دل ہار بیٹھی ہیں اور پھر ہمیں کہتی ہیں کہ ایک آنکھوں کی اندھی لڑکی محبت نہیں دیکھ سکتی۔"
ماریا گھر پہنچتے ہی اس کی کلاس لینے لگی تھی۔ ایلیسا کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھرے دیکھ کر ماریا کی آنکھوں میں بھی ڈھیروں رنگ امڈ آئے تھے۔
کوئی آپ کا بہت قریبی شخص یا قریبی رشتہ تادیر امتحان میں رہنے کے بعد قدرت کی جانب سے نوازا جائے تو دل کو یک گونہ سکون مل جاتا ہے اور ماریا بھی ایلیسا کی خوشی میں بے تحاشا خوش تھی لیکن ایلیسا کی محتاط طبیعت تھی کہ وہ اب تک یہ بات قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی کہ وہ اس ایشیائی مرد پر دل ہار بیٹھی ہے۔
"مجھے بتاؤ ماریا وہ شخص کیسا دکھتا ہے؟" وہ اپنے ریشمی بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے کہہ رہی تھی ماریا شرارت سے گھوم کر گویا ہوئی۔
"تم کہتی ہو تو کہے دیتی ہوں ورنہ میرا ہرگز ارادہ نہیں اس کی تعریف کرنے کا۔" لہجے میں سنجیدگی محسوس ہوئی تو ایلیسا کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔
"کوئی اور تمہیں مجھ سے بڑھ کر عزیز ہو گیا تو؟" ماریا کے خوف نے ایلیسا کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔
"یہ سب یکطرفہ ہے میری جان۔"
"اس کی آنکھوں سے تمام اندازے لگا آئی ہوں۔" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ منہ بسور رہی ہے۔
ایلیسا کو ماریا پر بے تحاشا پیار آیا۔ اور اس محبت کا اظہار اس نے ماریا کے ہاتھوں کو آگے بڑھ کر

تھامتے ہوئے کیا۔

''بہت حسین ہے۔ چاکلیٹ رنگ کی چمک دار آنکھیں، سانولا مگر پرکشش رنگ، ہلکے گھنگریالے بال، کھڑے نقوش، خوش شکل نوجوان ہے۔'' ماریا گویا اس نوجوان کو تصور میں لا کر ایک ایک خوبی بتا رہی تھی۔ ایلیسا کے کانوں میں سریلا سا کوئی نغمہ گونجنے لگا۔

''اور بتاؤ......''

''لمبا قد......مناسب جسم......قابل قبول سے بڑھ کر۔'' لہجے کی شوخیوں سے وہ اس کے حسن کا اندازہ لگا رہی تھی۔

''ماریا......''

وہ جو نوجوان کی خوبیاں گنوانے کے بعد اپنے ہاتھ میں موجود محبوب شوہر کے تحفے میں دیے کنگن کو گھمانے لگی تھی خیالوں سے چونک کر گویا ہوئی۔

''ہوں......''

''میں کیسی ہوں؟''

آج سے پہلے یہ سوال تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ واقعی سنجیدہ ہوگئی تھی؟ یہ کوئی کھیل نہیں تھا دل کا معاملہ تھا۔ ایشیائی مردوں کے معاملے میں تو مشہور تھا کہ ذرا سا نقص ہو تو محبوبہ قبول نہیں کرتے بیوی تو دور کی بات تھی اور ایلیسا تو ''ون مین وومن'' تھی۔ وہ اس کا دل ہرگز توٹنے نہیں دینا چاہتی تھی وہ دعا گو تھی کہ اس کی محبت سدا اس کی رہے۔۔ اسے محبت کی جانب سے کوئی غم سہنے کو نہ ملے۔

''تم بہت معصوم ہو۔ سو حسن کا شاہکار ہو۔'' ماریا کے لہجے میں درد ہی درد تھا۔ ایلیسا کے سینے میں ٹیس اٹھی جسے ایک مسکراہٹ کے نیچے دبا لیا۔

''یعنی بہت خوب صورت ہوں۔'' لہجے میں بشاشت سموئے سوال برائے سوال کیا تھا۔ ماریا نے پرزور تائید کی۔

''پہلی بار ایک خواہش نے سر اٹھایا ہے کہ میں بھی دنیا دیکھوں......'' اور اس ایک خواہش کے بعد کتنی ہی لاتعداد خواہشات تھیں جو کبھی ایلیسا کی زبان پر نہیں آئی تھیں لیکن ان سے ماریا واقف تھی۔

☆☆☆

محبت رنگ و نسل سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہ آپ کے دل میں تب بھی گھر کر سکتی ہے جب آپ موت کے دہانے پر کھڑے زندگی کے باقی ماندہ دن گن رہے ہوں۔ یہاں تو معاملہ نرالا تھا۔ ایک محبت کو ترسی ہوئی تھی تو دوسرے شخص میں کسی ادھوری ذات کو مکمل کرنے کی جستجو ٹھہری ہوئی تھی۔ بہت عجیب خواہش تھی لیکن جب تاثیر احمد نے لائبریری کے سامنے موجود کیفے میں بیٹھ کر ایلیسا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے مکمل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ایلیسا کے روم روم میں محبت رچ بس گئی۔ بس ایک لمحہ لگا تھا اسے ایلیسا سے تاثیر ہونے میں۔ اور وہ ہوگئی تھی۔

''میں تمہاری ذات پات، حسب و نسب سے بالاتر ہو کر بس تمہیں مکمل کرنے کی چاہ رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دنیا ماریا کی نہیں میری نگاہ سے دیکھو۔ اور پھر محسوس کرو کہ حسن کس قدر ہے۔ تم میری سوچوں کے سنگ چلو اور محسوس کرو کہ ہر طرف امید کی کرن ہے اندھیرا کہیں نہیں۔ میرے یقین پر یقین رکھو اور پھر عیسیٰؑ کے خدا کو ڈھونڈنے کے لیے چرچ میں نہیں اپنے دل میں جھانک کر بتانا کہ خدا ہر طرف ہے یا نہیں۔''

اتنی خوب صورت تاویلیں سننے کے بعد اس میں کچھ کہنے کی سکت کب باقی رہی تھی۔ وہ تو اپنی انگلیوں سے مس ہوتی تاثیر احمد کی انگلیوں میں اپنے دل کو پھسلتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس پر تو یکا یک محبت کے سب ہی راز منکشف ہونے لگے تھے۔ وہ خوب صورت جملوں کی ادائیگی سیکھ گئی تھی۔ حال دل کے تمام تر رازوں کو بیان کرنے کی جیسے کنجی ہاتھ لگ گئی تھی۔ وحی کی مانند محبت اس کی جسم و جاں میں حلول کر گئی تھی۔

''ہر ایشیائی مرد آپ کی طرح خوب صورت باتیں کرتا ہے؟'' کچھ نہ بن پایا تو بات کو مزاح کی جانب موڑ لے گئی۔

''ہر لڑکی آپ سی حسین ہوتی ہے؟'' سوال کے بدلے سوال ہوا تھا وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تو پھر میں ہاں سمجھوں؟'' وہ جیب سے پیسے نکال کر بیرے کو اشارہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔ ایلیسا کے چہرے پر حیا کے کئی رنگ آکر بکھر گئے۔ وہ پچھلے تین ماہ سے اس سے مل رہی تھی اور ہر بار ہی اس کی باتیں ایلیسا کو کسی اور جہاں میں لے جایا کرتیں۔ اسے سنتی تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی گردانا کرتی۔

☆☆☆

''مجھے تکلیف ہوگی اگر تم یوں بن بتائے مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ کچھ کہو گی تو میں تمھاری مشکل کو آسان کرسکوں گی نا۔'' ماریا کی سسکیاں ایلیسا کو اندر تک سے چیر رہی تھیں اور ایک وہ تھی کہ خاموشی کا قفل لبوں پر لگائے نہ بولنے کا عہد کیے بیٹھی تھی۔

''تم بہت خوش ہو اور میں تمھیں اس عالم میں پریشان نہیں کرنا چاہتی ایلس۔'' سسکیوں کے درمیان سے کپکپاتے لہجے میں بہت آہستگی سے وہ چند لفظ ادا ہوئے تھے اور ایلیسا نے سر تھام لیا۔

''لیکن اتنی خوش نہیں ہوں کہ تمھارے غم کا مداوا نہ کرسکوں۔ تمہارے غم پر بہت نہ سہی لیکن لفظوں سے مرہم رکھنے کا ہنر تو مجھے آتا ہی ہے۔ تم پچھلے سات سالوں سے مجھ سے اپنا ہر راز کہتی آئی ہو، آج ایسا کیا ہوا کہ تم کترا رہی ہو؟'' وہ بہت سنجیدگی سے استفسار کر رہی تھی۔ ماریا کی سسکیاں تھمیں تو وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی۔

''محبت تکلیف دہ ہے ایلیسا۔ وہ زمین زادہ جسے میں نے خدا سمجھ کر پوجا تھا وہ نئی داسی کے پیچھے قربان ہوا چاہتا ہے۔''

ماریا کے آنسوؤں کے ساتھ اب اس کی آہ بھی شامل ہوگئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ کیسے وہ اس کے نام کی مالا جپا کرتی تھی۔ وہ کیسے معراج کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ لیکن وہ گھر سے باہر دوسرے شہر نکلا تو دنیا کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ ماریا کے تمام تر احسانات کو بھلائے پر نکل آنے پر اُڑ گیا۔ مرد بھلا کب تک احسانات کا بار اٹھا سکتا ہے؟ صرف تب تک جب تک اس میں مروت باقی رہے اور مرد کو کیا ضرورت ہے کہ وہ دل کو مار کر مروت نبھائے وہ معاشرے کا حاکم ہے سو جس طرف چاہے گا چھوٹے قد کے ساتھ بھی لمبی اڑان بھرلے گا۔

ایلیسا کے پاس اسے دینے کو کوئی دلاسا نہیں تھا لیکن وہ لوگ تاثیر احمد سے ملے تو اس نے لفظوں کے وہ پھاہے رکھے کہ ماریا کو لگا کہ جیسے زندگی میں بے وفا لوگوں کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ جو چلا گیا سو چلا گیا۔ اس کے جانے پر رونے سے جی کو جلانا کیسا اور پھر جب کسی شے پر اختیار نہیں تو اس کے لیے مرنا کیسا؟

ایلیسا جہاں بہت مطمئن تھی وہیں ماریا بھی آسودہ سی مسکرا رہی تھی۔ محبت کی جدائی صرف لفظوں کے پھاہے رکھنے سے کہاں بھرتی ہے؟ چند لمحوں بعد لفظوں کا اثر زائل ہوتا ہے تو محبت کا میٹھا سا درد پھر سے سینے میں جگہ بنا لیتا ہے لیکن اتنا تو ہوا تھا کہ آنسو اب خشک ہوگئے تھے کچھ عرصے بعد صبر بھی آجانا تھا۔

☆☆☆

''اوہ میرے خدا۔ جب اسے اس کی محبت مل رہی تھی تو پھر شاہ لطیف نے قبول کیوں نہیں کی؟''

''کیونکہ اسے وہ محبت مل گئی تھی جو دنیا کے کسی بھی شخص کو مل جائے تو پھر اسے کسی اور شے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔''

''کس کی محبت؟'' حیرانی لہجے میں سموئے سوال ہوا تھا۔

''خدا کی محبت۔''

''یعنی کے عیسیٰ کے خدا کی محبت؟''

''ہم...... محمد ﷺ کے خدا کی محبت۔''

''آہ! محمد ﷺ کا خدا الگ ہے؟'' وہ جیسے مایوس ہوئی۔

''خدا تو سب کا ایک ہے۔''

''پھر فرق کیسا؟''

''فرق...... صرف اتنا ہے کہ تم اسے عیسیٰ کا خدا

مانتی ہو۔ عیسیٰؑ جو اللہ کے پیغمبر ہیں...... اور میں بھی اسی خدا کو مانتا ہوں، محمد ﷺ جس کے نبی ہیں۔"

"میں فرق نہیں سمجھی۔" ناسمجھ بچی کا سا انداز تھا۔

"میرا ایمان ہے کہ میں ایک کامل دین پر یقین رکھتا ہوں۔"

"تمھیں یقین ہے کہ تم صحیح ہو؟"

"سو فیصد۔"

"شاہ لطیف کی محبت کی داستان نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن کیا تھا اگر وہ سیدہ سے شادی کر لیتا۔"

"چاہ باقی نہیں رہی تھی۔ اسے جس شے کی تلاش تھی وہ مل گئی تھی۔" تاثیر احمد کا لہجہ مدہم ہو گیا تھا اور ایلیسا بھی پھر کسی خیال میں گم رہی۔ تادیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وقت گزرنے کا احساس ہوا تو اس نے تاثیر احمد کو مخاطب کیا۔

"ہم تمہارے وطن جائیں گے تو ان کے مزار پر منت کا دھاگا باندھیں گے۔" ایلیسا کے لہجے میں اشتیاق تھا وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"کیا منت؟"

"جب پوری ہو گی تو بتاؤں گی۔ فی الحال مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

"گھر؟" وہ چونکا۔

"ممی۔ ڈیڈی سے نہیں ملنا۔" جواباً سوال کر کے اس نے تاثیر احمد کو حیران کیا تھا۔

وہ پچھلے ماہ سے مسلسل اس کے والدین سے ملنے کا کہہ رہا تھا اور وہ اسے لگاتار ہی ٹالتی رہی تھی اور آج اچانک ہی اسے حیران کر گئی تو وہ جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے ملنے کو بے تاب نظر آیا۔

"جلدی چلو کہیں دیر نہ ہو جائے۔" ایلیسا کو اس کی جلد بازی نے قہقہہ لگا کر ہنسنے پر مجبور کیا تھا۔

☆☆☆

توقع کے برعکس ممی اور ڈیڈی کا ردعمل بہت سخت تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ اس جیسے بوجھ کے سر سے اترنے پر شکر کا سانس ضرور لیں گے۔ لیکن جہاں ممی نے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا وہیں ڈیڈی نے بھی سختی سے اس شادی سے انکار کر دیا تھا اور وجہ تاثیر احمد کا نہایت غریب، بے گھر ہونے کے علاوہ اس کا مسلمان ہونا بھی بتایا۔

ایلیسا کے لیے کسی بھی فیصلے پر پہنچنا بے حد مشکل ہو گیا۔ تاثیر احمد کو چھوڑ دینا اس کے اختیار میں نہیں تھا اور ممی ڈیڈی کو منا لینا بھی اس کے بس سے باہر کا کام تھا۔ ایسے میں اس نے وہی کیا جو مغرب کی اکثر لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ اپنے طور پر فیصلہ لے کر وہ تاثیر احمد کی رائے کی منتظر تھی اور وہ اسے والدین کے مخالف نہ جانے کے لیے سمجھانے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ وہ محبت میں اندھی تھی جبکہ تاثیر احمد کا کہنا تھا کہ جہاں آنکھیں بند ہونی چاہئیں وہیں عقل کا استعمال کرنے کو دانش مندی کہتے ہیں۔

والدین سے تاثیر احمد کی لاکھ منت سماجت بھی کچھ کام نہ آئی تو دونوں نے کورٹ میرج کرنا مناسب سمجھا اور یوں ایلیسا ماریا کی مدد سے تاثیر احمد کی زندگی وہ حصہ بن گئی جو تاثیر احمد کے لیے نہایت قیمتی تھا اور جس کے بغیر اس کی زندگی مکمل طور پر ادھوری تھی۔

تاثیر احمد سے شادی کے بعد ایلیسا کے شب و روز محبت کی بارش میں بھیگتے ہوئے بسر ہونے لگے۔ وہ شخص جس نے کبھی اس کا ہاتھ تھامنے سے زیادہ کی جسارت نہ کی تھی وہ اب اس پر محبت لٹا رہا تھا تو ایلیسا قربان ہوئے جا رہی تھی۔ وہ لمس شناس لڑکی...... اپنے شوہر کی ہر ہر ادا پر قربان ہو جانا چاہتی تھی۔ ایسے ہی کسی لمحے میں تاثیر احمد کے پہلو میں بیٹھے جب وہ نئی نویلی دلہن والے اس کے تمام نخرے اٹھانے کے موڈ میں تھا ایلیسا نے اس کا کالر چھیڑتے ہوئے نہایت دھیمے انداز میں اسے پکارا تھا۔

"تاثیر احمد......"

"ہوں۔" جواب موصول ہوا تھا۔

"مجھے ماریا نے سب بتا دیا ہے۔"

''کس بارے میں؟'' وہ بالکل نہیں چونکا نہ ایلیسا کے ہاتھ پر پڑی گرفت کمزور پڑی تھی۔

''یہی کہ تم کس قدر خوب صورت ہو۔'' ایلیسا کی بات نے اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کیا۔ وہ منہ بسورے یونہی بیٹھی رہی تھی تب تک تاثیر احمد نے سنجیدگی سے معذرت نہ کرلی۔ جواباً وہ شوخی سے اسے مزید خواہش سے آگاہ کرنے لگی۔

''لیکن مجھے شدید خواہش ہے کہ میری نگاہ کے سامنے سے یہ دھند چھٹے اور میں تمھیں اپنے سامنے یونہی بیٹھے ہوئے دیکھ سکوں۔ مجھے یہ خواہش ہے کہ میں تمھاری آنکھوں میں جھانک کر تمہارے ہر احساس کو جان لوں اور جس قدر تم میرے لیے بے چین رہتے ہو وہ سب تمہارے بتانے سے پہلے محسوس کرلوں۔ تمہاری ہر ہر حرکت کو دیکھوں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔ تم کس طرح سوچتے ہوئے۔ تم کس طرح کھاتے ہو۔ مجھے بہت خواہش ہے تاثیر۔'' وہ حسرت سے اپنی خواہشات تاثیر احمد کے سامنے رکھ رہی تھی اور وہ اس کی محبت پر مسکرائے جارہا تھا۔

''اور ایسا ضرور ممکن ہوگا شہزادی۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہوئی ہے اور انہوں نے مجھے اچھی امید بھی دی ہے۔''

اور اس کے بعد وہ تمام تر تفصیلات سننے کے بعد ماریا سے ملنے پہنچ گئی تاکہ اپنے بینک اکاونٹ کی ڈیٹیلز جو اسے معلوم تھیں وہ لے سکے اور آپریشن کا خرچا وہ خود اٹھا سکے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تاثیر احمد کھانے کا خرچا ہی بمشکل اٹھا پا رہا تھا کجا کہ آپریشن کا خرچا...... ماریا کے پاس پہنچی تو جو خبر اسے سننے کو ملی وہ بہت حیران کن تھی۔ اس کے اکاونٹ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا دوسرے معنوں میں اس کا اکاونٹ سیل ہو چکا تھا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے ماریا؟'' ایلیسا اپنا سر تھامے بیٹھ گئی۔

''تمہارے ڈیڈی ہیں جو چاہیں کروا سکتے ہیں۔'' وہ خود کچھ افسردہ سی نظر آرہی تھی۔

''تمھیں کیا ہوا ہے؟''

''تمہارے بعد انکل نے مجھے بھی گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اب میرے پاس کوئی نوکری نہیں ہے۔''

''اوہ...... لیکن تم ڈھونڈو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ضرور کوئی اچھی نوکری مل جائے گی۔'' وہ دلاسا دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بے ساختہ ہی درد سے بھرپور ماریا کی ہنسی نے ماحول کو خاموش کردیا تھا۔

''ہاں میری تاثیر احمد سے بات ہوئی تھی اس بارے میں۔ اس نے جگہ کا بتایا ہے، کل جاؤں گی وہاں لیکن تم کہیں نہیں ملو گی اب۔'' اور اس کے بعد پھر دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی، کچھ کہہ نہ سکا۔

ایلیسا اسٹک کی مدد سے اٹھی تو ماریا نے ہمیشہ کی طرح ہاتھ تھام کر اسے ٹیکسی میں انتظار کرتے تاثیر احمد کے پاس چھوڑا اور گھر کا چھوٹا سا دروازہ بھیڑ کر اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ سوچیں وہیں کہیں ماضی میں اٹکی ہوئی تھیں جہاں کبھی اس کی محبت اس کے ہمراہ ہوتی تھی اور وہ بے تحاشا خوش تھی۔

☆☆☆

تاثیر احمد کی ڈاکٹر سے بات ہوگئی تھی۔ وہ اسے کامیاب آپریشن کی گارنٹی دے رہا تھا۔ لیکن پیسے نہ ہونے کے باعث دونوں نے ہی اس معاملے میں منہ پر قفل لگا لیا اور زندگی بالکل پہلے کی طرح ہنسی خوشی گزارنے لگے۔ تاثیر احمد روزانہ ہی اسے خوش کرنے کو کچھ نہ کچھ نیا کرتا رہتا تھا۔ کبھی کسی شہزادی کی داستان لاکر سناتا تھا تو کبھی کسی کی جوڑی کو ان کی جوڑی سے تشبیہہ دے کر اس کے حسن کی قصیدہ گوئی میں مصروف رہتا۔ اس نے کبھی بھی ایلیسا کو اپنے فیصلے پر پچھتانے کو موقع نہیں دیا تھا کیونکہ بقول تاثیر احمد کے کہ وہ خود عرصہ دراز سے تنہا رہا تھا اور اب جاکر کہیں اسے اس کی روح کا ساتھی ملا تھا سو وہ کسی بھی قیمت پر اسے کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

اور تاثیر احمد کی بے تحاشا محبت ہی کا اثر تھا کہ

ایلیسا نے پھر کبھی اپنے والدین کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ بھی باقی اولادوں کی طرح اپنے مطلب کی زندگی پا کر والدین اور ان کے گھر گزارا ہوا ہر پل بھول گئی کیونکہ وہاں درد تھا، تنہائی تھی اور یہاں تنہائی جب بھی میسر آتی تو ساتھ محبت کا لمس ہوتا۔ یہاں وہ ماں نہیں تھی جو کھانا کھلاتے ہوئے عیسیٰ کے خدا سے اس کی آنکھوں کے لیے شکوہ کرتی یا اس کی قسمت کو کوستی رہتی تھی۔ یہاں تاثیر احمد تھا جو اپنی محبت کے دعووں میں سچا تھا۔ جو ہر روز اور ہر وقت کا کھانا کھلاتے ہوئے بہت محبت سے ہر عمل دہراتا تھا۔

دوسری طرف ایلیسا کے والدین تھے جو یہ سمجھ رہے تھے وہ بھی ہر دوسری لڑکی کی طرح مشرقی مرد کی بے وفائی یا اس کی پابندیوں سے گھبرا کر واپس آجائے گی لیکن چھ ماہ اور پھر چھ سال گزرنے کے بعد بھی وہ نہ لوٹی تو ماریا کے ذریعے اس کے والدین نے اس سے رابطہ کیا۔ ماریا نے ان چھ سالوں میں اس کی ہر ممکن مدد کی اور جس طور ایلیسا کو مدد کی ضرورت ہوتی وہ حاضر رہتی۔ ایلیسا اپنے والدین سے ملی تو پچھلے چھ سالوں کے تمام دکھ درد گلے شکوے آنسوؤں میں بہہ کر دور ہوئے تو انہوں نے تاثیر احمد کو دل سے اپنا بیٹا تسلیم کرتے ہوئے گھر چلنے اور ان کا کاروبار سنبھالنے کی پیش کش کی جسے نہایت احترام سے تاثیر احمد نے سنبھالنے سے انکار کر دیا۔

"میرے لیے جو سب سے قیمتی ترین ہے وہ میرے پاس ہے اور آپ سے اب دعاؤں کے علاوہ کسی شے کی درخواست نہیں ہے۔"

تاثیر احمد کس قدر سلجھا ہوا تھا ایلیسا جانتی تھی۔ اور وہ اس کے ہر ہر فیصلے سے مطمئن بھی تھی اور اسے یقین تھا کہ تاثیر احمد تمام عمر اسے یونہی چاہتے ہوئے گزار دے گا لیکن کبھی اس سے بے زار نہیں ہوگا۔ فیصلہ کرنے کو چھ سال کا عرصہ کافی تھا اور بات صرف نظر کی نہیں تھی بات اس کی خالی گود کی بھی تھی جس کے خالی ہونے کا تاثیر احمد نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ اس دوران تاثیر احمد نے دن رات محنت کر کے ایلیسا کا ایک آپریشن کروا لیا تھا اور دوسرے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ جب تک پہلے کے زخم ٹھیک ہوتے تب تک تاثیر احمد کو کچھ پیسے جمع کرنے تھے اور جس کے بعد ایلیسا بھی پہلے کی طرح مکمل طور پر دیکھنے کے قابل ہو سکتی تھی۔

اس کی نگاہ میں ابھی بھی بہت فرق پڑا تھا۔ وہ تاثیر احمد کو دیکھنے لگی لیکن بہت دھندلا اتنا ہی کہ جتنا کسی پردے کے پار سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ خوش تھی کہ ایک امید باقی ہے اور یہ امید تاثیر احمد کی بدولت ہی زندہ تھی کیونکہ وہ تھا جس کا ایمان محمد ﷺ کے خدا پر اس قدر مضبوط تھا کہ سامنے والا خود اس کے ایمان پر ایمان لے آتا تھا۔

ایلیسا نے بھی تاثیر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن پھر کچھ ہی عرصے بعد انہیں گھر کی جانب سفر کرنا پڑا جب ڈیڈی شدید بیمار ہوئے اور ممی نے بھی بستر سنبھال لیا تو ان کی طبیعت اور فکر کے پیشِ نظر وہ دونوں واپس اسی عالی شان محل میں آ کر رہنے لگے جہاں کبھی ایلیسا رہا کرتی تھی۔

ایلیسا نے گھر پہنچتے ہی ماریا کو خوشخبری سنائی تھی اور ماریا پھر دوڑی چلی آئی۔ لیکن ساتھ رہنے سے وہ بھی انکاری ہوئی اب دوسری نوکری کا سوال تھا بقول اس کے وہاں اسے اب بہت وقت دینا ہوتا تھا۔

ایلیسا کے ڈیڈی علیل ہوئے تو ان کی علالت لمبی ہوتی چلی گئی اور کاروبار کی تمام تر ذمہ داری اپنے آپ تاثیر احمد پر آن پڑی۔

زندگی نے یکا یک بہت مختلف انداز میں کروٹ لی تھی۔ ایلیسا کے ڈیڈی زندگی کی جنگ نہیں جیت سکے اور موت انہیں اپنے سنگ گھسیٹ کر گورستان تک لے گئی۔ پیچھے بین کرنے والے رہ گئے تھے اور وہ بھی کب تک بین کرتے ہیں؟

اب ایلیسا کے ساتھ تاثیر احمد بھی ان کی تمام تر ملکیت میں برابر کا وارث بن گیا تھا۔ وہ ایلیسا اور بیوی کی رضا مندی سے تاثیر احمد کو ایلیسا کے ٹھیک

ہونے تک سب سونپ گئے تھے کہ وہ بہت بھروسے کا آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی اکلوتی بیٹی کا محبوب شوہر بھی تھا۔

چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ممی بھی ایلیسا کو تاثیر احمد کے سہارے چھوڑ کر جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ ایلیسا کے لیے یہ سارا وقت تکلیف دہ ضرور تھا لیکن تاثیر احمد کے پل پل کے ساتھ نے اس کے زخموں پر نہایت سکون سے مرہم رکھا تھا۔ وہ تاثیر احمد کی محبت اور وقت کی تیز رفتاری کے باعث جلد ہی سب بھول گئی۔

☆☆☆

زندگی کے ہر موسم کو وہ دونوں ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ محبت ان کے آنگن کی لاڈلی تتلی تھی اور ہر شے پر یوں براجمان ہوتی جیسے اس محل اور اس کے مکینوں پر اس کی خصوصی نوازش ہو۔ وہ پچھلے نو سالوں میں کبھی اپنے فیصلے پر شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔ تاثیر احمد کی محبت جیسے اس کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا آب تھی۔ جسے وہ جتنا بھی پیتی کم ہوتا، نہ ہی ختم۔

ان نو سالوں میں جہاں وہ تاثیر احمد کی محبت کے حوالے سے بہت مضبوط ہو گئی تھی وہیں اسے تاثیر احمد کی ذات سے ایسا عشق ہو گیا تھا جو لفظوں میں بیان کرنے سے وہ ہمیشہ قاصر رہی تھی۔ اس شخص نے زندگی کا ایک خوب صورت حصہ اس آنکھوں کی اندھی اور اولاد کی نعمت سے محروم لڑکی کے سنگ گزار دیا تھا اور کبھی زبان پر کوئی شکوہ نہ لایا تھا۔ وہ اکثر عالم تنہائی میں جب دونوں کو ساتھ گزارنے کے لیے وقت ملتا تو وہ اس سے کہا کرتی کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن تاثیر احمد نے جیسے ہر شے کو اپنے طور پر کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔

''میری خواہشوں کا اختتام بس تم پر ہو جاتا ہے ایلس۔ مجھے تم سے زیادہ کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔''

''تم کیسے مرد ہو تاثیر۔ اتنے مختلف کیسے ہو؟''

''تم نے عاشقوں کی داستانیں نہیں سنی نا؟ سنتی تو سوال نہ کرتیں۔'' وہ اس کے جواب پر نہال ہو جاتی۔

''میری تمام تر ریاضتوں کا صلہ ہو تم۔ وہ جو میں عیسیٰ کے خدا سے کبھی کچھ نہیں مانگتی تھی نا جواباً انہوں نے تمھیں میری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ میں نے آخری بار ان سے سوال کیا تھا کہ میرے ہونے کی وجہ کیا ہے اور آج جواب میرے سامنے ہے۔ میرے ہونے کی وجہ تم ہو۔'' محبت لہجے سے بول رہی تھی۔ وہ اس قدر سادہ فہم تھی کہ سچ کہتے ہوئے بھی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔

''محتاج لوگوں کی اگر کبھی محبت کی داستان لکھی گئی تو ایلس کے تاثیر کا بھی ذکر ضرور ہوگا نا؟'' وہ بہت حسرت سے سماعت کو تاثیر احمد کی آواز سننے کے لیے یکجا کر رہی تھی۔ تبھی وہ دھیمی سی ہنسی ہنسا۔

''تم اس قدر مکمل ہو کہ مجھے بھی مکمل کر دیا ہے۔ میری ذات کو تمام تر اعتماد تمہارے ساتھ ہونے سے آیا ہے ایلس۔'' اس نے ایلیسا کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا تھا گفتگو کی کوئی گنجائش پھر باقی کب رہی تھی؟

☆☆☆

سننے میں آیا تھا کہ ماریا ان دنوں دوسرے شہر منتقل ہو گئی تھی۔ اسے ایک اچھی نوکری مل گئی تھی اس نے ایک بار فون کر کے معذرت کی تھی اور پھر اس کا نمبر بھی نہیں لگ سکا۔

ایلیسا اس کی خیریت کے لیے پریشان تھی کیونکہ پچھلے دنوں ہی وہ تاثیر احمد سے اپنے شوہر کی بارے میں ذکر کر رہی تھی کہ وہ اکثر اسے تنگ کرتا ہے اور منت سماجت کرنے لگتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے جب کہ اس کا کہنا تھا کہ وہ دل سے اتر چکا ہے اور کھوکھلے رشتے نباہنے کی وہ قائل نہیں۔ اور تاثیر احمد اسے تسلی دے رہا تھا، مختلف ہدایات دے رہا تھا اور پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی۔ معراج کی واپسی نے اسے اندر تک سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اسے اب اسی شخص سے نفرت کرنی پڑ رہی تھی جس سے وہ شدید محبت کی دعویدار تھی۔

''تاثیر احمد ماریا کی کوئی اطلاع ہے؟'' وہ فکر مندی سے تاثیر سے استفسار کر رہی تھی۔

''نہیں میری جان! اس دن کے بعد کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔''

وہ مایوس سی ہو گئی۔

''میں چاہتی تھی کہ وہ آپریشن کے دوران میرے ساتھ رہے، اور جب میں آنکھیں کھولوں تو آپ کے بعد اسے ہی دیکھوں۔'' وہ حسرت سے کہہ رہی تھی تاثیر احمد مسکرا دیے۔

''حسینہ! تمہیں صرف اتنی ہی فکر کی اجازت ہے کہ جس میں بس میری ذات آتی ہو۔ باقی کے بارے میں سوچ کر ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تمہارے لیے سب کچھ میں ہوں۔ اچھا؟'' وہ محبت بھری دھونس جماتے ہوئے ایلیسا کا موڈ بحال کر رہا تھا اور وہ بہل گئی تھی۔

☆☆☆

آنکھ کے آپریشن کو دوسرا ہفتہ ہونے کو آیا تھا ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پٹیاں بس جلد ہی کھول دی جائیں گی۔ وہ دنیا کی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی چاہ لیے بے تابی سے منتظر تھی۔ تاثیر احمد دن رات اس کے اردگرد رہنے لگا تھا اور پھر دو دن پہلے ہی ضروری کام کے لیے اسے ملک سے باہر جانا پڑا تو اس نے ڈاکٹرز سے ضد کرنی شروع کر دی کہ اس کی پٹیاں جلد سے جلد کھول دی جائیں تاکہ وہ تاثیر احمد کو سرپرائز دے سکے۔ ڈاکٹرز کو اس نے اپنا حامی کر لیا تھا کہ وہ لوگ فی الحال تاثیر احمد کو اس کے نظر آنے کی نوید نہ سنائیں۔ یہ خبر وہ خود کسی اچھے لمحے میں سنانے کی چاہ رکھتی ہے اور پھر تاثیر احمد کے آنے سے دو دن پہلے ہی اس کی آنکھوں کی پٹیاں کھول دی گئی تھیں۔

کچھ گھنٹے بعد جب وہ مکمل دیکھنے کے قابل ہوئی تو ہر منظر میں کچھ اس قدر نیا پن تھا کہ آنکھوں میں نمی از خود در آئی۔ نرس کے بتانے پر کہ تاثیر احمد اس کے لیے فون چھوڑ گئے تھے کہ جب بھی ان کی پٹی کھلے وہ سب سے پہلے ان کی تصویر اسے دکھائیں اور وہ اپنی خواہش کے اس قدر احترام پر دل سے ممنون نظر آئی۔

وہ ایک سنجیدہ اور انتہائی حسین مشرقی لڑکا تھا بقول ماریا کے جس پر کوئی بھی لڑکی فدا ہو سکتی تھی۔ ایلیسا اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کر رہی تھی۔ اس نے نرس سے اپنی ایک اور خواہش کا اظہار کیا تو نرس نے فون کا فرنٹ کیمرہ کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے تمام نقوش کو چھوتی رہی۔ حسن اگر وہاں تھا تو کمی یہاں بھی کسی شے کی نہیں تھی۔ تاثیر احمد اگر اس پر دل و جان سے مرمٹا تھا تو کچھ غلط نہیں تھا اور یہی سوچ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تو نرس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

وہ اب بس تاثیر احمد کی آمد کی منتظر تھی اور ایک بار پھر مایوس کر کے وہ اس کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے طور پر مختلف اندازے لگاتے ہوئے محظوظ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر مایوسی کی خبر نے تاثیر احمد کے چہرے پر کچھ پل کے لیے تاریک سائے سے لہرائے اور پھر وہ ایلیسا کو اعتماد اور یقین دلوانے میں جت گیا۔ وہ مطمئن سی مسکراتی ہوئی تاثیر احمد کے کاندھے پر سر رکھے شرارت سے مسکراتی رہی۔

''تم بہت تھک گئے ہو گے نا؟ ائیر پورٹ سے سیدھا یہیں آئے ہو؟'' وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ہنکارا۔

''ہمم......''

''ٹھیک ہے تم گھر جا کر آرام کرو۔ شام کو مجھے لینے آ جانا۔'' تھکاوٹ اس کے انداز سے بھی جھلک رہی تھی لیکن وہ اس کے پاس رہنے پر مصر نظر آیا پھر اس کی طبیعت کو بہتر اور کچھ ایلیسا کا اصرار دیکھ کر وہ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ایلیسا جو اس کے جانے کی ہی منتظر تھی نے فوراً

نرس کی مدد سے سامان باندھا اور اس کے ہمراہ ہولی لیکن تاثیر احمد کو ہسپتال ہی کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہیں رک کر اس کی حرکات و سکنات کا اندازہ لگانے لگی۔ وہ بچوں کا وارڈ تھا اور وہاں تمام بچے بستروں پر نظر آرہے تھے۔ وہ کرب سے مسکرادی۔ اسے بچے پسند تھے لیکن اتنے؟ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

وہ شام کو پھر اس کے پاس ہسپتال آیا تو ایلیسا اس کے ہمراہ گھر آ گئی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ تاثیر احمد بہت محبت سے اس کے گرد بازوؤں کا ہالہ بنا کر اسے اندر کی جانب لے کر بڑھا تھا۔ وہ آج اپنے محل کے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تاثیر احمد کے خوب صورت نقوش کو اپنی ترسی ہوئی نگاہ سے چوم رہی تھی۔ وہ اس کے ہر ہر عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور تاثیر احمد ہمیشہ کی طرح لہجے میں محبت سموئے اسے مختلف ہدایات دے رہا تھا جنہیں سننے کی تمنا اب باقی کہاں رہی تھی۔ اب تو وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنی نگاہ میں جکڑ لے، اپنی سماعتوں میں اسے محفوظ کر لے۔

وہ اسے رات کا کھانا کھلاتے ہوئے اپنے عرب امارات کے ٹرپ کا بتا رہا تھا، اگلے ہفتے اسے پھر جانا تھا۔ بہت بڑی ڈیل تھی جو تاثیر احمد کو ہر حال میں حاصل کرنی تھی وہ اس کی باتیں سن کے مسکراتی رہی اس نے بابا کے بعد بڑا نام کما لیا تھا۔ وہ بہت وقت بزنس کو دینے لگا تھا لیکن اسے پھر بھی کبھی شکوہ نہیں ہوا کیونکہ وہ اسے اس کی محبت دوگنا کر کے دیتا رہا تھا۔

تاثیر احمد اس سے باتوں میں جب کہ وہ اسے دیکھنے میں مشغول تھی تب ہی بے آواز قدموں سے ایک نازک سی سیاہ فام لڑکی دروازے پر آئی۔ تاثیر احمد نے مسکرا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہ کوئی ملازمہ تھی اور تاثیر احمد نہیں چاہتے تھے کہ سونے کے لیے لیٹی ایلیسا کسی آواز یا شور سے بیدار ہو۔ ایلیسا کو بستر پر لٹانے کے بعد وہ اسے دوائیاں دے کر اس کی آنکھوں میں قطرے ڈال رہا تھا اور وہ معمول کے مطابق خاموش لیٹی اس کے ہر ہر عمل کو دیکھتی رہی، کسی بھی عمل میں کوئی بیزاری نہیں تھی وہ خاموشی سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

اگلے ہفتے تاثیر احمد کے یورپ جانے کے بعد اس نے نرس کو فون کر کے ایک مدد مانگی تھی اور پھر تاثیر احمد کی واپسی تک وہ باقی نہیں رہی تھی۔ تاثیر احمد کو جیسے ہی خبر ہوئی وہ تمام ضروری امور چھوڑ کر واپس لوٹا تھا اور بیوی کی لاش سے لپٹ کر وہ رویا کہ عزیز و اقارب کی بھی چیخیں نکل گئیں۔

وہ جب تک آیا تھا ایلیسا کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔ اور رپورٹس کے مطابق ایلیسا پول میں گر کر جاں بحق ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ وہیں پڑے پتھروں سے زخمی ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ مزید تائید ملازمہ نے کر دی تھی۔ یوں ایک محبت بھری کہانی کا باب اپنے انجام کو پہنچا۔

☆☆☆

وہ پہلی بار تھا، جب فٹ پاتھ پر لگنے والے اسکول کے لیے چند شہری لوگ انہیں بستی سے جمع کر کے لے کر گئے اور والدین نے بھی پیسوں کے لالچ میں انہیں اسکول روانہ کر دیا تھا۔ وہ بہت دلچسپی سے کتاب میں بنی تصاویر کو دیکھتے ہوئے ان کے متعلق جاننے کی جستجو لیے مکمل دھیان سے استانی کے سکھائے ہوئے سبق پر غور کرنے لگی۔ مٹی سے اٹے کپڑوں۔ میلے ہاتھ پاؤں والے بچے سکھانے والوں کو بغور دیکھتے اور چھٹی کا انتظار کرتے۔ کچھ آدھی چھٹی مانگنے کے لیے دوڑ پڑتے تو ایسے میں وہ کتابوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتی۔ ایک کتاب کو دیکھ دیکھ کر تھک گئی تو نئی تصاویر دیکھنے کی چاہ نے دوسروں کی کتابوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا اور پھر کوئی بھی منظر، کوئی بھی تصویر جو بھی اس کی راہ میں آتی اس کی نگاہ سے محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ جب اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ گئی تو اس کے ہاتھ، فٹ پاتھ پر

پڑا وہ رسالہ لگا جس میں ملک کی نامور مصنفہ کا ایک عدد افسانہ شائع ہوا تھا۔ جس کے بعد اس کی زندگی کا محور اس خاتون کے گرد گھومنے لگا۔

وہ جوان ہوئی تو ''مریم بنت آدم'' کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہوئی۔ ان تحریروں سے اس نے سلیقہ سیکھا۔ زندگی کا قرینہ سیکھا۔ وہ فلسفے میں اس قدر ڈوب گئی کہ زمانے کو ظاہری آنکھ سے دیکھنا ترک کر کے وہ دل کی نگاہ سے لوگوں اور ان کے رویوں کو پرکھنے لگی۔ کنول کیچڑ میں ہو تو ہی سب سے الگ نظر آتا ہے لیکن وہ باطن بدل کر بھی ظاہر سے ہی پہچانی جاتی تھی۔ ہاں اندرونی حالات سے گھبرا کر گھر والوں کی باتوں سے انحراف کرتی تو گالیاں رات گئے تک اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ کہیں بھڑاس نکالنے کی جگہ نہ ملتی تو...... کہانیاں بننا شروع کر دیتی۔

وقت بدلا۔ بستی نے ایک پسماندہ علاقے کا روپ اختیار کیا تو کتابوں کا بھی قریب ہی ایک ٹھیلا لگ گیا۔ جسے لگانے والا کتابیں بیچتا کم اور خود پڑھتا زیادہ تھا۔ اس کی کتابوں سے دوستی دیکھ کر، اس کی گفتگو سن کر ''مریم بنت آدم'' کی ہر ہر تحریر اسے لادی۔

مریم بنت آدم صرف لکھتی نہیں تھی۔ جگر کے لہو سے تحریر رقم کرتی تھی۔ محبت کی وہ، وہ داستانیں رقم کیں کہ گلال کے من میں اس سے ملنے کی چاہ جنم لینے لگی۔ وہ اس قدر مریم بنت آدم سے متاثر ہوئی کہ دل کے تمام تر خیالات ایک صفحے پر لکھ ڈالے اور سب سے چھپا کر اسے زمین میں داب آئی۔ محسوسات لکھ کر یک گونہ سکون ملا تو ذہن میں امڈتی تحریروں نے بھی خود کو لکھوانے کی ٹھان لی۔ ٹھیلے والے بابا سے ذکر کیا تو انہوں نے پہلے بغور گلال کو دیکھا اور پھر مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

پہلی کہانی کچی بستی کی اس لڑکی کی لکھی جو ایک معجزے کے طور پر اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھ گئی تھی۔ جب لفظوں سے پہچان ہوئی تو لوگوں کے لہجوں سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ بغاوت نے سر اٹھایا تو خود کو ہر طور سے قید پایا کیونکہ وہ صرف لکھنا اور پڑھنا جانتی تھی بولنا اس کے بس کی بات کہاں تھی۔

کہانی تین ماہ بعد چھپ کر آئی تو ''گلال آدم'' اپنا نام دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ ٹھیلے والے بابا نے الگ شاباش دی تو خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا کہانی لکھنا اس کا معمول رہا اور باقی امور ٹھیلے والے بابا کی ذمہ داری ہو گئے۔

وہ جتنا لکھتی رات کو ذرا ذرا سی روشنی میں لکھتی۔ کسی کو جاگتا پاتی تو سوتی سی بن جاتی اگلے دن صبح کسی بہانے سے جاتی تو ٹھیلے والے بابا کو صفحے دے آتی۔ پھر اگلا لکھتی اور وہ سب کو جمع کر کے پوسٹ کر آتے۔

جب کہانیوں کو اعزازیہ ملنا شروع ہوا تو ان میں سے ایک نوٹ خود رکھتی اور باقی ٹھیلے والے بابا کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ گھر والوں کو کہتی کہ نوکری کر رہی ہے اور پھر وہ کسی سکون کی جگہ بیٹھ کر کہانیاں پوری کرتی۔ اگلے ماہ اعزازیہ ملتا تو دو تین ہزار گھر والوں کی ہتھیلی پر رکھ کر دو دن محبت کے بول سنتی اور پھر اسی معمول پر آ جاتی۔

کسی کو علم نہیں تھا وہ گلال آدم ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن بیٹھی ہے۔ بڑی بڑی مصنفات اسے سراہنے کو خط لکھا کرتیں۔ اور جو سراہنا نہ جانتی تھیں انہوں نے گلال آدم کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ سراہنے والوں میں مریم بنت آدم کا خط بھی تھا جسے پڑھ کر وہ پھولی نہ سما رہی تھی۔ دس بار پڑھا تو بھی اس کے لفظوں نے اسے نئی ہمت عطا کی۔ وہ کئی کہانیوں کا پلاٹ سوچ کر لکھنے کی نئی ہمت جمع کرنے لگی۔ گھر والوں کی گالیاں ایسے ویسے بھی آج کل بچوں کی سی نادانیاں لگا کرتی تھیں سو وہ سب کو نظر انداز کیے اپنا کام کیے جا رہی تھی۔

اس روز بھی وہ لالٹین کی روشنی میں لکھنے بیٹھی تو ابا کی نظر کی پڑ گئی۔۔۔ وہ آہستہ آواز میں سسکتے ہوئے ایسا کیا لکھ رہی تھی کہ ابا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ سامنے آئے تو اس کا پورا چہرہ تربتر تھا اور وہ حواس باختہ سی ابا کی لہو ٹپکاتی آنکھوں کا سامنا کرنے سے قاصر تھی۔ جس وقت چھاپا پڑا تھا وہ کہانی کا انتہائی اہم سین لکھ رہی تھی۔ اور ابا جو ہر شے سے لاعلم تھے اس کے آنسو اور خوف زدہ چہرہ دیکھ کر بھانپ گئے کہ لڑکی جوانی کی دہلیز پر بیٹھی اگر رو رہی ہے تو کیوں؟

اس کے ہاتھ سے صفحہ چھینے وہ فوراً سے پیشتر پانچ جماعت پڑھے بستی کے دوسرے لڑکے پاس گئے اور واپسی پر اسے لاتوں اور گھونسوں کی زد پر ایسا رکھا کہ نہ ہفتے تک لکھا گیا نہ زمین سے اٹھ پائی۔ باپ سمیت باقی سب جو تھو تھو کر رہے تھے وہ الگ تھا۔

"میری زندگی میں تم سے زیادہ خوب صورت دوسرا کوئی احساس نہیں ہے۔ تمہارا اور تمہاری محبت کا یہ وہ احساس ہے جو رگ و پے میں سرائیت کر کے میری جان پر قرض چڑھائے جا رہا ہے۔ تمہاری محبت دن بدن میری روح پر قابض ہوتی جا رہی ہے اور میں اپنے ارد گرد کے ہر فرد سے بیگانی ہوئے جا رہی ہوں۔۔۔ تمہاری محبت اثاثہ زندگی ہے جس سے کسی طور منہ موڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ محسن تم ایک بار کہہ دو کہ تم میرے ہو۔ تا کہ سکون کا سانس لیا جاسکے۔ تا کہ میں کہہ سکوں کہ میں بھی زندوں میں شمار ہوتی ہوں۔ میں اپنے اردگرد کے مظالم بھول کر تمہارے خواب دیکھوں اور دنیا کو آشیانہ محبت کہہ سکوں۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو گلال نے بے حد درد بھرے دل کے ساتھ عینی کی زبانی اس کے محبوب کو لکھے تھے۔ یہ وہ کہانی تھی جسے وہ مریم بنت آدم کی تحریروں پر خراج کے طور پر پیش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی اسی صفحے کو اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے بکھرے دیکھا تو ہمت جواب دے گئی۔ اسے اپنی ہر تخلیق اولاد کی مانند عزیز تھی اور پھر اس میں تو وہ خود کو لکھ رہی تھی۔ پھر چاہے خواب ہی کیوں نہ بھر رہی ہو لیکن اس تحریر سے وہ خود جڑی ہوئی تھی۔ ان لفظوں میں گلال آدم کی ذات کا مکمل عکس موجود تھا۔

ایک الزام کیا لگا کہ سب نے اسے بوجھ سمجھ کر نئی نویلی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اکثر محلے والے محبوب کا نام پوچھتے تو کسی نے ٹھیلے والے بابا پر گھناؤنا الزام جڑ دیا۔ بابا کو جو بستی سے بدر کیا گیا تو وہ پھر کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑی سسکتی رہی۔ ٹانگ کا زخم ابھی مندمل نہ ہوا تھا کہ جا کر ان کی بابت معلوم کر سکتی اور اب تو گھر سے نکلنا اور قلم تھامنا ویسے ہی سوہانِ روح کی مانند تھا سو وہ خاموش پڑی سب دیکھتی رہی۔ اس روز کے بعد ابا نے اس کا نام تو دور اس کی جانب دیکھنا تک ترک کر دیا تھا۔

یہ وہ لڑکی تھی جو کچی بستی میں اپنے جیسے ہی بدحال گداگروں کے درمیان رہتی تھی۔ بظاہر ان کے جیسی ہوتے ہوئے بھی وہ کسی داستان سرائے کی مضبوط دیوار کی سی تھی لیکن ایک بادِ مخالف نے اسے اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ کھڑی ہونے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ جس روز وہ اٹھ کر دو قدم چلنے کے قابل ہوئی اسی روز ابا نے اس پانچ جماعت پڑھے اندھے فقیر کی اداکاری کرنے والے جواری کے ساتھ اس کا رشتہ پکا کر دیا۔ اعتراض اٹھانے پر منہ پر دو جھانپڑ کھائے اور خاموشی سے اس خبیث کی مکروہ مسکراہٹ کو ہضم کرنے لگی۔

☆☆☆

اگلے روز کا سورج بستی سے کہیں دور طلوع ہوا تھا۔ جہاں زندگی کا رنگ مختلف تھا۔ جہاں قدرت کا حسن ظاہر تھا۔

وہ رات کے دوسرے پہر گھر والوں کے سونے کے بعد اپنے ابا کی پرانی چادر لے کر نکلی تو سیدھی ریلوے اسٹیشن جا پہنچی۔ جمع شدہ پونجی کے استعمال سے چھوٹا سا ٹکٹ لے کر ریل میں سوار ہوئی تو آنکھ ایبٹ آباد کے کسی علاقے میں کھلی۔ یہاں فضا ہی اس قدر حسین تھی، مناظر ہی اس قدر شفاف تھے کہ اسے اپنا آپ میلا، میلا سا نظر آنے لگا۔ وہ قدرتی مناظر کے حسن میں ایسا کھوئی کہ بھوک سے پیٹ

میں اٹھتے مڑوڑ بھی اس کی توجہ ارد گرد نہ ہٹا سکے۔ وہ محبت ولا کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑی۔ مریم بنت آدم کا خط بغل کی جیب سے نکال کر اس کے عین اوپر لکھا پتا پڑھا اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

''سنیں۔ آپ مجھے یہ پتا بتا سکتے ہیں؟''
سامنے سے گزرتے شخص نے اسے بغور دیکھا اور پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس نے اپنے پرانے لباس اور میل میں اٹی ابا کی چادر کو دیکھا تو خود ہی سے شرمندہ ہو گئی۔

اسکول جانے والی چند لڑکیوں سے پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ان کا حسن کس قدر مکمل تھا اور وہ خود؟ ؟ اس کا سانولا ہونا ہی انوکھا تھا۔ وہ یہاں کے ماحول اور لوگوں میں بھلا جچ ہی کہاں رہی تھی۔ مس فٹ ہونا کسے کہتے ہیں وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔

''میرا یہاں جانا بہت ضروری ہے۔'' وہ پتے پر اپنی سیاہی مائل نازک انگلی رکھے انتہائی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ اسے اس پتے کو ڈھونڈنا اتنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اب مایوس ہوا ہی چاہتی تھی۔

''آگے جانا پڑے گا۔'' وہ اسے مزید دور کا اشارہ دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور وہ رک کر سانس لینے کے بجائے پھر آگے کی جانب بڑھ گئی۔ صبح صادق سے لے کر دوپہر دو بجے تک خوار ہونے کے بعد وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچی تو جان میں جان آئی۔

یہ ایک چھوٹا سا دو کمروں کا خوب صورت گھر تھا جو ہر طرف سے درختوں اور خوب صورت پھولوں کی کیاریوں سے سجا ہوا تھا۔ ''محبت ولا'' کی تختی دیوار پر چڑھتے بیل بوٹوں کے درمیان ٹنگی اپنے مکین سے ملاقاتیوں کے لیے راہ دکھاتی ہوئی سی تھی۔ اس نے پھولی ہوئی سانس کو بحال کرتے ہوئے اللہ کا نام لیا اور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ آس پاس دور دور تک گھر نہ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔

''السلام علیکم۔'' وہ اندر سے نکلنے والے نوجوان کو دیکھ کر فوراً سیدھی ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام۔''
میلے کپڑوں کی وجہ سے ہچکچاہٹ چھپاتی وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

دروازے سے نکلنے والا نوجوان اسے لبوں پر قفل لگائے کھڑے دیکھ کر گویا ہوا۔

''جی کیا چاہیے؟'' حلیے سے وہ اسے کسی بدحال فقیر سی لگ رہی تھی لیکن یہاں رہائشی علاقوں سے اتنی دور کوئی مانگنے کب آتا تھا؟

''مجھے مریم بنت آدم سے ملنا ہے۔'' وہ ہچکچاہٹ چھپاتے ہوئے اپنے گرد بازوؤں کو سختی سے لپیٹتی گویا ہوئی تھی۔

''آپ کا نام؟'' وہ اپنی حیرانی کو چھپائے گلال سے مخاطب تھا۔

''گلال آدم۔''

''رکیں۔'' وہ چند ثانیے کے لیے اسے وہیں چھوڑ کر اندر کی جانب بڑھا تو ابا کی چادر لپیٹ کر ہاتھ میں پکڑی اور کپڑوں کی سلوٹیں ہاتھ سے ٹھیک کرنے لگی۔ قدموں کی آواز پر سیدھی ہو کھڑی ہوئی۔

''آجائیں اندر۔'' وہ اس کے لیے جگہ چھوڑتا ہوا ایک طرف ہوا تو گلال آدم بھی لرزتے قدموں کے ساتھ اس کی ہمراہی میں اندر کی جانب بڑھنے لگی۔

☆☆☆

گلال آدم کو کمرے میں بٹھا کر وہ نوجوان اسے جوس پیش کر کے جا چکا تھا۔ مریم بنت آدم کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد آپ سے ملاقات کریں گی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اپنے ارد گرد نظر دوڑانے لگی۔

یہ ایک خوب صورت کمرہ تھا جس میں کمرے کے تینوں طرف صوفوں کا خوب صورت سیٹ تھا فرش پر بچھا قالین اپنے قیمتی ہونے کی خود گواہی دے رہا تھا۔ درمیانی کانچ کی میز پر پڑا گلدان اس کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے کو کافی تھا۔ کمرے

میں ایک طرف موجود ٹیبل پر رکھی تصاویر ایک بہت خوب صورت نوجوان کی تھی۔ گلال آدم دم بخود اس حسن کے شاہکار کو دیکھے گئی۔ ماتھے پر پڑے بال، خوب صورت چمک دار آنکھیں۔ وہ یقینی طور پر بہت خوب صورت نوجوان تھا لیکن کچھ دیر پہلے والے شخص سے اس کی صورت نہ ملتی تھی۔ یقیناً ان دونوں میں کوئی رشتہ نہیں تھا یہ گلال آدم کا پہلا اندازہ تھا۔ وہ مسلسل اس تصویر پر نگاہیں جمائے کچھ سوچنے میں غرق تھی تبھی دروازہ کھلا اور ایک پچاس کے ہندسے کو عبور کرتی ایک خوبصورت وخوبرو خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ چہرے پر مسکراہٹ اس قدر دوستانہ تھی کہ گلال آدم کے دل میں بیٹھے تمام خوف از خود اڑ گئے۔ وہ گلال آدم سے اس محبت سے ملیں کہ گلال آدم کا روم روم محبت سے بھیگ گیا۔ انہوں نے گلال آدم کے ظاہری حلیے پر سوال کرنے کے بجائے اس کے اندر کو سراہتے ہوئے بہت محبت سے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔

''بہت خوب صورت ہو بالکل اپنی تحاریر کی طرح۔'' اس گلابی رنگت والی عورت سے اپنی تعریف سن کر وہ جھینپ گئی تھی۔ وہ یقیناً اتنی خوب صورت نہیں تھی لیکن دیکھنے والی آنکھ کا حسنِ نظر کہیں زیادہ تھا۔

''بہت اچھا لکھتی ہو۔ میں نئے لکھنے والوں میں تم سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ جب میں نے نیا نیا اردو ادب پڑھنا شروع کیا تھا تو مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اردو ادب بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن میں نے یہاں کے ادب کو پڑھا تو پھر میں نے جانا کہ یہاں کیا کیا شاہکار تخلیق ہو چکے ہیں اور سچ بتاؤں تو تیمور خان کی والدہ سے میں نے بہت مدد لی ورنہ میں بھی کہاں لکھ سکتی تھی۔ اللہ جنت نصیب کریں انہیں، ادب سے بڑا شغف تھا۔'' وہ کسی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

گلال آدم نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ بس اپنے لمس سے ساتھ ہونے کا احساس دلوا سکتی تھی، اسے لفظوں کے پھاہے رکھنا نہیں آتا تھا۔ وہ ایک بالکل الگ معاشرے میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی تھی۔ اس کے انداز واطوار مختلف تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔

''اچھا یہ سب باتیں پھر کبھی کریں گے۔ تم ذرا کپڑے تبدیل کر لو۔ میں نے تیمور خان سے کپڑے منگوائے ہیں، اس کی بہن بھی تمہاری ہی ہم عمر ہے۔ جاؤ پہن لو شاباش۔'' وہ اسے ہدایت دیتے ہوئے خود کمرے سے باہر نکل گئیں۔

گلال آدم نے آسودگی بھرا سانس لے کر مریم بنت آدم کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اتنی جلدی انہوں نے اس پر بھروسا کر لیا تھا، کوئی ایسا بھی ہوتا ہے؟ کہ صرف آپ کے نام سے واقف ہو اور پھر پہلی ہی ملاقات میں عنایات کی بارش کر دے؟ نہیں یہ بس مریم بنت آدم کا ہی شیوا تھا۔ وہ محبت لکھتی ہی نہیں محبت بانٹنے کی بھی عادی تھیں۔

☆☆☆

گلال آدم، مریم بنت آدم کو اپنے حالات سے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ واپس جانے والی تمام راہیں بند کر آئی تھی۔ مریم بنت آدم کے علم میں تمام باتیں آ گئی تھیں اور سب جاننے کے بعد گلال آدم کو مریم بنت آدم نے اپنے سینے میں جگہ دی تھی۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کو اپنے تمام رازوں سے آگاہی دیتی رہتی تھیں۔

گلال آدم نے بتایا تھا کہ وہ بچپن سے اسے پڑ۔ نے ‌ر شوقین تھی۔ جہاں بھی مریم بنت آدم کا نام نظر آتا وہ اس تحریر کے ہر ہر لفظ کو خود میں اتار لیتی۔ اس نے لکھنا سیکھا تھا تو مریم بنت آدم کو پڑھ کر لکھنا سیکھا تھا۔ اس نے احساسات کو بیان کرنے کا فن جانا تھا تو بھی مریم بنت آدم ہی وجہ تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ گلال آدم نے اپنا نام بھی اسی کے نام کی نسبت سے رکھا تھا۔ وہ کسی کی نہیں آدم کی اولاد کہلوانا چاہتی تھی۔ گلال آدم نے اسے اپنی زندگی کے ہر راز سے آشنائی دے دی تھی اور مریم بنت آدم نے بھی گلال کو بہت محبت سے سنبھالا تھا۔ گلال اگر واپس مڑ

کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی تو وجہ مریم بنت آدم کی محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔

☆☆☆

''بنت آدم آپ بتائیے نا کہ آپ کے پاس کوئی کیوں نہیں ہے؟'' وہ ڈرتے ہوئے سوال کر رہی تھی اور اپنے عین سامنے لیٹی مریم بنت آدم کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو سانس کو ساکت کیے لیٹی رہی۔

وہ دونوں اب ایک ہی کمرے کی مکین تھیں۔ ہر چیز دونوں کی مشترکہ ہو گئی تھی۔ دونوں میں کچھ بھی الگ الگ نہیں تھا لیکن ابھی بھی اگر کچھ الگ تھا وہ مریم بنت آدم کی زندگی کے وہ گہرے راز تھے جن سے ابھی تک پردہ نہیں اٹھا تھا۔

''اللہ کی رضا ہوتی ہے کچھ لوگوں کو تنہا کرنے کے لیے۔'' وہ گلال کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار کے نیچے دبائے آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی تنہائی کا مداوا بن گئی تھیں لیکن گلال کے دل میں کسک موجود تھی۔ وہ اس ماں جیسی عورت کے لیے دل میں بے تحاشا محبت محسوس کرنے کے سفر میں اس کے غموں کا مداوا بھی کرنے کی چاہ رکھتی تھی۔

''پھر بھی کچھ تو بتائیں نا۔'' وہ بضد تھی، مریم بنت آدم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیمپ کی روشنی کو گل کرنے کے بعد انرجی سیور روشن کیا اور پھر اسے لے کر بیٹھ گئیں۔

''چلو واک پر چلتے ہیں۔'' گلال آدم بنا چوں چراں کیے اس کے ہمراہ ہو لی۔ پیروں میں چپل اڑس کر وہ دونوں دروازے سے باہر نکلیں تو ہوا کے خوشگوار جھونکے نے دونوں کا استقبال کیا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی شال اپنے گرد لپیٹ کر سرد ہوا کی لذت محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کی ہم قدم ہو لیں۔

''کبھی محبت ہوئی گلال آدم کو؟'' وہ چاند کو تکتی آگے کا سفر طے کر رہی تھیں گلال آدم ہنس دی۔

''نہیں!'' مختصر ترین جواب تھا۔

''پھر احساسات اتنے مضبوط کیسے لکھ لیتی ہو؟'' پھر سوال ہوا تھا۔

''محسوس کرنے کو درد بہت تھے بنت آدم۔ محبت کرنے کے لیے لازم ہے کہ محبوب من پسند ہو اور من پسند شخص مجھے جھگیوں میں کہیں نہیں ملا۔ محبت بہت مقدس شے ہے۔''

''محبت واقعی بہت مقدس شے ہے۔ اتنی کہ اس کے لیے زندگی ہاری جا سکتی ہے۔ قیمتی ترین اشیاء کو ٹھوکر ماری جا سکتی ہے۔ اچھا ہے تمہیں محبت نہیں ہوئی کیونکہ محبت تنہا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ محبت آپ کو برباد کرنے کے ہر فن سے آشنا ہوتی ہے۔ تم جاننا چاہتی تو تم اتنا جان لو کہ محبت کو زندگی بخش آئی ہوں، اس کی خوشیوں کی پرواز کے لیے آسمان صاف کر آئی ہوں اور آئی بھی ہوں تو اسی کے کوچے میں آئی ہوں۔ یہ اس کا ملک ہے اور اسے چھوڑنے کے بعد اس کے وطن کے آغوش میں جان دینے کی خواہش مجھے یہاں کھینچ لائی اور پھر یہاں آئی تو پھر بس یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ تیمور کی والدہ میرا سہارا بنیں، دکھ سکھ کی ساتھی اور ان ہی کی بدولت میں نے یہاں آ کر محمد ﷺ کے خدا کو تلاشا، یہاں آ کر میں نے خود کو نئے سرے سے ڈھونڈا، یہ لوگ جو مجھے محبت کی لکھاری کا لقب دیتے ہیں یہ بہت اذیت ناک لقب ہے میرے لیے کہ میں نے جی جان سے خود کو گنوایا ہے اور تب کہیں جا کر یہاں پہنچی ہوں۔ میں چاہے لاکھ محبت کی شدتیں لکھنے پر عبور رکھتی ہوں لیکن لفظ محبت میری جان ہلا کر رکھ دیتا ہے، اس بارے میں بات کرنا آسان نہیں ہے۔'' وہ لرزتے لہجے میں کہتے ہوئے ایلیسا سے مریم بنت آدم کی کہانی سناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں گلال آدم ان کے ہم قدم ہونے کی جستجو میں ہلکان ہوتی نظر آئی۔

''کیا آپ نے بہت محبت کی تھی؟''

''میں نے عشق کیا تھا اور اسی عشق کی خاطر خود

جذبات واحساسات کو قربان کردیا۔"
"کیا آپ کی محبت نے بے وفائی کی؟"
"نہیں! وہ سب اس کا حق تھا۔"
"آپ کی محبت کو آپ سے محبت نہیں تھی؟"
"بہت محبت تھی شاید۔"
"تو پھر انہوں نے آپ کو آنے کیسے دیا؟"
"ان کے علم میں کچھ نہیں تھا۔"
"بہت الجھی ہوئی کہانی ہے۔"
"کہانیاں سلجھی ہوئی ہوتی ہیں یا اختتام تک آ کر سلجھ جاتی ہیں یہ حقیقت ہے میری جان۔"
"آہ!" یہ بڑے لکھاری یونہی نام نہیں کما لیتے انہیں ہر طور مرنا پڑتا ہے یہ گلال آدم جانتی تھی۔

☆☆☆

گلال آدم اپنی زندگی کے اگلے چار سال مریم بنت آدم کی سنگت میں گزارنے کے بعد ان کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ گلال آدم اپنی ایک مضبوط پہچان بنا چلی تھی۔ لوگ رسائل اس کا نام دیکھ کر خریدنے لگے تھے۔ وہ راہ زیست کے ایسے رازوں سے پردہ اٹھاتی تھی کہ پڑھنے والے دم بخود رہ جاتے اور سہنے والے زخموں سے کھرنڈ اترتا ہوا محسوس کرتے۔

مریم بنت آدم اپنا راز گلال آدم کو دینے کے بعد کمزور تر ہوگئی تھیں۔ جن چیزوں کو پردے میں رکھنے کی غرض سے وہ خود مضبوط ظاہر کیا کرتی تھیں وہ اب گلال آدم کی امانت تھے اور سنبھالنے کو اب کچھ باقی نہ رہا تھا تو قلم سے رشتہ توڑنے کے بعد مکمل طور پر خدا سے رشتہ جوڑ لیا۔

گلال آدم اگلے ہفتے سوڈان جانے کی تیاریاں کر رہی تھی، اور مریم بنت آدم اسے تمام تر معلومات فراہم کرنے کے بعد آئے روز اسے خیال رکھنے کی تاکید کرتی نظر آتیں۔

"گلال میں کہتی ہوں نہ جاؤ۔" وہ پیکنگ میں مصروف تھی تبھی مریم بنت آدم نے پرانی بات دہرائی

"اونٹ وری۔ میں آپ کے سارے پیسے نہیں لگاؤں گی۔" وہ پر مزاح لہجے میں کہتی بنت آدم کو تسلی دے رہی تھی۔

"یہ لازمی نہیں ہے۔" وہ دل کڑا کر کے کہہ رہی تھیں۔

وہ چاہتی تھیں کہ جو راز برسوں سے دبا ہے وہ دبا رہے، جو سہنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ گلال آدم وہی ایک نام ان کے گوش گزارے کیونکہ یہ تو پھر ان کی زندگی کے تابوت پر آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن وہ کسی کمزور لمحے میں گلال آدم سے اس بات کا ذکر کر چکی تھیں اور گلال آدم نے جانے کی ٹھان لی تھی تو وہ اب کسی کی نہیں سن رہی تھی یہاں تک کہ تیمور خان کو بھی چپ کروا دیا تھا۔ ورنہ وہ کس قدر ڈرتی تھی تیمور خان سے۔

"لیکن میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیسے لوگ ہیں جو محبت کرنے والی روحوں کو زخمی کر کے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"

"ایسے لوگ کسی ایک خطے پر مخصوص نہیں ہوتے، نفس کے ہاتھوں مجبور اشخاص اپنی خواہشات کے حصول میں درندے بن جاتے ہیں۔"

"میں انہی درندوں کی شکلیں دیکھنے کے لیے روس جانا چاہتی ہوں۔"

"میری محبت کو درندہ مت کہو۔" کچھ کرب سے اور کچھ گلال آدم کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی خواہش میں وہ اپنی محبت کا دفاع کرنے لگی تھیں۔ گلال آدم کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آپ بس ایک وعدہ کریں میری واپسی تک اپنا بہت خیال رکھیں گی اور اگر تیمور خان آجاتے ہیں تو انہیں کہیں نہیں جانے دیں گی۔ تب تک میں واپس نہ لوٹوں۔ ٹھیک ہے؟"

مریم بنت آدم چہرے پر شفیق سی مسکان لیے گلال آدم سے عہد کرتے ہوئے اسے مطمئن کرنے لگی تھیں۔ وہ پر سکون سی ہو کر مسکرا دی۔

☆☆☆

''یعنی کہ برسوں کا شک درست تھا، میں نے بیس سال دوست نہیں آستین میں سانپ پالا تھا۔'' تمام تر تفصیلات لینے کے بعد بس ایک جملہ ہی تو کہا تھا انہوں نے اور پھر تمام تر آواز سکوت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

گلال آدم کی نگاہ کے سامنے یکدم پوری دنیا گھوم گئی۔ ایسا ہی تو ہوتا آیا تھا وہ خاموش ہوتی تھیں تو پورا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، زندگی یکدم ہی تو کس قدر خاموش اور بے حس سی لگنے لگتی تھی۔ وہ اگر کسی کی وجہ سے مسکراتی تھی تو وہ وہی تو تھیں کہ جن کے دم سے وہ اب بھی آباد تھی۔

گلال آدم نے آنکھوں میں آجانے والی نمی کو اسکارف سے پونچھتے ہوئے تیمور خان کا نمبر ملاتے ہوئے فون کان سے لگالیا۔ لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ پاکستان واپسی پر اس سے کوئی اچھی خبر سن سکتی ہے۔ لمحوں میں وہ صدیوں کی سی تھکن اپنے جسم میں اترتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

تحریر کے اختتام تک آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اور یہ کوئی پہلی بار تو نہیں تھا۔ مریم بنت آدم کے انتقال کے بعد وہ جب جب اس ناول کو لکھنے بیٹھی تھی، اس کی باریکیوں کو سوچنے لگتی تھی وہ یونہی آنسو بہائے جاتی تھی۔

''تیمور۔ کیا کبھی دونوں نے بنت آدم کی موت کی وجہ جاننی نہیں چاہی ہوگی؟ اور پھر ان کی آنکھیں واپس آجانے کا راز بھی راز ہی رہ گیا ہوگا؟''

''بنت آدم نے کیا کچھ نہیں سہا ہوگا......'' اور وہ پھر ہچکیوں سے رونے لگتی۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ وہ صبح ہی ڈیوٹی سے واپس لوٹا تھا تمام دن سب ٹھیک رہا اور پھر وہ ناول لے کر بیٹھی تو پھر اسی ایک کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔

''کوئی اتنی محبت کیسے کر سکتا ہے تیمور؟ کیسے اپنا سب چھوڑ کر آ سکتا ہے؟ وہ بھی ایک دھوکے باز شخص کے لیے؟'' نوری آدم نے تیمور خان کی کروٹ کی آواز سن کر آہستگی سے کہا تو لب آپس میں بھینچتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رائٹنگ ٹیبل پر دھرا نوری آدم کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر باہر نکل گئے۔

''یہ سوز عشق کی داستان ہے آپ کو سمجھ نہیں آئے گا۔ ہم جیسے عاشقوں سے پوچھیں جو پچھلے پانچ برس سے آپ کی چاہ لیے آپ کی راہ میں پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں اور آپ ہیں کہ تمام حقوق ہمارے نام کرنے کے بعد بھی خود کو لاحاصل ہی رکھا ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں اپنے ناول میں ذرا سی جگہ دے کر ہر شے کا مداوا کر دیا آپ نے؟'' وہ جانتے تھے کہ نوری آدم کو اس کیفیت سے کیسے باہر نکالنا ہے سو وہ بھرپور اداکاری کر رہے تھے۔

نوری آدم نے ہاتھ تھام کر چلتے مجازی خدا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ یہ بنت آدم کا آخری اور سب سے حسین تحفہ ہی تو تھے جو وہ اسے دے گئی تھیں۔

''کیا بہت تکلیف ہوتی ہے؟'' ایک ٹیس سی نوری آدم کے سینے سے اٹھی تھی اس نے واقعی اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی لیکن وہ اس کے صبر کو آزمانا چاہتی تھی۔

''بہت......'' تیمور خان نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھرپور درد برداشت کرنے کی اداکاری کی تو نوری آدم نے منہ بسور کر اسے دیکھا۔ تیمور خان چوری پکڑے جانے پر قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے روٹھ کر جاتی نوری آدم کے پیچھے ہو لیے۔

''سنیے تو......''

''کہتے رہیے۔''

''اچھا سوری نا۔''

''بھاڑ میں جائیں۔''

''اکیلا......؟''

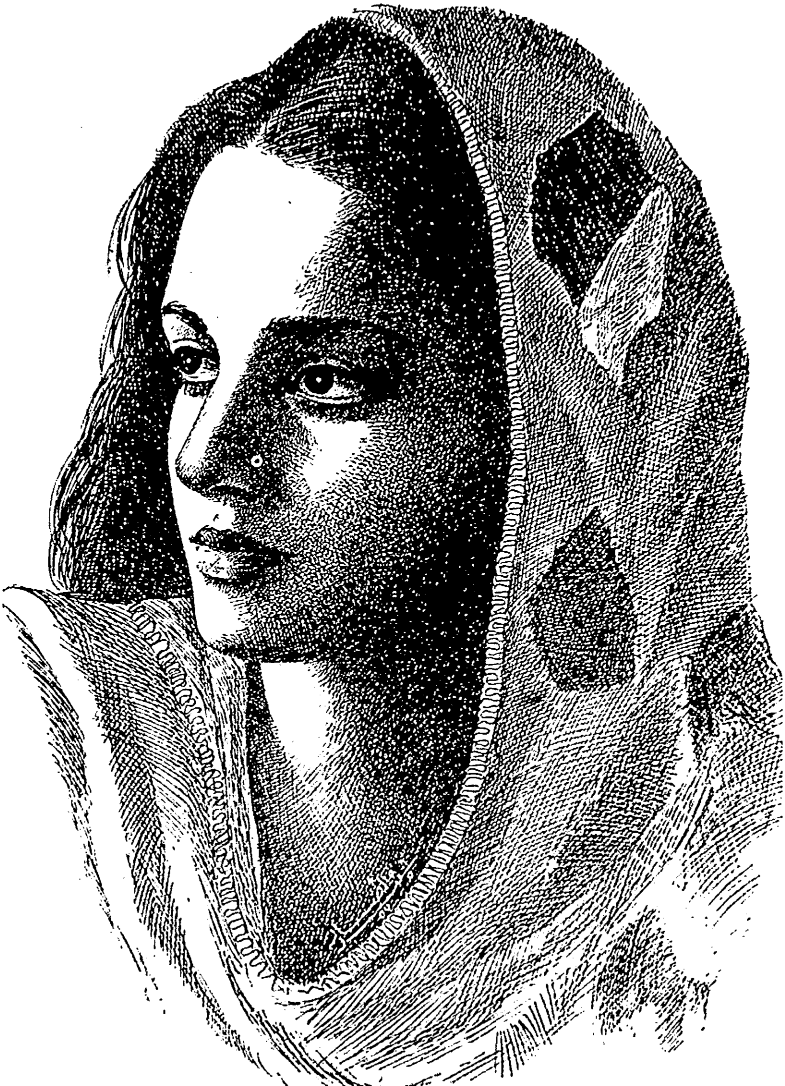
''جی۔ اکیلے۔''

''جی اچھا۔'' وہ چہرے پر اداسی کے تاثرات سجائے واپس مڑے تو نوری آدم نے قہر برساتی نگاہ سے تیمور خان کو دیکھا جو اس ایک نگاہ کے بعد سیدھے نوری آدم کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔

☆☆

مزمل سلیم

کسک



ایف ایس سی میں میرے اتنے زیادہ نمبر تھے کہ پورے فیصل آباد میں کسی گورنمنٹ کالج یا یونیورسٹی کو مجھے میرٹ پر داخلہ دینے کا اعزاز حاصل نہ ہوا۔ اس لیے میں نے آرام سکون سے دو سال ضائع کیے۔ تیسرے سال اس نکمے پن سے تنگ آ کر میں نے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی ایرڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

پہلے روز صبح سویرے اٹھ کر یونیورسٹی جاتے ہوئے میں بہت پرجوش تھا۔ ناولوں میں پڑھے گئے قصے، فلموں میں دکھائے مناظر سب ذہن میں تازہ تھے۔ اس لیے یونیورسٹی میرے لیے کسی خواب کی تعبیر سے کم نہیں تھی۔ بس سے اتر کر یونیورسٹی کی طرف سفر کرتے ہوئے پل بھر کے لیے میں نے خود کو یارم والی امرحہ محسوس کیا۔ بیگ جو کمر سے لٹکا ہوا تھا، اتار کر ہاتھ میں لیا اور ہوا میں لہرا کر زور سے چیخا۔

''ساہیوال...... میں آ گئی...... سس...... سوری آ گیا۔''

خود کو امرحہ محسوس کرتے ہوئے میں نے دو چیزوں کو فراموش کر دیا تھا، نمبر ایک جنس اور نمبر دو۔ میرے پیچھے کھڑی وہ آنٹی جو اتنی صبح سویرے سبزی لے کر واپس آ رہی تھیں۔ میرے بیگ کے شاندار وار سے ان کی سبزی والی ٹوکری ان کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر گر گئی اور اس میں موجود کئی سبزیاں سڑک پر پھیل کر احتجاج کرنے لگیں۔ ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد آنٹی نے پہلا وار میرے منہ پر کیا جس سے میں ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اب بھاگنے کا وقت تھا مگر میری عقل جواب دے گئی۔ میں نے بیگ کو زمین پر رکھا۔

''سوری آنٹی۔ خیال نہیں رہا۔'' میں انہیں سبزی اکٹھی کرنے میں مدد کرنے والا تھا مگر ان کے منہ سے حیرت بھری آواز سن کر مجھے اس روشن صبح میں کی گئی تیسری غلطی کا احساس ہوا۔

''آنٹی...... تجھے آنٹی لگتی ہوں؟'' اس کے بعد میرا وہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔

آنٹی شاید خود کو شردھا کپور اور مجھے عاشقی ٹو والا آر جے سمجھ رہی تھیں لیکن میں نے ان کے خیالات کو حقیقت کی شکل دینے کے بجائے ایک ہاتھ سے بیگ اٹھایا، دوسرے ہاتھ سے اپنا گریبان ان کی گرفت سے آزاد کروایا اور دوڑ لگا دی۔ پیچھے سے ''بھاگو...... پکڑو'' کی آوازیں سنائی دیں مگر میں دشمن کی قید سے فرار ہونے والے سپاہی کی طرح سرحد عبور کرتا ہوا یونیورسٹی کی طرف جاتی سڑک پر مڑ گیا۔

یونیورسٹی میں داخل ہو کر میں نے نوٹس بورڈ پر نگاہ دوڑائی جہاں پہلے سمسٹر والوں کے لیے کمرا نمبر آٹھ لکھا گیا تھا۔ میں صبح صبح ہوئی بے عزتی بھول کر آرام سکون سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک میڈم نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں پڑھنے نہیں بلکہ لڑکیاں چھیڑنے آیا ہوں۔ کچھ میرا لباس ہی ایسا تھا کہ میں یونیورسٹی طالب علم کے بجائے کسی گاؤں کا بگڑا جاگیردار لگ رہا تھا۔

''پہلا سمسٹر؟'' میڈم نے ایکسرے کرتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی میم۔''

''آپ لیٹ کیوں آئے ہیں؟''

''میم پہلا دن تھا اس لیے وقت کا علم نہیں تھا۔'' میرے پاس دیر سے آنے کا اس سے بہتر جواز کوئی نہیں تھا۔

''جی، پہلے دن ہماری یونیورسٹی رات نو بجے کے بعد شروع ہوتی ہے۔'' یہ طنز تھا جو مجھے سمجھ میں نہ آیا۔

''ٹھیک ہے میم۔ آئندہ رات نو سے پہلے آ جاؤں گا۔'' میں نے فرمانبرداری سے سر جھکایا۔

''شٹ اپ۔ آئندہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کلاس ہوتی ہے، بیٹھ جاؤ۔''

میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کلاس روم میں خاموشی تھی۔ پہلے دن میرے علاوہ تقریباً سب عزت سے بیٹھے تھے۔

''اپنا تعارف کرواؤ۔'' میم کی طرف سے حکم آیا۔

''میرا نام اعتزاز احسن ہے اور میں......''

''وکیل ہوں۔'' پیچھے سے آواز آئی۔ کلاس میں قہقہہ گونجا۔

"میں فیصل آباد سے ہوں، میں نے ایف ایس سی دو سال پہلے کی تھی۔اس کے بعد یہاں داخلہ لے لیا۔"

"دو سال کیوں ضائع کیے؟" میم کے پوچھنے پر میں نے کچھ سوچا۔سچ بولنے میں ہی بھلائی تھی۔

"میم نمبر اتنے تھے۔کسی نے داخلہ ہی نہیں دیا۔" اس بار گونجنے والا قہقہہ زیادہ بلند تھا۔میم مسکرائیں تک نہیں۔انہوں نے غصے سے مجھے گھورا۔

"یہ تو پھر ہماری یونیورسٹی کی بے عزتی ہے جو تم جیسے طالب علم کو داخلہ دے دیا۔"

"نہیں میم۔یہ تو ایرڈ یونیورسٹی ساہیوال کے لیے اعزاز کی بات ہے۔آج سے کئی سال بعد جب مجھ پر مضمون لکھا جائے گا تو دوسری لائن میں لکھیں گے،اس کے بعد آپ اعلا تعلیم کے لیے ایرڈ یونیورسٹی ساہیوال چلے گئے۔"

"کیوں،ایسا کیا کارنامہ دکھانا ہے تم نے؟"

"میم میں لکھاری ہوں۔مختلف ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"اوہ۔یعنی نئی نسل کو خراب کرنے والوں میں تم بھی شامل ہو۔آئندہ میری کلاس میں تم نے سب سے آخر میں بیٹھنا ہے۔اگلی کسی کرسی پر تم دکھائی دیے تو میں تمہیں کلاس سے باہر نکال دوں گی۔" میں نے سعادت مندی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئیں۔پہلے دن ہی کلاس میں ہنسی مذاق کرنے کی وجہ سے میری سب لڑکوں سے اچھی دوستی ہوگئی۔پہلی کلاس کے بعد ہمیں ویلکم کیا گیا۔ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کی تقریر سنی۔اور پھر میری اس کہانی کا ایک کردار سامنے آیا۔میم عالیہ ظفر۔۔

☆☆☆

"کلاس۔آپ میں سے کوئی ان پیج کمپوزنگ کے متعلق جانتا ہے کچھ...... کسی کی اسپیڈ اچھی ہو کمپوزنگ کی؟" میم عالیہ ظفر کا کام ہمیں انگلش پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہماری کمیونیکیشن اسکلز پر کام کرنا تھا۔اس لیے وہ مختلف طریقوں سے ہم سے کام لیتی رہتی تھیں۔اس طرح ہمیں کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربات بھی حاصل ہوتے۔عالیہ میم مجھے بہت پسند تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بھی میری طرح لکھاری تھیں اس کے علاوہ وہ شاعری بھی کر لیتی تھیں۔

"جی میم۔میں جانتا ہوں۔" میں نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"لیکچر کے بعد مجھے میرے روم میں ملنا۔کچھ ضروری کام ہے۔" انہوں نے کہا۔میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لیکچر کے بعد پندرہ منٹ کی بریک ہوئی تو میں ان کی روم کی طرف بڑھ گیا۔مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے انہوں نے لیپ ٹاپ کھولا۔

"کتنی اسپیڈ ہے تمہاری اعتزاز؟"

"کچھ اندازہ نہیں میم۔لیکن جتنی ایک پروفیشنل کی ہوسکتی ہے اتنی اسپیڈ سے ٹائپ کرسکتا ہوں۔"

"گڈ۔" انہوں نے سر ہلایا۔"میری ایک دوست ہے اسے اپنی کتاب کمپوز کروانی ہے۔شاعری کی،اگر تم کرسکو تو......" انہوں نے مجھے میل، دکھائی۔"یہ کل اس نے کچھ نمونے دیے تھے۔اس طرح کمپوز کروانا چاہتی ہیں،کرلو گے؟"

"جی میم۔کرلوں گا۔"

"پیسے اچھے دے رہی ہے وہ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"ایک ماہ کا وقت ہے۔کل تمہیں اسی کی آواز میں دے دوں گی ساری شاعری،یو ایس بی لے آنا اپنے ساتھ۔زیادہ مناسب یہی ہے کہ جو یونیورسٹی میں فارغ وقت ملے اس میں اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا۔میرا یہ کمرا خالی ہی ہوتا ہے یہاں آکر کمپوز کر لینا۔اب تم جاسکتے ہو۔"

"شکریہ۔" میں یہی کہہ کر مڑا اور پھر واپس ان کی طرف آیا۔"میم۔ایک سوال ہے۔"

"دو پوچھو۔" وہ مسکرائیں۔

"نہیں۔ایک ہی ہے۔آپ نے اپنا لکھا شائع کیوں نہیں کروایا؟ صرف پی ڈی ایف میں ہے، باقاعدہ کتابی شکل میں کچھ بھی نہیں۔" ان کے

چہرے پر پل بھر کے لیے افسردگی دکھائی دی۔
''کچھ وجوہات ہیں بچے۔ بتاؤں گی تمہیں۔ پھر کبھی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
واپس اپنے شہر کی طرف جاتے ہوئے میں میم عالیہ ظفر کا چہرہ اپنے تصور میں لے آیا۔ وہ ایک مکمل شخصیت تھیں مگر کہیں نہ کہیں۔ کچھ نہ کچھ ادھورا پن تھا۔ نجانے کیوں۔

☆☆☆

میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس نامعلوم شاعرہ کا کلام کمپوز کرنا شروع کر دیا۔ کسی اور کا لکھا کمپوز کرنا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے اپنی جوئیں چھوڑ کر کسی اور کے سر میں خارش کرنا مگر یہاں میں نے کام ذمے لے لیا تھا۔ مدھم آواز میں ایک شعر سن کر میں اسے کمپوز کرتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ کوئی دو تین غزلیں کمپوز کرنے کے بعد میں نے سر اٹھایا۔ میم کمرے میں آچکی تھیں۔
''خوب۔ دل لگا کر کام کرتے ہو تم۔'' انہوں نے تعریف کی۔ ''خود کیا لکھ رہے ہو آج کل؟''
''کچھ آرٹیکل ہیں ان پر کام کر رہا ہوں۔''
''وری گڈ، میری زندگی پر لکھو آرٹیکل۔''
میں ہنس پڑا۔
''ہنس کیوں رہے ہو؟''
''میم۔ وہ ان مشہور شخصیات پر ہے جو مر چکے ہیں۔'' وہ مسکرادیں۔
''اچھا یعنی تمہارے مضمون کے لیے میرا مرنا ضروری ہے۔'' انہوں نے کہا پھر گہری سانس لے کر بولیں۔
''ان پر بھی کبھی کچھ لکھنا جو حقیقت میں زندہ ہیں لیکن اندر سے مر چکے ہیں۔''
ان کی بات سن کر میں خاموش ہو گیا۔ جتنی مرضی بے تکلفی سہی لیکن حقیقت میں ایک لیکچرر اور طالب علم کے درمیان جو جھجک ہونی چاہیے تھی، وہ ہمارے درمیان بھی تھی۔ کلاس میں ان سے ہنسی مذاق کر لیتا مگر یہاں میں کچھ الٹا سیدھا بول کر ان کی نظروں میں اپنی عزت کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے سر ہٹایا تو ان کے میز پر کافی سارے ڈاکومنٹس پڑے تھے۔
''یہ کیا ہیں میم؟''
''کچھ تعلیمی اسناد اور سرٹیفکیٹ وغیرہ ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ میں دیکھتا رہا۔ انہوں نے میری دلچسپی محسوس کرتے ہوئے وہ سب چیزیں مجھے دکھائیں۔
''میرے ابو کو بہت شوق تھا کہ بیٹا ہو مگر جب میں پیدا ہوئی تو وہ پھر بھی مایوس نہ ہوئے۔ انہوں نے مجھے میرا ہر شوق پورا کرنے کی پوری آزادی دی۔ یہ دیکھو۔ کالج میں میں کرکٹ ٹیم کی کپتان تھی، فٹبال میں بھی حصہ لیا اور تقریری مقابلے کی ونر بھی۔ یونیورسٹی میں بیت بازی کے مقابلے کی ونر، ہماری ٹیم نے ٹی وی چینل پر ہونے والی بیت بازی میں بھی دوسری پوزیشن لی تھی۔ پڑھائی سے ہٹ کر بھی میں نے بہت کچھ کیا۔''
''میں نے آپ کی کچھ کہانیاں پڑھی تھیں پی ڈی ایف میں۔'' میں نے انہیں بتایا۔
''کیسی لگیں؟'' اپنی اسناد اور سرٹیفکیٹ دوبارہ دراز میں رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
''ادھوری۔'' میں نے سچائی پر مشتمل جواب دیا۔ ''کچھ نامکمل تھا ان میں میم، ہر کہانی انجام پر پہنچ کر بھی تشنگی کا احساس چھوڑ جاتی تھی۔'' وہ مسکرادیں۔
''مجھے امید تھی کہ تعریفی جواب ملے گا مگر تم پہلے طالب علم ہو جو میری کہانیوں کی گہرائی تک پہنچے ہو ورنہ اکثر صرف اس لیے پڑھتے ہیں کہ وہ میں نے لکھی ہیں اس کے علاوہ انہیں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔'' کام کے ساتھ ساتھ ہماری گفتگو بھی جاری تھی۔ ''اصل میں اعتراز بچے۔ ہر کہانی ادھوری ہے ہمارے اردگرد ہر انسان کو دیکھو، کوئی بھی مکمل زندگی نہیں گزار رہا۔ تم امیر سے امیر شخص سے مل کر دیکھنا، چہرے پر مسکراہٹ ہو گی اور مسکراہٹ میں افسردگی، کسی کو اولاد کا دکھ ہو گا کسی کو دوسرے رشتوں کا، بہت کم لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ دراصل اسی کسک کا نام زندگی ہے۔ تمہیں

ت میں ایسا کوئی انسان ملا ہے جو تمہیں لگے کہ مکمل ہر لحاظ سے۔"

"جی۔"

"کون؟"

"تعریف نہیں کرنا چاہتا مگر سچ میں مجھے آپ کی زندگی بہت پسند آئی، آپ نے کالج اور یونیورسٹی کی زندگی کو انجوائے کیا اور اب پڑھا بھی رہی ہیں۔"

میرا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئیں۔ کچھ دیر کمرے میں صرف کی بورڈ کے بٹنوں کی آواز آتی رہی۔

"یہ میرے آخری تین ماہ ہیں تم لوگوں کے فائنل ایگزامز کے بعد میں نے یونیورسٹی چھوڑ دینی ہے۔ میرا معاہدہ ختم ہو رہا ہے یونیورسٹی سے۔" ان کا جواب سن کر میں پل بھر کے لیے ساکت رہ گیا۔

"کیوں؟" میرے منہ سے نکلا۔

"بس۔" وہ کمرے سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

"کل ملاقات ہو گی بچے۔"

ان کی بات سن کر میں نے بھی اپنا لیپ ٹاپ سنبھالا اور باہر آ گیا۔ گھر واپس جاتے ہوئے میں بہت افسردہ تھا۔ میم عالیہ ظفر کا یونیورسٹی چھوڑنے کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں کیا۔ پوری کلاس انہیں پسند کرتی تھی۔

☆☆☆

فائنل ایگزامز کی ڈیٹ شیٹ آئی تو سب کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ تیاری میں لگے، رٹا مارتے اسٹوڈنٹس ہر جگہ دکھائی دیتے تھے۔ کچھ لائق طالب علم تو اکثر کتاب میں دھیان لگائے چلتے چلتے گیٹ سے ٹکرا جاتے۔ پہلے پیپر والے دن ہی یہ خبر عام ہو گئی کہ میم یونیورسٹی چھوڑ رہی ہیں۔ پوری کلاس دکھی ہو گئی۔ ہمارا اور ان کا ساتھ چھ ماہ کا تھا مگر ان کی شخصیت سب کو پسند تھی۔ اعلان کیا گیا کہ آخری پیپر والے دن انہیں الوداعی پارٹی دی جائے گی۔ دوسرے پیپر والے دن جب سب دوست پیپر دے کر چلے گئے۔ میں ان کے کمرے میں چلا آیا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں میم؟"

"آؤ بچے۔ آؤ۔" میں اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے کچھ جاننا ہے میم۔"

"یہی ناں کہ میں یونی کیوں چھوڑ رہی ہوں؟"

"جی۔"

"مجھے امید تھی تم ضرور آؤ گے، دو تین ماہ تم الجھن میں رہے ہو گے کہ میم ڈانٹ نہ دیں پوچھنے پر۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چھوٹی سی کہانی ہے میری بھی، سن لو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"میں اس شہر کی نہیں ہوں۔ لاہور سے ہوں۔ یہاں میری شادی ہوئی تھی ابو کے ایک دوست کے بیٹے کے ساتھ۔ ظفر سرکاری محکمے میں اچھی ملازمت کر رہے ہیں۔ انہیں میرا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔ اب تک جو میں نے جاب کی ہے وہ اس شرط پر کی ہے کہ جب میرا بیٹا اسکول جانے لگے گا تب میں جاب چھوڑ دوں گی۔ اور اب وہ چار سال کا ہو گیا ہے اب اس کی تربیت کرنا اور پڑھانا میرا فرض ہے اس لیے میں اب جاب چھوڑ رہی ہوں۔"

"اپنی خوشی سے؟"

"اپنی خوشی سے کچھ کرنا ہوتا تو اب تک میں اسکالرشپ پر لندن کی ایک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوتی۔ اسپورٹس کے کسی شعبے میں میرا نام ہوتا۔ چند کتابیں مارکیٹ میں ہوتیں۔ لیکن ہر عورت کو زندگی میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں، والدین کے لیے نہ سہی، اپنے گھر کے لیے۔ بہت سی خوشیاں، خواہشات ان سمجھوتوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ میں جاب کے ساتھ ساتھ سب کچھ سنبھال سکتی ہوں مگر میرا شوہر راضی نہیں تو بس جاب چھوڑ دی۔"

"میم......" میرے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"کسک...... بچے...... یہی ادھوری خواہشات اور یہی دل کے انجان گوشے میں موجود کسک کا نام زندگی ہے...... عورت کی زندگی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی اسناد اور سرٹیفکیٹ میز سے نکالے۔ اور باہر چلی گئیں۔ میں ان کی آنکھوں میں موجود آنسو نہ دیکھ سکا۔

☆☆

فرح بخاری

کنارِ خواب جو

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ خالی جیب منتشر دماغ لیے بنا سوچے مری کی کوسٹر میں بیٹھ گیا۔ مری میں ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذر اسے پہلے مہربان دوست کی صورت میں ملے، میاں جی کے توسط سے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔ ہوٹل کے مینیجر رفیق احمد کی بیٹی کنعان کالج میں پڑھتی ہے۔ ماضی کے کسی واقعے نے اسے محبت سے سخت بدگمان کر رکھا ہے۔ لیکن سوار سے پہلی ملاقات ہی اس کے دل کی دنیا کو پریشان کن حد تک تبدیل کر دیتی ہے۔

ثمامہ ایک طرح دار جوان بیوہ ہے جس نے مرحوم شوہر کی جائیداد سے مری میں نیا فائیو اسٹار ہوٹل کھولا ہے۔ وہ بھی مری میں نو وارد ہے۔

شازمہ جس نئے محلے میں اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوئی ہے وہاں تنہائی اور اکیلا پن اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا کیونکہ شوہر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔

ثمامہ کو ہوٹل کے افتتاح میں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔

رفیق احمد کے پیر میں سیڑھیاں اترتے شدید فریکچر آ گیا۔ سوار نے ان کی بہت مدد کی۔ شازمہ کی محلے میں آمنہ بھابی سے دوستی ہوئی جو کہ مولوی فیض الحسن کی بہو ہیں۔

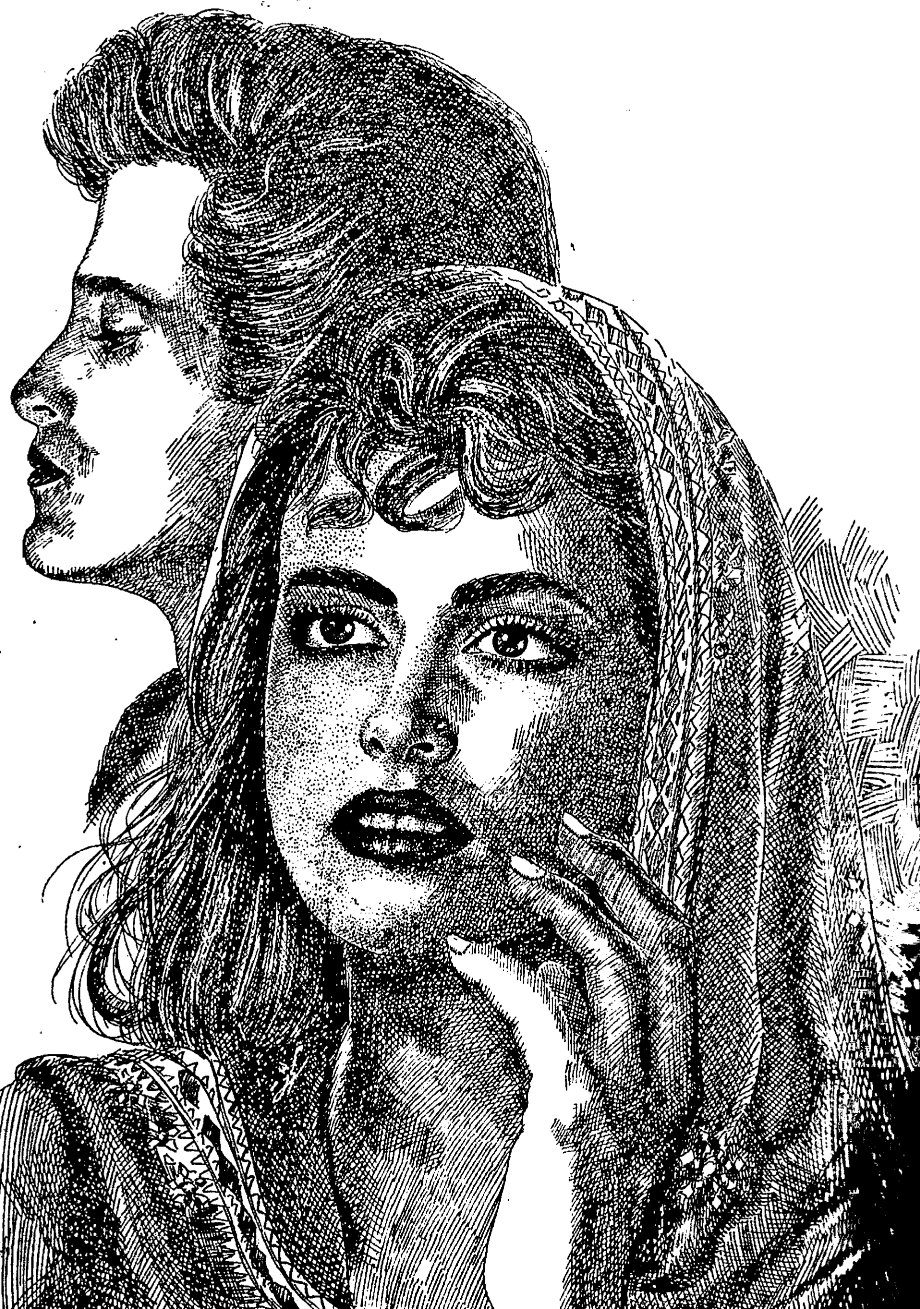
ثمامہ نے مری کے راستوں پر سوار کو دیکھا، یہ اس کا سوار سے دوسرا سامنا تھا اور معلوم نہیں کیوں لیکن وہ اسے بہت خاص لگا۔

کنعان کی رابعہ پھوپھو ان کے گھر آئیں تو کنعان کے پکائے بدمزا کھانوں کی وجہ سے دہلا او، انعان دونوں کا داخلہ کوکنگ اسکول میں کروا آئیں کنعان نے وہاں پر سوار کو دیکھ کر خوشی محسوس کی۔

چھٹی قسط



مکمل ناول



رات کا کھانا کھا کر رفیق احمد لائٹ سا قہوہ پیتے تھے۔ کنعان نے بوا کو آرام کرنے کا کہہ کر ابو کے لیے خود قہوہ تیار کیا۔ ماہین باجی پچھلی شام واپس چلی گئی تھیں اور رابعہ پھپھو نے آج صبح روانگی پکڑی تھی وہ بھی کچھ خفا خفا سی۔ ماہین سے کنعان کو پتا چلا کہ ابو نے پھپھو کو انکار کر دیا تھا۔ ابو کے سامنے قہوہ رکھ کر وہ واپس پلٹی کیونکہ ابو ٹاک شو دیکھنے میں مصروف تھے۔

''بیٹھو کنعان!'' انہوں نے ٹی وی کا والیوم کم کیا۔

''میں کچھ دیر اسٹڈی کروں گی ابو۔ آپ پروگرام دیکھیں۔''

''کر لینا اسٹڈی بھی۔ بیٹھو یہاں......'' انہوں نے اپنے قریب ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ''اور یہ پروگرام تو بس یونہی دیکھ رہا تھا۔ جانے کیا ملتا ہے انہیں چھوٹی سی خبر کو اتنا سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے میں...... سوتے وقت دماغ میں ہتھوڑے بج رہے ہوتے ہیں۔ چھوڑو یہ سب۔ تم سناؤ، کوکنگ کلاس کیسی چل رہی ہے، تمہاری پھپھو اور باجی کی آمد کی وجہ سے تو تم سے بات ہی نہیں ہو پائی۔''

''آپ کہاں کرتے ہیں مجھ سے کوئی بات۔''

اس نے پہلی باضابطہ شکوہ کناں نظر باپ پر ڈالی۔

اسے فرصت سے پاس بٹھانے کا مطلب وہ سمجھ گئی تھی یقیناً وہ آج اس سے کچھ شیئر کرنے کے موڈ میں تھے، اور کنعان کی ناراضی بھی بجا تھی۔ بھلا اتنے دنوں بعد اتنا کچھ ہو جانے کے بعد انہیں آج اس کا خیال آ رہا تھا۔

''غصہ کس بات کا ہے۔ ہوں......؟ وہ اب شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ ''باتیں نہ بتانے کا یا رشتہ نہ ہو سکنے کا؟''

''تو یہ ہے ابو۔'' وہ خفا خفا سی منہ پھلا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ ''مجھے نہیں کرنا تھا کوئی رشتہ وشتہ۔''

''ہاں تو پھر خوش نظر آؤ نا۔ جان چھوٹ جانے پر میرا شکریہ ادا کرو، بلکہ آئندہ کے لیے اپنی شرائط بھی نوٹ کروا دو کہ لڑکا کیسا ہونا چاہیے اور......''

''بس کریں ابو۔'' وہ ان کے بازو میں چہرا چھپانے لگی۔ ''مجھے آپ کے پاس رہنا ہے۔ ہمیشہ۔''

''وہ بھی ٹھیک ہے لیکن پھپھو تمہاری خوب خفا ہو کر گئی ہیں۔ پتا نہیں اب مانیں گی کب اور کیسے؟''

وہ کچھ سنجیدہ ہوئے۔

''آپ نے پہلے کبھی ان کی کوئی بات ٹالی بھی تو نہیں۔''

''ٹالنے کے موڈ میں اب بھی نہیں تھا، سوار اس روز نہ آ جاتا تو سمجھو کہ حامی بھرنے ہی والا تھا۔''

''ہوں؟'' وہ چونک کر اُن کے بازو سے دور ہوئی۔ سوار کی اس روز کی آمد سے تو وہ بھی واقف تھی، تب اماں نے چائے دینے کا کہا تو یوں پلنگ سے چپک کر بیٹھ گئی جیسے گوند لگی ہو، خود کو پڑھائی میں ایسا مصروف ظاہر کیا کہ مجبوراً چائے دینے باجی کو جانا پڑا۔ لیکن اس کے رشتے کے معاملے سے بھی سوار کا کوئی لنک ہو سکتا تھا یہ بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''میں حد سے زیادہ کنفیوژ بلکہ یوں سمجھو گھبرایا ہوا سا تھا، بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ رشتے کے لیے حامی بھرنے میں تمہارا بھلا زیادہ ہے یا انکار کرنے میں۔ تب اتفاقاً سوار ملنے آ گیا، ویسے تو ذہین بھی بہت ہے، پر ایسے موقع پر اس کی آمد کسی فرشتے سے کم نہ تھی۔ صرف دو پوائنٹس کی طرف دھیان دلا کر اس نے میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔''

رفیق احمد اب مکمل اس ملاقات میں کھو گئے تھے اور کنعان دم سادھے بس ان ہی کو سن رہی تھی۔

''اُس نے کہا رشتہ کرنے کے لیے دو رویے ہمیشہ بہت نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ پہلا تو کہ رشتے میں اس قدر مین میکھ نکالنا کہ بیٹیاں باپ کی دہلیز پر ہی بوڑھی ہو جائیں۔ دوسرا یہ سوچ کر عجلت سے کام لینا کہ ہمارے بعد ان کا کیا بنے گا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اپنی صحت کی وجہ سے جلد بازی دکھا رہا

ہوں، اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔"
"اور دوسرا پوائنٹ؟" کنعان نے دھیان دلایا۔
"ہاں......" رفیق احمد سرہلاتے دوبارہ اپنی بات کی طرف آئے۔ "دوسری بات اس نے بہت خوب صورت کہی اور یہاں بھی اس نے ٹھیک میری کمزوری پہ ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا۔ لڑکیاں گھر میں رکھا سامان نہیں کہ محض دل رکھنے کی خاطر آپ اٹھا کر کسی کو دے دیں۔ اور آپا کے معاملے میں سب سے اسٹرانگ پوائنٹ ہی یہی تھا۔ میں نے ان کی کوئی بات کبھی نہیں ٹالی۔ اپنے بیٹوں کے ٹائم وہ تم دونوں کا رشتہ نہیں مانگ سکتی تھیں کیونکہ شہروز اور نوید تم دونوں سے عمر میں بہت بڑے ہیں اور جس وقت ان کی شادیاں ہوئیں تم دونوں اسکول میں پڑھتی تھیں، ورنہ وہ تو تم دونوں کو ہی اپنے گھر لے جاتیں۔"
ابو دھیمے دھیمے بولتے اسے بتاتے جا رہے تھے اور کنعان کا من کہیں دور بھٹکنے لگا۔
"تھینکس سوار۔ تم نے تو بہت بڑا مسئلہ بڑے آرام سے حل کر دیا، تمہاری مہربانی کی اس دل میں بڑی قدر ہے لیکن شاید یہ شکریہ میرے دل میں رہے، کیونکہ کنعان نے اپنے دل کو ہمیشہ کے لیے سمجھا دیا ہے۔ اب یہ محبوب کی راہوں میں کبھی نہیں بھٹکے گا۔ یہ میرا عہد ہے خود سے۔ اور یہ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ ان شاء اللہ۔"
وہ اپنے وعدوں کو خود اپنے آپ سے دہراتی شاید خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور یہ کوشش تو اسی آنے والی رات میں ہی کچھ کچھ رائگاں جاتی دکھائی دی۔ کیونکہ رات بھر ہی وہ کچھ عجیب ملے جلے خوابوں اور خیالوں کے زیر اثر رہی تھی۔ بار بار ہنستا مسکراتا سوار "ہیلو فرینڈ" کہتا اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوتا، جواباً اپنا سخت رویہ اور اس کی حیرت کسی فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلتی رہی۔ حتیٰ کہ صبح تک اسے لگنے لگا کہ وہ ایک بار پھر اپنے دل سے ہار جائے گی۔ اور خود پہ کنٹرول دراصل خود کو فریب دینے کے مترادف ہے۔
سوار سے سامنے کا خیال بھی شام کو بہت نروس کر رہا تھا۔ پچھلے روز جس طرح اس کا دل دکھایا معلوم نہیں آج اس کا جوابی ردعمل کیسا ہو۔ شام ہونے تک کنعان جانے اس کے کتنے روپ تصور کر چکی تھی۔ لیکن وہ...... ملا بھی تو کس انداز میں۔ سارے خواب سارے خیال بے بنیاد ثابت ہوئے، وہ تو بالکل نارمل تھا، سبھی کے ساتھ سمیت اس کے۔ نہ آنکھوں میں کوئی شکوہ نہ انداز میں کوئی خفگی، ایک دو بار معمول کے کسی کام سے مخاطب کیا تو لہجے میں وہی روز جیسی نرمی اور دوستانہ پن دکھائی دیا لیکن ایسا دوستانہ پن جو سب کے لیے جھلکتا ہے۔
"ڈھائی منٹ بعد اوون کی بیپ بجے گی آپ بس ٹرے فوراً باہر نکال لیجیے گا کنعان۔ مجھے میم بلا رہی ہیں۔" وہ بالکل عام اور نارمل انداز میں کہتا باہر چلا گیا تھا اور کنعان اپنے آپ میں بری طرح شرمندہ ہوئی۔
کیسی بے وقوف ہوں میں بھی، اُس کے حساب سے تو ہوا ہی کچھ نہیں اور میں نجانے کیا کچھ سوچے بیٹھی تھی۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ چھوٹی چھوٹی جو باتیں میرے لیے جینے مرنے کی حد تک اہم ہیں، اس کے لیے بھلا کیوں کوئی معنی رکھتی ہوں گی۔ اس کے لیے "میں" اہم ہوتی تو میرا یہ رویہ بھی چونکانے کا باعث ہوتا، کاش میں نے بھی اس روز اتنا ہی نارمل رویہ اپنایا ہوتا، پتا نہیں اس نے میرے رویے سے کیا اخذ کیا ہوگا۔ میں اُسے بھلانا چاہ رہی ہوں یہ تو میں جانتی ہوں۔ اس کے نزدیک تو ہم سب محض کولیگ ہیں اور بظاہر کسی معاملے میں ہمارا آپس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ایسے میں اچانک رُوڈ بی ہیو کرنا تو اگلے کو اُلٹا شک میں ڈال سکتا ہے۔ تو مطلب اُسے بھی اب اپنے دل کی اکھاڑ پچھاڑ کو اپنے رویے سے ظاہر نہیں کرنا تھا۔
بیپ کی آواز نے توجہ اپنی جانب کھینچی اور وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچتی مطمئن انداز میں اوون کی

طرف بڑھ گئی۔

کلاس ختم ہونے پر اُس شام وہ دیا کے ساتھ باہر نکلی تو سوار آگے آگے جاتا دکھائی دیا۔ اب وہ ان کے انتظار میں نہیں رکتا تھا، ویسے بھی ڈھلان اور ذیلی راستہ ختم ہونے پر مین روڈ آتے ہی کچھ دیر بعد اس کا ہوٹل آجاتا تھا۔

''اے سنو کنعان۔ میں سوار بھائی کو روکوں؟''

دیا نے اُسے چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ متحمل رہی۔

''روک لو۔ مرضی تمہاری۔'' انداز بڑا ہی لاپروا سا تھا۔ دیا نے بڑی مشکل سے حیرت دبائی، پھر آواز دے کر سوار کو روکا۔ وہ ڈھلان اُتر چکا تھا۔ دیا کی آواز پر ہلکا سا مسکراتے ہوئے مُڑا۔

''آئیں بھئی، سست خواتین۔''

''زیادتی ہے سوار بھائی۔'' دیا نے خفگی سے دیکھا۔ ''گرلز کہنے میں آپ کا کیا جاتا ہے۔''

''اچھا'' اس نے ہلکے سے داڑھی کھجائی۔

''میں نے تو آپ کے کالج کے باہر لکھا دیکھا تھا ''ڈگری کالج فار وومن'' گرلز کہیں نظر نہیں آیا۔''

''شرمندہ کرتے ہیں سوار بھائی۔'' وہ بھی کھسیا گئی۔ کنعان نے ہنسی روکی۔ ''لکھا بھلے نہ ہو، لیکن دیکھتے تو لڑکیوں کو ہوں گے ناں۔ آتے جاتے۔''

''توبہ کریں دیا بی بی۔ میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔'' اُس نے جھٹ کانوں کو ہاتھ لگائے اور کنعان اس مرتبہ اپنا قہقہہ نہ روک سکی، دیا کی خوب درگت بن رہی تھی آج۔ بڑا شوق ہو رہا تھا سوار بھائی کو روکنے کا۔

''میرا مطلب ہے دکھائی تو لڑکیاں دیتی ہوں گی۔'' دیا نے زچ ہو کر وضاحت دی۔

''بالکل نہیں۔'' اس نے فوراً سر نفی میں ہلایا تو دونوں حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''بھئی تین چار روز پہلے اتفاقاً جانا ہوا وہ بھی شام کو، تو اس ٹائم کہاں ہوتی ہیں، گرلز یا وومن۔ بلکہ میں تو ہوٹل آیا تھا سب سے ملنے۔ اِن کے ہاں بھی جانا ہوا تھا، رفیق سر سے ملاقات ہوئی۔'' عام سے انداز میں بتاتے اس نے ہاتھ سے کنعان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''اچھا'' دیا نے سخت تعجب سے کنعان کو دیکھا۔ ''تم نے بتایا نہیں۔'' انداز کچھ جتانے جیسا تھا۔ کنعان بری طرح جُز بُز ہوئی۔ اس دیا کی بچی سے حیرت بھی کچھ دیر قابو نہیں ہوتی۔

''کنعان بی بی سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی، شاید یہ گھر پر نہیں تھیں۔'' سوار خود ہی بتانے لگا۔ پھر کنعان کی طرف براہ راست دیکھا۔

''سسٹر چلی گئیں آپ کی؟''

''جی دو روز پہلے گئی ہیں۔''

''آپ کو پتا ہے سوار بھائی۔ ماہین باجی اور رابعہ پھپھو اس کے رشتے کے سلسلے میں آئی تھیں۔''

دیا نے پھر بنا سوچے چٹکلا چھوڑا۔

''جی مجھے معلوم ہے، سر نے ذکر کیا تھا۔'' سوار نے اندرونی جوش اور تجسس دبا کر لہجہ نارمل رکھا۔ کنعان نے اس درمیانی وقفے کے دوران کچھ طے کیا، موضوع تو چل ہی نکلا تھا کیوں نہ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھائے۔

''ابو نے مجھے بتایا تھا آپ کے آنے کا۔'' کنعان نے پہلی مرتبہ اپنی طرف سے گفتگو کا آغاز کیا وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر۔ ''آپ کا بہت شکریہ، آپ کے مشوروں نے انہیں یقیناً فیصلہ کرنے میں کافی مدد دی۔''

''شکریہ کس بات کا، سر تو میرے لیے باپ کی طرح ہیں، انہیں میں پریشان کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ باقی میرے مشورے نے انہیں کسی قسم کی مدد دی تو یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' سوار نے حد درجہ نیاز مندی سے کام لیا۔ جبکہ پوچھنا وہ یہ چاہتا تھا کہ آخر فیصلہ کیا ہوا، لیکن الفاظ نہیں ملے۔

''ارے کوئی مجھے بھی بتائے گا کہ یہ کیا چل رہا ہے۔'' دیا کو اپنی بے خبری کے مروڑ اُٹھ رہے تھے۔

''بتاتی ہوں، مرو نہیں۔'' کنعان نے گھور کر

چپ رہنے کی تنبیہہ کی۔ پیٹر اِن قریب آچکا تھا۔
"اچھا سوار بھائی۔ اللہ حافظ۔" دیا نے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا تو کنعان کو خیال آیا کہ اس نے سوار سے جان بوجھ کر بات بڑھائی ہی اسی لیے تھی کہ آج وہ بھی دیا کی طرح اسے بھائی کہہ کر مخاطب کر لے گی لیکن وہ بنا "بھائی" ڈالے اپنی پوری گفتگو مکمل کر چکی تھی۔ اور اب دیا کی دیکھا دیکھی ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ سوار بھائی بھی کہنا قطعی مصنوعی اور خود ساختہ لگتا کیونکہ یہ اس کا اسٹائل تھا ہی نہیں۔ اُسے سوچتے سوچتے اچانک ابو کی ایک بات یاد آئی۔
"ابو نے آپ کا نمبر مانگا تھا سوار بھائی۔" اُس نے یک لخت پیچھے سے آواز لگائی اور سوار بنا مڑے وہیں تھم گیا۔ تین، ساڑھے تین ماہ کی مدت میں یہ پہلی بار ہوا تھا۔
"لیکن کیوں؟" اس نے بڑے ضبط سے کام لیا، ہلکی سی گردن سائیڈ پہ گھمائی۔
"میں خود ہی انہیں کال کر لیتا ہوں۔ وہ نمبر سیو کر لیں گے۔" بنا مڑ کر کنعان کی طرف دیکھے بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گیا۔
"اونو، اچھا بھلا سوار بھائی کا نمبر ہاتھ آرہا تھا۔" دیا نے منہ بنایا۔
"تم نے کیا کرنا تھا ان کے نمبر کا۔" کنعان نے لاپروا بننے کی کوشش کی۔
"اور یہ تم نے انہیں بھائی کیوں کہا۔" دیا کو یاد آیا۔ "تم تو کہتی تھیں کہ......"
"ہاں کہتی تھی، لیکن اگر انسان اپنی کمزوریوں کے آگے ہتھیار ڈالتا جائے تو ایک دن اپنے نفس کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے دھیرے دھیرے ہر معاملے میں خود کو کمپوز کر لیا ہے۔ بس یہیں آکر شکست کھا جاتی تھی۔ آج سوچا دل کو شکست دینی ہے تو یہ مرحلہ بھی پار کر کے دیکھتے ہیں۔" وہ اب گہری سنجیدگی سے دیا کو حقیقت بتا رہی تھی۔
دیا نے بھی اس کے انداز پر کندھے اُچکا دیے۔

☆☆☆

انیکسی کے پچھلے حصے میں موجود یہ نیم ڈھلانی لان غروب آفتاب کا نہایت خوب صورت منظر پیش کرتا تھا۔ ثمامہ کے پاس یوں تو وقت بڑا ہی کم ہوتا تھا آرام سے ٹِک کر بیٹھنے کے لیے لیکن ہوٹل کے معاملات اب قدرے معمول پر آگئے تھے۔ اب پرانے دنوں کی طرح وہ صبح بھی دیر تک اپنی نیند پوری کر لیا کرتی اور ہوٹل سے بھی جلدی لوٹ آتی۔
"اب تو اتنی اچھی اچھی فیملیز سے تعلق بن گیا ہے ثمو۔ کبھی کسی کو گھر بھی بلاؤ۔" امی بھی وہیں اس کے ساتھ بیٹھی شام کے ڈھلتے سایوں کو دیکھ رہی تھیں۔
"اچھا......" ثمامہ ہلکا سا ہنسی۔ "آپ کو کب سے شوق ہو گیا نئی دوستیاں کرنے کا؟"
"میں نے کیا کرنا دوست بنا کر۔ میں تو تمہارے لیے کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے خفگی سے ثمامہ کو دیکھا اور وہ جان کر بھی انجان بن گئی۔
"اور میں کیا کروں گی دوست بنا کر۔ ہوں؟" وہ مسکرا رہی تھی۔
"بہت ہو گیا ثمامہ، اب اپنی لائف کے بارے میں سنجیدہ ہو جاؤ، ہوٹل کی ٹینشن میں جان جلا کر خاک کر رکھی تھی۔ اب تو اچھے سے چل رہا ہے سب کچھ۔ اب تم اپنے بارے میں سوچو۔"
"یہ میرے ہاتھ میں تھوڑی ہے امی۔ جو اوپر والے کو منظور۔"
"ہاں صحیح ہے لیکن اب ہم یہاں ہیں تو میل جول سے ہی اسباب پیدا ہوں گے ناں۔ اونچے لوگوں اور بڑی فیملیز سے جان پہچان ہو گی تبھی۔"
"امی۔ آصفہ باجی کا فون ہے۔ جلدی آیئے۔"
"ارے یہ موبائل پہ کال کیوں نہیں کر رہی۔ اچھا، دیکھتی ہوں۔" وہ کپ رکھ کر اندر کی طرف بڑھ گئیں اور گرم چائے کے گھونٹ اندر اتارتے۔ ثمامہ ڈوبتے سورج کی لالی کو دیکھے گئی۔

''اونچے لوگ، بڑی فیملیز بہت دیکھ لیں امی۔
ثمامہ ابراہیم کو اب نہ نام کی ضرورت ہے نہ روپے پیسے کی۔ زندگی میں کمی ہے تو بس ایک ایسے شخص کی جو بہت محبت کرے، خوب توجہ دے، ناز اٹھائے، اور سب سے بڑھ کر جو آپ کی بیٹی کی چاہت ہو، پھر دولت اسے میں دوں گی جسے پا کر وہ ہمیشہ میرا ہو کے رہے گا۔'' اور زندگی کا یہ ایسا رخ ہوگا جو اس سے قبل ثمامہ نے نہیں دیکھا۔
کہیں محبت ملی تو دولت نہیں مل سکی، جہاں دولت ملی وہاں محبت نہ ہو سکی، اور اب دولت ہے تو ساتھی کوئی نہیں۔ اس لیے جہاں ثمامہ نے اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا سا اور انتظار کر کے اس بار وہ اپنی خوشیوں کو مکمل طور پہ محسوس کرے گی۔ شفق کی لالی پہ چاند اُبھر رہا تھا۔ اور ثمامہ کی آنکھوں کی جوت لبوں کی مسکان بتاتی تھی چاند میں دکھائی دیتا عکس دھندلا نہیں تھا، کوئی تصویر مکمل ضرور ہو چکی تھی۔

☆☆☆

کافی دنوں سے اس کی اور دیا کی کپڑوں کی کچھ شاپنگ رہتی تھی۔ اتوار کے دن صبح دس بجے ہی دیا اس کے سر پر سوار ہوگئی کہ آج بالکل سستی نہیں کرنی کنعان کو بھی اس کی دیکھا دیکھی ہمت ہوئی۔ اور اب دو گھنٹے بعد دونوں اپنا کامیاب دورہ نمٹا کر واپس گھر آ چکی تھیں۔ اماں نے اس دوران کھانا تیار کر لیا تھا۔ دیا کو انہوں نے زبردستی روک لیا۔ کنعان جس وقت اپنا اور اس کا کھانا لے کر کمرے میں آئی وہ دونوں ہاتھوں سے خود اپنی ٹانگوں کو بیٹھی دبا رہی تھی۔
''کیا ہوا اماں جی، ٹانگیں جواب دے گئیں؟'' مسکراتے ہوئے کنعان نے چھوٹی میز درمیان میں گھسیٹی۔
''تین چکر تم نے صرف کینٹ مارکیٹ کے لگوا دیے، شرم تو نہیں آتی ناں۔''
''اچھا واہ۔ ابھی تو تم کشمیر پوائنٹ تک پیدل مارچ کی باتیں کر رہی تھیں، تمہارا تو مال روڈ نے یہ حال کر دیا۔'' کنعان کھل کر اس کا مذاق اُڑا رہی تھی۔

''اب وہ تو پکنک کا موقع ہوگا ناں، تب چلنا بوجھ کہاں لگتا ہے۔'' دیا کھسیا کر وضاحت دینے لگی۔
''اور پہلے تم حامی تو بھرو، پیدل ویدل کے معاملات چھوڑ دو۔''
''لیکن یہ پروگرام بنا کب اور بنایا کس نے؟'' دونوں بیڈ پر آلتی پالتی مارے کھانا شروع کر چکی تھیں۔
''یار، تم اندر پارسل بنوا رہی تھیں۔ باہر لان میں سیما باجی، ندرت اور مریم وغیرہ کے ساتھ بنا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ کلاسز ختم ہونے میں اب صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ اس لیے سیشن اینڈ پر پکنک رکھتے ہیں۔''
''تو ناظمہ میم سے بات ہوئی؟''
''وہ کب منع کرتی ہیں۔ بس تم نہ مت کرو پلیز۔''
''فورس مت کرو دیا، میرا بالکل کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہیں کنعان کا ارادہ مصمم لگ رہا تھا۔'' شاپنگ کے دوران بھی دیا مسلسل اسے کنوینس کرنے میں لگی رہی لیکن اس کا تو بس ایک ہی انکار تھا۔
''مجھے لگتا ہے تم سوار بھائی کی وجہ سے منع کر رہی ہو۔''
''چلو یہی سمجھ لو۔ بس میں زیادہ گھلنے ملنے سے ایوائیڈ کرنا چاہتی ہوں، تمہیں تو میرا ساتھ دینا چاہیے دیا، دوست کی مشکل میں تم اس کا ساتھ نہیں دو گی تو اور کسی سے کیا توقع کریں۔''
''ایک تو مجھے تمہاری مشکل کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اوکے، مت جاؤ، لیکن اگر تم نہ گئیں تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔''
''اب یہ کیا بات ہوئی۔'' زچ ہونے کی باری اب کنعان کی تھی۔ ''تم میری وجہ سے کیوں روکتی ہو خود کو۔ اب تو کتنی دوستی ہے سب سے، تم بالکل اکیلا پن محسوس نہیں کرو گی۔ بلکہ تمہاری وجہ سے تو میں تصویریں اور ویڈیوز وغیرہ بھی دیکھ سکتی ہوں۔''
''اچھا واہ۔ یعنی لائیو کوریج نہیں تو ریکارڈڈ

سہی۔ ہوں؟"

"ہاہاہا، یہی سمجھ لو۔" کنعان نے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"اوکے، تو تمہاری خاطر پھر میں ہاں کہہ دیتی ہوں۔" دیا اس بار نیم رضامندی سی کھانے پر جھک گئی۔

☆☆☆

تم سب تو مجھے کچھ بھی ڈیسائیڈ کرنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتیں۔ جسے دیکھو اپنی ہانک رہا ہے۔ سیما باجی کوئی تیسری مرتبہ سب کو خاموش کروا کے پکنک کی جانب راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن کوئی کسی ایک نقطے پر ٹِک ہی نہیں رہا تھا۔

"ایک بار پروگرام ختم کر کے دیکھیں، سب اکٹھے ہو جائیں گے سیما باجی۔" فاطمہ نے چھانٹ کر مشورہ نکالا سب کو ہنسی آ گئی۔

"سولہ آنے پتے کی بات۔" مشورہ مہک کے ایک دم دل کو لگا کیونکہ وہی سب سے زیادہ ایکسائٹڈ لگ رہی تھی۔

"ہاں لیکن ہمارا لیڈر دکھائی نہیں دیتا۔" سیما نے ہاتھ کا چھجا بنا کر سوار کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"کیا کرتا پھر رہا ہے یہ لڑکا۔"

"ابھی تو پزا ہاتھ میں لیے کہیں جاتے دکھائی دیئے تھے۔" انعم نے بھی برآمدے میں دور تک نگاہ گھمائی۔

"لیں جی، پزا ہاتھ میں لیے یہیں آتے دکھائی دے رہے ہیں۔" آنسہ نے مطلع کیا تو سب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کلاس روم سے نکل کر سوار ادھر ہی آ رہا تھا۔

"تمہارا جی نہیں بھرا ابھی پزا سے؟" سیما باجی مسکرائیں اور وہ ان کے قریب ہی لان کی گھاس پر بیٹھ گیا۔

"پزا سے میری محبت کو آپ نہیں سمجھ سکتیں سیما باجی۔" سوار نے ایک درد بھری آہ بھرتے پلیٹ اپنے سامنے رکھی۔ سب ایک ساتھ اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کنعان نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

یہ ہیرو تھا یہ بھی، سب کی توجہ نجانے کیسے اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ وہ بھی بنا کوئی کوشش کیے، یونہی مستی میں۔ بلکہ جب ایک انسان کو یہ احساس گھیر لے کہ وہ توجہ اور کشش کا باعث بن رہا ہے تو انداز کی فطری خوب صورتی یوں بھی زائل ہو جاتی ہے۔ سوار کے انداز و اطوار بھی سراسر فطری ہوتے تھے جو یہ بتاتے تھے کہ اسے اپنی اس خوبی کا احساس تک نہیں۔

"محبت کا رشتہ۔ پزا سے؟" سیما باجی ہنسیں۔

"لمبی کہانی ہے سیما باجی پھر کبھی آرام سے سنیے گا۔"

"اچھا بھئی ٹھیک ہے اور اب اگر تمہارا جی پزا سے بھر گیا ہو تو پکنک کا پروگرام بنا لیں؟"

"جی جی بالکل۔ جب جہاں کہیں بندہ جانے کو حاضر ہے۔"

"بھوربن اور کشمیر پوائنٹ زیر بحث ہیں۔ کچھ لوگ کشمیر پوائنٹ تک پیدل مارچ کے حق میں ہیں لیکن اگر بھوربن کا پروگرام بنا تو پیدل کا آئیڈیا ڈراپ کرنا پڑے گا۔"

"ویسے آئیڈیا تو پیدل کا ہی اچھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انجوائے منٹ۔ رُک کر کھانا پینا، فوٹو گرافی۔"

"تو پھر ووٹنگ کروا لیتے ہیں اس سے پہلے کہ کوئی نکل جائے۔" سیما باجی نے آیا جی سے کہہ کر سب کو باہر بلوایا۔ زیادہ ووٹس کشمیر پوائنٹ تک واک کے حق میں آئے۔ کنعان، بشریٰ باجی اور روبینہ نے البتہ معذرت کر لی۔ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے سوار لمحے کو ٹھٹکا۔ کنعان نے جانے سے معذرت کی تھی۔ ادھر سیما باجی بھی اب انکار کرنے والوں کی کلاس لے رہی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوا کنعان۔ کیا مصروفیت ہے؟"

"گھر میں گیسٹ آئے ہیں سیما باجی، ٹائم نہیں نکال سکتی۔" اس نے بنا گنجائش نکالے پھر صاف انکار کیا۔

سوار دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا کہ مہمان تو ابھی گئے ہیں۔ دل ایک دم بری طرح بجھ گیا۔ پل بھر میں پیدا ہونے والا جوش خروش کنعان کے ایک انکار سے ہوا ہو گیا لیکن اس نے خود کو کسی قسم کی مداخلت سے باز رکھتے اوروں کی باتوں کی جانب زبردستی اپنی توجہ مبذول کر لی۔ دل میں بس ایک ہی خواہش لیے کہ کاش باقی سب مل کر اسے کنوینس کر لیں۔

☆☆☆

کام کاج تو سبھی نمٹ گئے تھے۔ عموماً وہ اس وقت آرام کرنے چلا جاتا تھا۔ لیکن ایک تو نیند کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ دوسرے موسم بھی باہر ا یکدم نہایت خوش گوار ہو گیا تھا۔ مری میں پچھلے تین دنوں سے مسلسل دھوپ تھی۔ اور دھوپ سے مری کا رشتہ بس اتنے دنوں تک ہی رہتا۔ سوار کو بھی دھوپ سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ تبھی ٹاپ فلور کے کافی شاپ سے بادل اور بجلیاں دیکھتے وہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ یہاں اس وقت کوئی سیاح نہیں تھے۔ عملہ ہی کام سمیٹنے میں لگا ہوا تھا۔ سوار نے اپنے لیے کافی بنوائی اور ایک بیرونی جنگلے کے پاس کی کرسی پر بیٹھ کر شام کا اخبار دیکھنے لگا۔ اور ابھی وہ آدھے کپ سے ہی لطف اندوز ہو پایا تھا کہ موبائل فون پر ثمامہ میڈم کی کال آنے لگی۔ سوار نے ٹائم دیکھ کر حیرت دباتے کال اٹینڈ کی۔ رات کے کچھ ساڑھے دس بجے تھے۔

''سوار۔ آپ سو تو نہیں گئے تھے۔'' ثمامہ کا پہلا جملہ ہی معذرت خواہانہ تھا۔

''نہیں میم۔ یہاں ٹاپ فلور پر ہوں۔ کافی ہاؤس میں۔ سب خیریت ہے؟''

''جی جی بالکل۔ وہ ایکچوئلی مجھے مال روڈ جانا تھا۔ سوچا بک شاپ کھلی ہو تو کچھ بکس خرید لوں، دن میں ایک تو رش بہت ہوتا ہے ادھر، پھر ٹائم بھی نہیں نکلتا۔''

''صحیح۔ تو میں آجاؤں آپ کو لینے؟'' سوار کو یہی سمجھ میں آیا۔

''ارے نہیں۔ آپ یہاں آنے کی تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ میں خود ہوٹل کی طرف نکلتی ہوں، پھر آپ کو لیتے ہوئے مزید آگے ہی تو جانا ہے۔ مجھے دراصل ٹائم ذرا آکورڈ لگ رہا تھا۔''

''نہیں میم۔ میرے خیال سے گیارہ بجے تک تو شاپس اوپن ہوتی ہوں گی۔ باقی کوئی بات نہیں، آپ آجائیں۔ خود ہی دیکھ لیں گے۔''

''اوکے، میں تیار ہوں، بس نکلتی ہوں فوراً۔''

اس نے کال کاٹ دی۔

سوار بھی عجلت میں کافی ختم کرتے نیچے روم میں چلا آیا۔ اور جس وقت ثمامہ گاڑی لیے ہوٹل کے سامنے آئی۔ وہ چینج کر کے دروازے کے باہر آچکا تھا۔ آسمان پر اوپر بیس بائیس فٹ اونچائی پر بادل ہی بادل تھے۔ اور دھند کی طرح عنقریب وہ نیچے تک پھیلنے والے تھے۔ ثمامہ ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر دوسری جانب آئی۔ سوار کی نظر اس کی خوب صورت ڈریسنگ پر پڑی تو بے ساختہ آنکھوں میں ستائش اُبھری۔ لباس کے معاملے میں اس کا ذوق یقیناً قابل تحسین تھا۔ ڈیپ پرپل شلوار قمیص کے ساتھ بلیک شال جس پہ پرپل اور تیز آتشی گلابی کشمیری کڑھائی کا بارڈر تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی غالباً اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا تبھی شال کو مزید اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ایک نظر مسکرا کر سوار کو دیکھا اور آگے سے گھوم کر فرنٹ ڈور کھولا۔ سوار نے بھی اس دوران ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بک شاپ جانے کا تو پہلے سے پتا تھا ثمامہ کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھا دی۔

''سوری سوار۔ آپ کو بے وقت تکلیف دی۔''

''میں بالکل فری تھا میم۔ اِٹس اوکے۔ بلکہ میں بھی بک شاپ کی طرف بہت دنوں سے جانے کا سوچ رہا تھا۔ فارغ ٹائم میں بکس ریڈنگ سے بہتر مشغلہ ہو نہیں سکتا۔''

''ہاں بس اللہ کرے شاپ کھلی ہو، مجھے لگتا ہے ٹائم کافی آڈ ہے۔''

''چلیں کوئی بات نہیں، آج دکان بند ملی تو کل

لیے کم از کم صحیح ٹائم کا اندازہ تو ہو جائے گا۔'' سوار نے ثمامہ کو تسلی دیتے کار کی اسپیڈ تھوڑی کم کی۔ آگے بابا سابل کھاتا موڑ اور سیاحوں کا کچھ رش بھی تھا۔

سوار نے موڑ سے نکلنے کے بعد کار سیدھی کی وہ اب آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا جب دائیں جانب سڑک کنارے سوار کا دل یکبارگی بڑی شدت سے دھڑکا۔ اسے شبہ سا گزرا کہ اس نے کنعان کو دیکھا ہے، اور پھر دھیان لگانے پر شبہ یقین میں بدلا، وہ واقعی کنعان تھی اور...... سوار کے مضبوط اعصابی نظام میں شدت کا طوفان اُٹھا تھا۔ کنعان سڑک کنارے ایک نوجوان کے سامنے اکیلی کھڑی تھی اور وہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ عمران تھا۔ اپنا اکیڈمی فیلو عمران۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے کچھ بات کر رہے تھے۔ عمران نے اس کی جانب ایک پیپر بڑھایا تھا۔ اور وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے اس کی بات سن رہی تھی۔ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر۔ اور سوار کی برداشت بھی بس یہیں تک تھی۔ بیچ سڑک اس نے زور سے بریک لگائی۔ ثمامہ نے بمشکل اپنا سر آگے لگنے سے بچایا۔

''ایک منٹ ثمامہ۔'' وہ نہایت عجلت میں فوراً نیچے اُترا تھا۔ ثمامہ کو ہکا بکا چھوڑ کر۔ وہ جو سوار کے منہ سے پہلی مرتبہ اپنا نام سن رہی تھی۔ حیرت سے منہ کھولے اس بے فکرے کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

تو سوار نے میری دوستی کی آفر قبول کر لی۔ وہ بچوں کی طرح ہاتھ اپنے منہ پہ رکھے سرخوشی میں مبتلا تھی۔ ''ایک منٹ ثمامہ'' کی اپنائیت بھری آواز نے اندر کیسا خوش کن احساس جگایا تھا۔ وہ سوار کے دل کی حالت سے قطعی انجان اپنی نئی نئی ہاتھ آئی خوشی میں مگن تھی۔ یہ جانے بغیر کہ باہر کے ایک منظر نے اس کا کس بری طرح دماغ گھمایا تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے تیز قدموں سے چلتا سیدھا ان کے سر پر پہنچا لیکن وہ دونوں تب بھی متوجہ نہیں ہوئے تو سوار نے نام لے کر پکارا۔

''کنعان۔'' اور ایک مانوس آواز کے کانوں سے ٹکراتے اس نے پہلی مرتبہ گردن گھمائی۔

''عمران۔ خیریت، تم دونوں یہاں، اس وقت؟'' سوار نے بڑی دقت سے اپنی کیفیت کو نرم لفظوں میں ڈھالا۔

''اوہ ہائے سوار۔'' عمران نے خوش دلی سے ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا اور وہ بات عمران سے کرتے بھی دیکھ کنعان کو رہا تھا جو سوار کو سامنے پا کے حسب عادت نروس سی ہو گئی تھی۔

''وہ میں یہ....'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک تھیلا آگے کیا۔ ''دوائیں لے رہی تھی۔''

''یہ سامنے میرا میڈیکل اسٹور ہے نا۔'' کنعان نسخہ اندر کاؤنٹر پر بھول آئی تھی۔ میں وہی دینے آیا تھا۔

''خیریت، کیسی دوائیں؟'' وہ اب تشویش سے کنعان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پچھلی پریشانی کا بوجھ قدرے زائل ہو گیا تھا۔

''ابو ہاسپٹل میں ہیں۔'' وہ اب دھیمے لہجے میں بتا رہی تھی۔

''دل میں تکلیف شروع ہوئی شام کو، درد زیادہ ہونے لگا تو ہاسپٹل لے آئے تھے۔ ای سی جی کی رپورٹس تسلی بخش نہیں آئیں۔''

''ابھی کہاں ہیں...... گھر یا ہاسپٹل؟''

''ہاسپٹل میں ہیں۔ میرے ساتھ اماں ہیں۔''
ادھر کنعان نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ کچھ فاصلے پر واقعی اماں ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھی تھیں۔ ''ہم اب واپس ہاسپٹل جا رہے ہیں۔''

''سر کے پاس کوئی ہے؟ اور انہیں ڈسچارج کب کرنا ہے؟'' سوار کا دماغ اب مسلسل کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔

''صبح تک ہاسپٹل میں ہیں۔ اور انکل اشفاق (دیا کے ابو) ان کے پاس ہیں۔''

''ہوں۔'' سوار نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ثمامہ گاڑی میں بیٹھی ابھی تک حیرت سے ادھر دیکھ رہی تھی۔

''کنعان، میں آپ کو ہاسپٹل چھوڑ دوں؟ میرے پاس گاڑی ہے۔''

''جی نہیں، ہم ہاسپٹل کے نزدیک ہیں۔ چلے جائیں گے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اماں کو اٹھنے کا کہا۔

''اوکے، آپ لوگ جائیں۔ میں بھی کچھ دیر میں پہنچتا ہوں۔'' اس نے ہاسپٹل کا پوچھا اور تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔

''خیریت سوار کافی پریشان لگ رہے ہیں؟''

''جی وہ میرے ایک جاننے والے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ ان ہی کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔''

''کوئی عزیز ہیں؟'' ثمامہ کو یاد آیا کہ سوار تو مری میں اکیلا رہتا تھا۔

''جی نہیں۔ سر ہیں۔ آپ کے ہاں آنے سے پہلے میں ان ہی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا ازمیر ہوٹل۔''

''جی جی یاد ہے۔ اور وہ لڑکی؟''

''جی سر کی بیٹی ہے کنعان۔'' وہ روانی میں نام بھی بول گیا۔

''او۔'' ثمامہ نے کالے اسکارف کے ہالے میں اس کم عمر پیاری سی لڑکی کو دور تک دیکھا۔ سوار نے تھوڑا آگے جانے پر کار بک شاپ کے آگے روکی جو اتفاق سے کھلی ہوئی تھی۔ ثمامہ نے گاڑی سے اتر کر سوار کو بھی بلایا لیکن اس نے موبائل جیب سے نکالتے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی اور انداز میں بے فکری سی تمکنت، جیسے دھیان میں بھی کہیں نہ ہو کہ وہ اپنی مالکن سے مخاطب ہے۔ ثمامہ نے مسکراہٹ روک کر بڑی دلچسپی سے اس کا انداز دیکھا۔ اور بالوں میں ہاتھ لہراتی شاپ کے اندر چلی گئی۔

''ہیلو صدیق۔ کیا حال ہیں...... رفیق سر کیسے ہیں اب؟''

''ہاں یار۔ ہاسپٹل میں ہیں ابھی۔''

''یار۔ بندہ ایک کال تو کر دیتا ہے۔ عجیب آدمی ہو۔''

''نہ پوچھو یار۔'' صدیق شرمندہ سا ہو گیا۔

''یقین مانو تم سے تو باقاعدہ ہیلپ مانگنے والا تھا۔ سر کی طبیعت جس وقت خراب ہوئی، وہ یہیں ہوٹل میں تھے۔ بدقسمتی دیکھو، قاسم رات ہی کشمیر گیا ہے، جاوید صاحب آج سارا دن آئے ہی نہیں۔ روم سروس والا بھی کوئی نہیں تھا۔ کنعان بی بی کو اطلاع دی، وہی اشفاق صاحب کو بلا لائیں۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''کنعان بی بی سے اتفاقاً سامنا ہوا تو پتا چلا یہیں مال روڈ پر، ابھی کچھ دیر میں جاؤں گا ان کی طرف۔''

''ہاں صحیح ہے، اور طبیعت کیسی ہے اب ان کی؟''

''بتا رہی تھیں، رات بھر یہیں رکھیں گے۔''

''اللہ خیر فرمائے۔ چلو تم ہو آؤ، پھر مجھے بھی بتانا۔''

''ہوں، اوکے۔''

سوار نے موبائل آف کر کے سوچنا شروع کیا۔ ثمامہ بھی کچھ ہی دیر میں تین چار کتابیں اٹھائے واپس آ گئی۔ سوار نے واپسی کا سفر کافی تیزی سے طے کرتے اسے گھر پہنچایا پھر ہوٹل آ کر آصف اور نوریز کو کچھ ہدایات دیں اور پیدل ہی ہاسپٹل روانہ ہو گیا۔ کمرا ڈھونڈنے میں اُسے دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ کنعان باہر کوریڈور میں کھڑی مل گئی۔ وہ تقریباً بھاگ کر اس کے نزدیک آیا۔

''کیسی طبیعت ہے سر کی؟''

''سو رہے ہیں، بہت تھک گئے تھے شام سے مسلسل بھاگ دوڑ۔ شاید دواؤں کا اثر بھی ہو۔''

''ڈاکٹرز اب کیا کہہ رہے ہیں۔''

''اب تو کافی تسلی دی ہے لیکن صبح تک انڈر آبزرویشن رکھنا بھی ضروری ہے۔''

''تو آئی سی یو میں کیوں نہیں؟''

''کہتے ہیں اس کی ضرورت نہیں، حالت

کنٹرول میں ہے۔"
"چلیں شکر ہے، یہ تو خوشی کی بات ہے۔" سوار نے بات کے دوران اردگرد دیکھا۔ "باقی سب کہاں ہیں۔اماں وغیرہ؟"
"اشفاق انکل اور دیا گھر واپس جارہے تھے تو میں نے اماں کو بھی بھیج دیا وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔"
"تو......آپ اکیلی ہیں؟" سوار متعجب ہوا۔
"مریض کے ساتھ ایک ہی بندے کو رکنے کی اجازت ہے۔" وہ آہستگی سے بتاتی سوار کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوگئی۔ رفیق سر سامنے لیٹے تھے۔کمرے میں دو بیڈ لگے تھے۔دوسرے بیڈ پر بھی ایک مریض سویا تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان کرسی پر بیٹھا تھا۔ بیچ میں آدھے حصے تک پارٹیشن لگی تھی لیکن سوار نے پھر بھی بے چینی سی محسوس کی۔ کمرے کی خاموشی میں بات کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے جلد ہی وہ باہر نکل آیا، کنعان بھی پیچھے آگئی۔
"آپ یہاں رات کو کیسے رہیں گی، ساتھ دوسرا مریض بھی ہے۔"
"کوئی بات نہیں، میں نے سونا تھوڑی ہے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے رات گزر جائے گی۔"
"نہیں آپ گھر جائیں، میں یہاں رکوں گا سر کے پاس۔"
"نہیں نہیں، آپ تکلیف نہ کریں سوار، اشفاق انکل بھی رکنا چاہتے تھے لیکن میں نے خود ان سے کہا کہ میں ابو کے ساتھ رہوں گی۔"
"میرے یہاں رکنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ اس کی اتنی لمبی بات کے جواب میں فقط اتنا بولا۔کنعان کی چلتی زبان نہ صرف یکلخت رُکی بلکہ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد سر نفی میں ہلا، سوار قائل نہیں ہوتا تھا، قائل کرلیتا تھا۔اگلی مرتبہ میں اس نے ہنس کر سر اثبات میں ہلایا۔
"آیئے، ڈاکٹر صاحب سے بات کرلیتے ہیں۔ میں پھر اشفاق انکل کو بلالیتی ہوں وہ مجھے لے جائیں گے۔"
"نہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، میں خود آپ کو چھوڑ آؤں گا۔" اس نے جیسے یہ بھی پہلے سے طے کرلیا تھا۔
"تو پیچھے ابو کے پاس......؟"
"سسٹر سے کہتا ہوں میرے آنے تک وہ مسلسل رکے گی۔ پھر وہ نوجوان بھی ہے نا کمرے میں۔اس کو تاکید کرکے جاؤں گا۔"
دونوں ساتھ ساتھ چلتے ریسیپشن تک آئے۔ ایک ڈاکٹر بھی وہیں موجود تھا کنعان نے ان سے کہا کہ یہ ان کا عزیز ہے اور رات کو اب یہیں مریض کے پاس رہے گا۔ اور فی الحال کچھ دیر کے لیے وہ اسے گھر چھوڑنے جارہا ہے۔ ڈاکٹر نے اسی وقت سسٹر کو رفیق احمد کے کمرے میں بھیج دیا۔
"چلیے۔موسم کافی خراب ہورہا ہے۔"
سوار نے باہر نکلتے ایک تشویش بھری نظر آسمان پر ڈالی، بارش تو برسا ہی چاہتی تھی، بلکہ سوار نے ہتھیلی آگے کی، ہلکی ہلکی پھوار کا آغاز ہوچکا تھا۔فضا میں ٹھنڈ اچھی خاصی تھی۔ستمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ہر گزرتا دن ٹمپریچر کو مزید ڈاؤن کررہا تھا۔اور بارش اس ٹھنڈ میں کچھ اور بھی اضافے کا باعث بن رہی تھی۔وہ دانستہ کنعان سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ کنعان کے پچھلے دنوں کے رُوڈ بی ہیوئر کی وجہ سے وہ اب بہت محتاط ہوگیا تھا اور کنعان کی سختی کو بھی اپنے لیے مثبت تصور کیا۔کچھ دن پہلے تک محبت بھی بنا سوچے دوسری ہر بات پر حاوی ہونے لگی تھی۔ایسے میں اگر خود کو نہ روک سکیں تو اگلے کے روکنے کو اپنے حق میں بہتر ضرور سمجھیں۔
کنعان نے موبائل نکال کر دیا کو کال کرنے کا ارادہ کیا تاکہ اپنی آمد کا بتاسکے کہ اسی وقت تیز بارش شروع ہوگئی۔ بارش کے موٹے موٹے قطروں میں شاید اولے بھی تھے۔سوار نے عجلت میں ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اس کے رکنے پر کنعان کے لیے پچھلا دروازہ کھولتے جھٹ پٹ خود بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کنعان نے بروقت ٹیکسی میسر آنے پر اللہ کا شکر

ادا کیا۔

"جی پی او سے بائیں ہاتھ کی طرف ہوٹل ازمیر۔" سوار نے ڈرائیور کو گائیڈ کیا۔

"ہوں۔ معلوم ہے۔" مسکراتی مبہم نگاہیں بیک ویو مرر میں کنعان پر ٹکی تھیں۔

اس کے انداز پر سوار کے ساتھ ساتھ کنعان بھی پہلی مرتبہ چونکی۔

"اوہ۔" جس ٹیکسی میں زندگی بھر دوبارہ کبھی نہ بیٹھنے کا تہیہ کیا تھا انجانے میں وہ نہ صرف اس کے اندر موجود تھی، بلکہ سوار کے ساتھ۔ کنعان نے گھبرا کر نظر ہٹالی۔ سوار نے ڈرائیور کے انداز کو نظر انداز کیا۔ سوچا ہوسکتا ہے وہ انہیں کسی حوالے سے جانتا ہو کیونکہ کنعان کے لیے اس کے انداز میں واضح شناسائی کا عنصر جھلکا تھا۔ جی پی او سے تھوڑا پہلے وہ بنا مزید کسی تصدیق میں پڑے بائیں ہاتھ کو مڑ گیا اور اسی روانی سے گاڑی چلاتے آگے بڑھنے لگا۔ سوار کو صاف یہی لگا کہ وہ ہوٹل ازمیر سے واقف ہے اس لیے کوئی ہدایات نہیں دیں لیکن یہ دیکھ کر سوار کی حیرت دوچند ہوگئی کہ ازمیر ہوٹل کا بورڈ آنے پر وہ بجائے وہاں رکنے کے آگے بڑھ کر خود ہی ٹیکسی کو گلی کی ڈھلان میں اتار لے گیا اور عین رفیق سر کے دروازے کے آگے بریک لگائی۔ شک کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ وہ کنعان وغیرہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی کنعان فوراً نیچے اُتر گئی، سوار نے اندر بیٹھے بیٹھے ہی رقم نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھائی۔

"اچھے گھر کے لگتے ہو باؤ۔ کس کے چکر میں پھنس رہے ہو۔" رقم ہاتھ میں لیتے ہی اس نے سوار کی جانب جھک کر کہا۔ چہرے پر بے ہودہ سی ہنسی اور آنکھوں میں شرارتی سی معنی خیزی تھی۔

"ہوں؟" سوار کا ہینڈل پہ رکھا ہاتھ وہیں رُکا۔ "کیا مطلب؟"

جاتے جاتے وہ پورا دوبارہ اس کی جانب مڑا۔ "کیوں اپنی عزت اور ایمان خراب کرنے پر تُلے ہو، ایسوں سے دور ہی رہنا چاہیے، گھر سے بھاگنے والیاں کیا اچھی ہوتی ہیں۔ تم بھی نکلوان کے چنگل سے۔"

وہ اعتماد سے مسکراتے سوار کے حواسوں پر بجلی گرا رہا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا گردن ہاتھ میں لے کر ابھی کے ابھی اس کا کام تمام کردے لیکن نجانے کیوں اس خبیث کے اعتماد نے کچھ بھی کہنے اور کرنے کی ہمت نہیں دی۔ بنا کوئی جواب دیے وہ باہر نکل آیا۔ بارش ابھی بھی جاری تھی۔ پہلے اس کا یہی ارادہ تھا کہ کنعان کو گھر کے دروازے پر اتار کر وہ اسی ٹیکسی میں واپس ہاسپٹل چلا جائے گا لیکن ایک تو ٹیکسی والے کا مشکوک انداز پھر اس کے آخری جملے، سوار مزید ایک لمحہ بھی اسکی فضول گفتگو نہیں سننا چاہتا تھا۔

ٹیکسی والا اب اپنی کار کو ریورس میں نکال رہا تھا۔ گلی میں ہیڈ لائٹ کی روشنی پھیلی تھی۔ سوار گلی کے دوسرے سرے پہ کھڑا ٹیکسی کے یہاں سے نکل جانے کا منتظر تھا۔ پیچھے جاتی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں پہلی مرتبہ اس نے غور کیا کہ کنعان گھر کا دروازہ بجانے کے بجائے چابی سے تالا کھولنے میں مصروف تھی۔ یہ بات اس کے لیے حیرت کا باعث تھی کیونکہ اس کے حساب سے اماں گھر پر تھیں۔ تو کنعان بند گھر کا تالا۔ ٹیکسی ڈرائیور کار نکال کر لے جا چکا تھا۔ گلی میں اب تیسرے گھر کے بیرونی بلب کی لائٹ سی روشنی پھیلی تھی۔ کنعان نے تالا کھول کر قدم اندر رکھے، ایک نظر اوپر برستی بارش کو دیکھا اور گردن پھیر کر سوار کو ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سوار کی حیرتیں جیسے آگ کے سمندر میں غوطہ زن تھیں۔ آسمان سے برستا یخ ٹھنڈا پانی بھی اس الاؤ کو کم کرنے میں ناکام تھا۔ پے در پے کے واقعات آج شاید اس کی جان لینے پر تُلے تھے۔

کنعان اندر داخل ہو کر اب جھنجھلاتے ہوئے اس پتھر کو بلا رہی تھی جو ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھا۔ بارش سوار کو پورا بھگو چکی تھی، اور وہ اپنے مکمل

بھیگے وجود سے یکسر لاپروا یہ سوچ رہا تھا کہ کنعان ایک غیر مرد کو اکیلے گھر میں آنے پر زور کیوں دے رہی تھی۔ عورت ذات کی معصومیت پر قائم ہوتا اس کا نیا نیا بھروسا ایک مرتبہ پھر ڈانواں ڈول ہونے لگا اور پھر خود کو ایک حتمی فیصلے پر یکسو کرتے سوار نے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔ اس حیرت بھری رات کی گرہیں بھی شاید اسی ایک رات میں ہی کھلنی ہیں۔ تو ڈراپ سین بھی دیکھ لیا جائے۔ دل سے ایک دعا البتہ پوری شدت سے نکلی کہ اے اللہ کنعان بھی جال بچھانے والیوں جیسی نہ نکلے ورنہ رگوں میں ابلتا اس کا غصہ آج خون کر دینے کی حد تک بلند ہو چلا تھا۔

کنعان کی محبت میں ہمکتا سوار کا دل بے شمار لمحوں میں بے تاب و بے قرار ہوا تھا، کبھی اسے دیکھ لینے کی تڑپ تو کبھی اس سے ہم کلام ہونے کی خواہش، لیکن وہ حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ اس معصوم چہرے کو دیکھتے اس کی محبت کبھی بھٹکنے کی حدوں کو نہیں چھو پائی تھی اور یقیناً سارا کریڈٹ کنعان کی معصومیت، اس کی شرافت اس کے اچھے گھر کے پروردہ ہونے کو جاتا تھا لیکن آج۔ جانے کس کھائی میں گرنے کی رات تھی کہ سوار کو لگتا یہ شاک اسے پھر زندگی بھر اپنے قدموں پہ کھڑا نہیں ہونے دے گا۔

☆☆☆

رشتہ ایک ہی ہوتا ہے، وہی نکاح کے چند بولوں کے نتیجے میں زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد لیے میاں اور بیوی کا۔

لیکن اُف یہ جذبات و احساسات کے کھیل۔ یہی رشتہ محبت کا اعتماد لیے ہوئے ہو تو اظہار کچھ الگ ہوتا ہے۔ مجبوری میں بندھا ہو تو انداز بھی لگے بندھے سے ہو جاتے ہیں۔ زندگی بھر کا ساتھ لیکن لاگ نہ لگاؤ۔ اپنا پن نہ مان۔ بیوی شوہر کی چہیتی اور منہ چڑھی ہو تو بات منوانے کا ڈھنگ ہی الگ ہوتا ہے۔ شازمہ کا دل ٹوٹا ضرور تھا لیکن محبت کا مان شاید ابھی باقی تھا۔ تبھی گمان گزرا کہ وقاص کی اصل خوشی اور اس کا سچا پیار ایک وہی ہے۔ نائلہ تو زبردستی کا بندھن تھا جسے بچوں کی وجہ سے نہ وقاص نگل سکتا ہے نہ اُگل۔ اور کاش کہ یہی سچ ہوتا۔

"تم نائلہ کو طلاق دے دو وقاص۔ ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے، کوئی پریشانی کوئی الجھن باقی نہیں۔"

"بس۔" آنکھوں پہ ہاتھ رکھے قریب لیٹے وقاص کے لبوں سے نہایت حتمی انداز میں وہ ایک چھوٹا سا لفظ کسی برف کے گولے جیسا شازمہ کے وجود سے ٹکرایا۔ وقاص کے لہجے کی سختی وہ تعجب سے اندر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی جب بازو آنکھوں سے ہٹا کر وقاص نے اپنی نظریں کسی سلاخ کی طرح شازمہ پر گاڑیں۔

"آج کہہ دیا۔ بس آج ہی ہمیشہ کے لیے یہیں دفنا دو اپنی خواہش کو۔ اور اگر یاد ہی رکھنا ہے شازمہ بیگم۔ تو ذرا اپنے ماضی میں لوٹ جاؤ اور یاد کرو اس وقت کو جب گھر سے بھاگ کر تم زبردستی میرے گلے پڑی تھیں۔ اور اگر بہت شوق ہے نا میرے اور نائلہ کے رشتے کو بار بار یاد کرنے کا تو اپنے اور میرے رشتے کو بھول جاؤ۔ میرے لیے زیادہ آسان ہو گا ایک درد بھری یاد کے سہارے جینا، بہ نسبت روزانہ کی اس چخ چخ کے۔" وہ چادر کھینچ کر بیڈ سے اتر گیا اور ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا اپنا چھوٹا موٹا سامان اپنی جیبوں میں منتقل کرنے لگا۔ شازمہ تڑپ کر پیچھے آئی۔

"کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟" اس نے گھبرا کر گھڑی دیکھی رات کے ڈیڑھ بجے وہ نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"کارخانے تو جا ہی سکتا ہوں۔" وقاص نے عجیب کرب انگیز نظروں سے شازمہ کی طرف دیکھا۔ "زندگی عذاب بن جائے تو بہادری بھی آ ہی جاتی ہے۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے شازمہ کہ تم نائلہ کے پاس جاتی ہو، یا اسے کیا کہتی ہو، میری محبت تمہاری نظر میں اتنی ارزاں ہے تو لگا دو اسے داؤ پر۔ بہت شوق ہو رہا ہے نا مجھے ڈبونے کا۔" اس نے کلائی سے

پکڑ کر شازمہ کو کھینچا اور چبھتی ہوئی نظریں اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔

"تو یاد رکھو شازمہ۔ ہاتھ تمہارے بھی کچھ نہیں آئے گا۔ بہتر یہی ہے تمہارے حق میں کہ اسی طور سے جینے کی عادت ڈال لو، فائدے میں رہو گی۔ تمہیں سوچنے کا وقت دیے جا رہا ہوں۔ دو دن ہیں جی بھر کر ہم دونوں کے نفع نقصان پر سوچ لو۔ میرے خیال سے تم اتنی احمق ہرگز نہیں ہو سکتیں کہ اپنا بھلا نہ پہچان سکو۔"

"مت جاؤ وقاص۔ ہم بات کرتے ہیں۔"

"ڈیونو شامے۔" وہ اس بار مڑا تو لہجے میں تحمل کے ساتھ ساتھ تمسخر بھی تھا۔ "ہمارے معاملے میں اب آر یا پار والی سچویشن ہو گئی ہے۔ اور میں اب ذہنی طور پر ہر نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ سمجھنے کی تھوڑی سی ضرورت صرف تمہیں ہے۔ اور اگر اب بھی نہیں سمجھیں تو سنو۔" اس نے دونوں شانوں سے پکڑ کر شازمہ کو سیدھا اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"اگر نائلہ کو تمہارے بارے میں علم ہو گیا تو تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال کر نائلہ سے معافی مانگ کر اسے منا لینا میرے لیے بہت آسان ہو گا۔ لیکن فرض کرو اگر وہ یہ حقیقت جان کر مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتی تو پھر تمہاری طرف بھی میرا لوٹنا ناممکن ہے۔ اس لیے چاہے تم دو دن کا وقت لو چاہے دو سالوں کا۔ تمہارے پاس تیسری مصالحت کی راہ کے سوا اور کوئی آپشن نہیں ہے۔ تم جتنے جلدی اس بات کو سمجھ جاؤ گی اتنا ہم سب کے حق میں بہتر ہو گا۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ اس کے کندھے چھوڑ کر فی الفور لمبے قدم لیتا کمرے اور پھر گھر سے بھی باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بارش کی شدت میں کمی آ چکی تھی لیکن ہلکی ہلکی اب بھی جاری تھی۔ سوار گھر کے اندر داخل ہو کر وہیں دروازے میں ہی رُک گیا تھا۔ کنعان اسے آگے بڑھتے دیکھ کر پہلے ہی برآمدے کے گلاس ڈورز کھول رہی تھی۔ اندر کا دروازہ کھول کر کنعان نے ہاتھ میں پکڑا سامان میز پر رکھا، پلٹ کر دیکھا تو سوار ابھی تک بیرونی دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ سخت متعجب سی واپس باہر آئی۔

"کیا کر رہے ہیں، اور کتنا بھیگنا ہے، اندر آئیں۔" گھر کا دروازہ اندر سے بند کرتے وہ اسے کلائی سے کھینچ کر برآمدے میں لے آئی۔

سوار نے اس کی بے باکانہ حرکت پر بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ اس کا الجھا بکھرا دل اس لمحے صرف محبت کے زیر اثر تھا اور یہ وہ مقام نہیں تھا جہاں محبوب کی دید اُس کی شوخیاں دل کو لبھا لیا کرتی ہیں، بلکہ یہ وہ مقام تھا جب کسی غیر متوقع جھٹکے کے تحت محبت اچانک نفرت میں بدل جایا کرتی ہے۔

وہ کنعان کے تھامنے پر اندر کھنچا چلا آیا تھا اور وہ اسے برآمدے میں لا کر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں واپس آئی تو اس نے اپنی گیلی شال کی جگہ ایک دوسری سبز شال اوڑھ لی تھی، سوار کے قریب آ کر اس نے تولیہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

"جلدی سے اپنے بال خشک کر لیں، میں آپ کو ابو کی شرٹ دیتی ہوں۔ آپ کی شرٹ کو پریس کرنا پڑے گا۔"

"یہ سب کیا ہے کنعان۔" سوار نے جھٹکے سے تولیہ تپائی پر پھینکا۔ "اماں کہاں ہیں؟" وہ آنکھوں میں انتہا کا غصہ بھرے کنعان کو دیکھ رہا تھا۔

"اماں تو دیا کے گھر ہیں، میں نے بتایا تھا ناں آپ کو۔"

"تو مجھے اندر کیوں بلایا، عقل سمجھ ہے کہ نہیں، دیا کو کال ملانے، اماں کو بلانے کے بجائے آپ مجھے تولیے پکڑا رہی ہیں، مر تو نہیں جاؤں گا ایک بارش سے۔" سوار کے اندر کا اُبال بالآخر پھٹ پڑا اب وہ بنا کوئی لحاظ کیے صاف صاف اسے لتاڑ رہا تھا۔

کنعان نے جواباً شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ سوار کو یہ حرکت بھی چوری پکڑے جانے والے مجرم سی لگی

لیکن نظر انداز کر کے پلٹنے لگا۔

"میں سر کے پاس واپس جا رہا ہوں، دیا کو کال کر کے اماں کو بلائیں۔ میں ان کے آنے تک باہر رکوں گا۔ یونہی اکیلا چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔"

"س......سوار......" کنعان نے اپنی پوری جان لگا کر بمشکل حلق سے اس کا نام نکالا، دل سکڑ کر گویا پورا ہی مٹھی میں بھینچ گیا تھا۔ کانپتا ہاتھ کنعان نے جیسے اپنے آپ کو ہمت دلاتے سینے پہ دھر لیا۔ سوار نے جب اس کے پکارنے پر پلٹ کر دیکھا وہ زور سے آنکھیں بھینچے نچلا لب دانتوں میں جمائے کھڑی تھی۔

"جی؟" وہ کچھ نہ سمجھتے بس متعجب سا اس کی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا آپ سے؟" کنعان نے خوب زور لگا کر اپنی طرف سے بڑے اعتماد سے آواز نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث ہلکا سا منمنا کر رہ گئی۔

"کیا مطلب؟" سوار اب قدرے تحمل سے رک کر بغور اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔

"وہ......کچھ کہہ رہا تھا آپ سے۔" کنعان کی زبان واضح لڑکھڑا رہی تھی۔

سوار کو صاف لگا اب کچھ باقی نہیں رہا۔ جب "ایسی" معتبر جگہ بے بھروسا ہو سکتی ہے تو پھر اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے، پھر ہم سب کی آنکھوں پر فریب کے پردے ہیں، پھر ہم سب ہی کالے چور ہیں۔

"جی ہاں کہہ رہا تھا اور آپ ہی کے متعلق کہہ رہا تھا، اور اب یہ مجھے آپ بتائیں کہ وہ آپ کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے۔" سوار اب بالکل متحمل تھا۔

"م......میں نہیں جانتی اس نے کیا کہا ہوگا۔ لیکن جاننا چاہتی ہوں۔" وہ ابھی بھی سر جھکائے کھڑی تھی اور انتہا کی نروس تھی۔ کنعان کا رویہ ناقابل فہم تھا، وہ جتنی شریک تھی اِس معاملے میں اتنا ہی خود کو انجان بھی ظاہر کر رہی تھی۔

"آپ کیسے جانتی ہیں اس ٹیکسی والے کو؟"

"نہیں جانتی۔" کنعان نے آنکھ کا کنارا ہتھیلی سے رگڑتے بے اختیار کہا۔ اور سوار نے پہلی مرتبہ غور کیا کہ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"تب تو بات ہی کوئی نہیں۔ اللہ حافظ۔" وہ سختی سے کہہ کر فوراً پلٹ گیا۔

"نہیں۔" کنعان تیزی سے بھاگ کر نہ صرف قریب آئی بلکہ بے اختیار اس کی گیلی شرٹ کو بازو سے چھوا۔

"آپ کو قسم ہے سوار، آپ بنا بتائے نہیں جائیں گے۔ پلیز، مجھے جاننا ہے اس آدمی نے آپ سے کیا کہا۔" وہ باقاعدہ اس کی منت سماجت پر اتر آئی تھی۔

سوار نے خود بھی پہلی مرتبہ انتہا کی مشکل محسوس کی۔ نجانے وہ اسے کس کڑے امتحان میں ڈالنے والی تھی۔ سوار نے ایک سرد آہ کھینچ کر اسے ٹیکسی ڈرائیور کی باتیں حرف بہ حرف بتا دیں۔

"نہیں۔" وہ ایک شاک کی کیفیت میں دو قدم پیچھے ہوئی۔ "یہ جھوٹ ہے، میں بری نہیں ہوں، میں کبھی گھر سے نہیں بھاگی، میں گھر سے بھاگ ہی نہیں سکتی۔" وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتی کرسی سے ٹکرائی اور کرسی کا کونا تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرا دیے وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

سوار نے پریشانی سے لب کاٹے۔ ایسی صورت حال کا تو اس نے اندازہ بھی نہیں کیا تھا۔ جانے کیا ہو گیا تھا کنعان کو آج۔ اور پھر آدھی رات کو اس کی اکیلے یہاں موجودگی۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا، کچھ بھی نہیں۔ بیک وقت سوار کا ذہن کئی اطراف میں دوڑ رہا تھا لیکن وہ......وہ کیوں ہر بات سے بے نیاز ایک اسی ٹیکسی ڈرائیور کے مدعے پر جمی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی سوار وہ "مجھ" پر انگلی اٹھائے گا وہ تو......وہ تو......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر رونے لگی تھی۔

"تو آپ کیا سوچ رہی تھیں کنعان۔ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ سکتا ہے یا کہہ چکا

ہے۔"

"میں آپ کو ہر بات بتاتی ہوں سوار۔ پلیز، آپ میری بات سنے بغیر مت جائیے۔" وہ آنسو صاف کرتے ایک جذب سے اٹھی۔

"لیکن اس وقت......" سوار کنفیوژ ہوا۔ "وہاں سرا کیلے ہیں کنعان اور پھر یہاں اس طرح اکیلے، آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ یہ کتنا آکورڈ......"

"میں نے آپ کو جان بوجھ کر اندر بلایا تھا سوار۔ مجھے واقعی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آپ سے کچھ غلط کہہ چکا ہے، کچھ ایسا جو ہمارے بارے میں صرف وہی جانتا ہے، لیکن آج اگر آپ اس کی آدھی ادھوری بات سن کر اپنے دل میں کوئی بدگمانی لیے چلے جاتے تو میرے لیے یہ رات گزارنا مشکل ہو جاتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے کنعان۔ میں آپ کے متعلق کبھی کچھ غلط نہیں سوچ سکتا۔ میں جانتا ہوں ناں آپ کو۔"

سوار کا دل بھی اس کے آنسوؤں میں موم ہونے لگا، پھر وہ بھی تو یہی چاہتا تھا کہ کنعان کبھی غلط ثابت نہ ہو، اور وہ پریشان تھی اس کے سامنے غلط ثابت ہونے پر، وہ ہر قیمت اسی رات میں اپنی صفائی دینا چاہتی تھی، اس کی نظروں میں بلند ہونا چاہتی تھی، یقیناً اسے کسی لائق سمجھتے ہوئے، پھر سوار سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ ایسا ایک دن اس کی زندگی میں بھی تو آ سکتا ہے، بلکہ یقیناً آئے گا جب سوار کو کھڑا ہونا ہوگا کنعان کی عدالت میں۔ تب شاید وہ سر اٹھا کر اپنی صفائی بھی نہ دے سکے، محض سر جھکا کر جرم قبول کرنے کی مہلت میسر آئے وہ ایک سرد آہ کھینچ کر حال میں واپس آیا۔

"میں سن رہا ہوں کنعان۔ جو مجھے آپ بتائیں گی میں صرف اس پہ بھروسا کروں گا۔"

"سوار آپ بالکل بھیگ گئے ہیں اور یہاں برآمدے میں ٹھنڈ بھی بہت ہے۔ آپ......" اس نے ذرا دیر رک کر سوچا۔ "آئیں کچن میں چلتے ہیں۔" وہ بنا اس کی سنے کچن میں آ گئی۔ کمرے کا دانستہ نہیں کہا کیونکہ جانتی تھی سوار غصے میں آ جائے گا۔ کچن میں آ کر اس نے دونوں چولہے آن کر لیے۔ ایک سوار کے ہاتھ سینکنے کے لیے چھوڑ کر دوسرے پر کیتلی میں چائے چڑھا دی۔

"یہ آج سے چار سال پرانی بات ہے، میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ رامین باجی مجھ سے پانچ سال بڑی ہیں وہ ابھی ابھی گریجویشن کر کے ان دنوں گھر پر تھیں......"

☆☆☆

موسم سرما کی وہ ایک ٹھنڈی سہ پہر تھی۔ کنعان بنا ٹھنڈ کی پروا کیے ان دنوں گھر کا کونا کونا صاف کرنے میں جتی تھی۔ نویں جماعت کی اس کم عمر معصوم بچی کے لیے گھر کی وہ پہلی پہلی شادی اپنے اندر ایک عجیب سی جذباتی کشش اور ہیجان لیے ہوئے تھی۔ امی کبھی ابو کے ساتھ شام میں تو کبھی دیا کی امی کے ساتھ دن کو مارکیٹ کے چکر لگا کر ماہین کی شادی کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ باجی کو وہ کوئی بھی کام کرنے نہیں دے رہی تھی۔ مری میں ویسے بھی سرما کی چھٹیوں کا آغاز ہوا تھا اس لیے وہ خود اکیلی ہی گھر چمکانے میں لگی تھی۔

"کنعان...... کنعان......" امی کی دیوانہ وار چیختی آواز نے کنعان کے ہاتھ پیر پھلا دیے۔ وہ اس وقت بک ریک میں کتابیں ترتیب سے سیٹ کر رہی تھی۔ امی کی آواز پر کتابیں وہیں پھینک کر وہ بنا دوپٹے کے دوسرے کمرے کی طرف دوڑی۔ فوری طور پر بس اتنا سمجھ میں آیا کہ امی کسی تکلیف میں ہیں۔ وہ جب ہانپتی ہوئی دوسرے کمرے میں داخل ہوئی وہ ماہین کے پلنگ پر ہاتھ میں ایک کھلا پیپر لیے ساکت سی بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا امی۔ کیا بات ہے۔" وہ بھاگ کر ان کے نزدیک آئی۔ ابھی پیپر پہ ایک نظر ڈالی ہی تھی کہ امی نے بالوں سے کھینچ کر کنعان کو اپنے نزدیک کیا۔ کنعان کا دل امی کی حرکت سے دھک رہ گیا۔ وہ حیرت سے کھلا منہ لیے ان کو دیکھ رہی تھی جن کی

آنکھوں میں انتہا کا غضب اور درد بھرا تھا۔
"ماہین کہاں گئی ہے کنعان؟ کس کے ساتھ گئی ہے۔ تمہیں ضرور پتا ہوگا۔ بولو کنعان بولو۔" وہ اور زیادہ شدت سے اس کے بال کھینچ رہی تھیں۔ درد کے مارے کنعان کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا، لیکن اس نے پروا کیے بنا اس مرتبہ پیپر امی کے ہاتھوں سے جھپٹا، بات شاید کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔
"میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ جسے آپ نے میرا جیون ساتھی چنا ہے مجھے وہ ہرگز پسند نہیں، اور جو مجھے پسند ہے، میں جانتی ہوں وہ آپ کو قطعی نامنظور ہوگا۔ اس لیے مجھے ہمیشہ کے لیے اجازت دیجیے۔ آپ کی نافرمان بیٹی ماہین۔"
"بولو کس کے ساتھ بھاگی ہے ماہی۔ بولو کنعان۔" امی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ کنعان بمشکل خود کو چھڑوا کر کچن میں آئی، ان کے لیے پانی کا گلاس بھرا اور دوڑ کر واپس آئی۔ زبردستی گلاس ان کے منہ سے لگا کر دو گھونٹ پانی پلوائے اور ان کا سر اپنے سینے سے لگا کر نرمی سے سہلایا۔
"پلیز۔ خود کو کنٹرول میں رکھیں، سب صحیح ہو جائے گا۔ آرام اور تسلی سے سوچیں۔ آپ کی قسم مجھے کچھ پتا نہیں کہ باجی کہاں گئی ہیں یا کس کے ساتھ گئی ہیں۔ آپ پلیز حوصلے سے سوچنے اور سمجھنے دیں۔" امی کو تسلی دیتے بھی کنعان کا دماغ طرح طرح کی سوچوں میں غلطاں تھا۔ اس پورے حادثے پر کس انداز میں کام شروع کرنا تھا اور کہاں سے۔ وہ ساتھ ساتھ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔
"تم نے ماہی کو آخری بار کب دیکھا کنعان؟ میں تو ابھی مارکیٹ سے آئی ہوں۔" انہوں نے بے چینی سے استفسار کیا۔
"ابھی کچھ دیر پہلے تو یہی تھیں۔ کنعان کا کو یک لخت محسوس ہوا کہ انہیں جو بھی کرنا ہے بہت جلد اور ابھی ابھی کرنا ہے۔"
"ابھی کچھ بیس منٹ پہلے وہ یہاں آئیں۔ مجھے کام میں مصروف دیکھ کر چپ چاپ واپس چلی گئیں۔ شاید اسی ٹائم ہی وہ گھر سے باہر۔" کنعان کا دل اب زور زور سے دھڑکنے لگا تھا لیکن وہ اپنی اندرونی کیفیت امی پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"امی ہمیں باجی کو ڈھونڈنے نکلنا ہوگا۔"
"تمہارے ابو۔" وہ پریشان سی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کنعان نے ماں کی طرف دیکھا، دونوں کے ذہن میں ایک ساتھ ایک ہی خیال آیا۔ رفیق احمد آج مظفر آباد رشتہ داروں کو شادی کا بلاوا دینے گئے تھے۔ تو یعنی ماہین نے جان بوجھ کر ایسے دن کا انتخاب کیا تھا جب باپ بھی گھر پر نہیں تھا۔
"چلیں امی، وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"
کنعان نے دوڑ کر الماری سے اپنی اور امی کی چادر نکالی، صفیہ نے کانپتے ہاتھوں سے پرس سنبھالا۔
"کنعان ہم اس کو ڈھونڈنے کہاں جائیں گے؟ اس کی سہیلیوں کے گھر جا کر کیا کہیں کہ......"
"کسی کے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بتا کر گئی ہے کہ کسی لڑکے کی خاطر......تو وہ ضرور مری سے باہر جانے کی کوشش کرے گی کہ تاکہ مری کے اندر ہم اسے ڈھونڈ نہ لیں۔ ہم بس اسٹینڈ جائیں گے سیدھا۔" کنعان نے انہیں اپنا فیصلہ سناتے تالا اور چابیاں اٹھائے۔
صفیہ بیگم نے تعجب سے کنعان کو دیکھا۔ ان کی چھوٹی سی بچی کتنی بیدار مغزی کا ثبوت دے رہی تھی جبکہ ان کا دماغ قطعی طور پر ان کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اور کنعان کی بات سن کر پہلی مرتبہ دل نے کچھ حوصلہ سا محسوس کیا کہ شاید اندھیرے میں سہی، ہاتھ ٹٹولنے پر انہیں ان کی ماہین واپس مل ہی جائے گی۔
گھر سے نکل کر پچھلے راستے سے دونوں بس اسٹینڈ کی طرف تیز قدموں سے چلنے لگیں۔ قسمت نے یاوری کی اور ٹیکسی بھی جلدی میسر گئی۔ ٹیکسی والا روانہ ہوا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگیں۔ جس وقت وہ دونوں بس اسٹینڈ پہنچیں وہاں خوب رش تھا۔ جانے کہاں کہاں کی بسیں ویگنیں اور

کوسٹرز تیار کھڑی تھیں۔ کنعان کا پہلی نظر میں دماغ چکرا سا گیا۔ ایسے رش میں ماہین کو کیسے ڈھونڈا جا سکتا تھا جبکہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں آئی بھی تھی یا نہیں۔ کنعان کو یہاں تک بس ایک ہی خدشہ کھینچ لایا تھا کہ اگر وہ شہر سے باہر جانے والی ہے تو موقع پر پہنچنا از حد ضروری ہے، کہیں جو ایک بار مری سے نکل گئی تب ڈھونڈنا تقریباً ناممکن تھا۔

کنعان نے امی کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ ان کی حالت کنعان سے زیادہ غیر تھی۔ انہیں شاید حقیقی چکر آرہے تھے۔ کنعان نے نکلنے کے لیے تیار کھڑی کوسٹرز کو ایک نظر دیکھا اور پھر امی کا بازو تھام کر ایک چائے کے ڈھابے کے بیرونی بنچ پر بٹھایا۔

''آپ پلیز یہاں بیٹھیں۔ میں خود دیکھ کر آتی ہوں۔'' وہ سمجھ گئی کہ امی کو ساتھ ساتھ لیے پھرنا سراسر حماقت ہوگی۔ الٹا ہوسکتا ہے وہ ماہین کو بھی ہاتھ سے نکال بیٹھے۔

انہیں زبردستی بٹھا کر بنا ان کی کوئی بات سنے وہ بھاگ کر رش میں گھس گئی۔ ایک بس کنعان کے دیکھتے ہی دیکھتے روانہ ہوگئی تھی اور دوسری نے دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کردیا تھا۔ کئی دوسری بسیں اور ویگنیں بھی مسافروں کو بھرنے میں مصروف تھیں۔ لیکن وہ جاتی بسیں۔ کنعان نے بنا سوچے اس دوسری جاتی بس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتے وہ پاگلوں کی طرح سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ آتے جاتے لوگ بھی ایک لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر رک گئے تھے۔۔ کنڈیکٹر کو معلوم نہیں کسی نے اشارہ کیا تھا یا اس نے خود پیچھے مڑ کر کنعان کو دیکھا تھا بہرحال اس نے بس رکوادی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ دھیرے دھیرے ریورس میں آنا شروع کیا۔ ایک لڑکی کی ایسی حواس باختگی نے انہیں بھی پریشان کردیا تھا۔ کنعان ہانپتی کانپتی بس تک پہنچی اور دروازہ کھلنے پر اندر داخل ہوگئی۔ مسافر چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ کنڈیکٹر اور ڈرائیور سوال پوچھ رہے تھے اور اس کی متلاشی نگاہیں ایک ایک مسافر میں کسی آشنا چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

''دو سیٹیں خالی ہیں پیچھے۔ بیٹھ جاؤ بی بی۔''

''نن..... نہیں..... نہیں.....'' وہ گھبرا کر پلٹی، ڈرائیور تو اسے بھی کوئی مسافر سمجھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے نیچے اتر گئی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر شاید پیچھے گالیاں دے رہے تھے لیکن کنعان کا دماغ ماہین باجی میں اٹکا تھا وہ اس بس میں نہیں تھی۔ کنعان نے نیچے اتر کر آگے بل کھا کر نیچے اُترتی سڑک کو دیکھا۔ اس بس سے پہلے نکلنے والی ایک دوسری بس اب کافی آگے نکل چکی تھی اور پہاڑی کا موڑ کاٹ کر بل کھاتی دوبارہ دکھائی دینے لگی تھی۔ کنعان نے یونہی ایک حسرت بھری نظر اس کوسٹر پر ڈالی اور نگاہیں وہیں ساکت ہو کر رہ گئیں۔ نیلے اور پنک دوپٹے کی کھڑکی سے دکھائی دیتی جھلک..... وہ..... وہ بلاشبہ ماہین باجی کا دوپٹا تھا۔ وہ اسی ڈریس میں تو اس کے کمرے میں۔

باجی مل گئی تھیں۔ ان کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خوشی سے روتے روتے ہنس پڑی۔ سڑک کے کنارے اکیلی کھڑی وہ اس ہاتھ سے نکلتی خوشی پر بے اختیار آنسو بہانے لگی۔ وہ امی کو بتانا چاہتی تھی کہ باجی مل گئیں۔ لیکن باجی کی لمحہ لمحہ آگے بڑھتی بس اب اس کی خوشی کو مایوسی میں بدل رہی تھی۔ کنعان نے آگے پیچھے عجلت میں دیکھا۔ کاش وہ اس دوسری بس میں بیٹھ ہی جاتی۔ اور..... پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف سے ایک ٹیکسی آتی دیکھ کر کنعان فوراً سڑک کے بیچوں بیچ آگئی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر اس نے زبردستی ٹیکسی کو روکا اور بنا کچھ بھی طے کیے ٹیکسی کے رکتے ہی فوراً اس میں بیٹھ گئی۔

''بھیا ایک بس کا پیچھا کرنا ہے۔ خدارا جلدی سے بھگائیں۔''

''ارے لیکن.....''

''پلیز بھیا۔ دیر ہوجائے گی۔ میں آپ کو منہ

مانگی رقم دوں گی۔ پلیز جلدی ٹیکسی دوڑائیں۔"
کنعان نے ٹیکسی والے کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے اور زمانہ شناس شاطر ٹیکسی ڈرائیور نے اس مرتبہ مسکراتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ کنعان کی نشان دہی پر اب وہ مطلوبہ کوسٹر کے پیچھے پوری طاقت سے اپنی ٹیکسی دوڑا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی تیز رفتاری کے باعث درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا اور اب وہ بس کے متوازی چلتے کچھ ہی دیر میں اس سے آگے نکل آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور واقعی ایک ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے آگے نکل کر ہاتھ ٹیکسی سے باہر نکال کر رومال لہرایا۔ اس کا مسلسل بس کے آگے آگے ہونا ویسے بھی ڈرائیور کو چونکا گیا تھا۔ رومال لہرانے پر دونوں نے رفتار کم کرتے بس اور ٹیکسی روک دیں۔

ٹیکسی رکنے پر کنعان تیزی سے باہر نکل کر بس کی طرف بھاگی۔ کنڈیکٹر دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا تھا۔ کنعان اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر فوراً بس میں سوار ہوئی۔ چھ سات رو پیچھے کی ایک کھڑکی والی سیٹ پر ماہین باجی حیرت سے گنگ بیٹھی کنعان کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ آس پاس کے مسافر بھی اچانک بس رکنے اور ایک لڑکی کے سوار ہونے پر مکمل اسی جانب متوجہ تھے۔ کنعان نے نزدیک جا کر باجی کا بازو تھاما اور پیروں میں رکھا ان کا بیگ اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"چلیں۔ امی ہاسپٹل میں ہیں۔" آہستہ آواز میں دبے دبے رعب سے کہتے وہ زبردستی بازو سے کھینچ کر انہیں باہر نکال لائی۔ اور ماہین اس وقت شاید اتنی شدید حیرت اور اندر کی ملامت میں گھری تھی کہ بنا مزاحمت میں پڑے چپ چاپ نیچے اتر آئی۔

"آپ بس روانہ کریں۔ انہوں نے نہیں جانا۔" کنعان نے کنڈیکٹر کو مطلع کرتے ماہین کو ٹیکسی کی طرف کھینچا، ایک اور کنڈیکٹر بڑبڑ کرتا بس میں سوار ہوگیا اور ان دونوں کا اسی ٹیکسی میں واپسی کا سفر شروع ہوا۔

ماہین اور کنعان کے بیچ بات بھی کوئی نہیں ہوئی اور ماہین سارے راستے روتی آئی۔ بس اسٹینڈ واپس پہنچے تو اس کی امی کو ایک عورت کندھے پر سہارا دیے ان کا گال تھپتھپا رہی تھی۔ ایک آدمی پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ کنعان بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر ان تک پہنچی اور فوراً ہی امی کو لیے ٹیکسی میں آبیٹھی۔ اور اس پورے واقعے میں شاید یہی کنعان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسے کسی بھی طرح بس اسٹینڈ پر ہی اس ٹیکسی والے سے پیچھا چھڑوا لینا چاہیے تھا تاکہ جو شخص ان کے راز سے آگاہ ہوگیا تھا کم از کم ان کے گھر کے متعلق تو نہ جان پاتا لیکن امی کی بے ہوشی نے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔ وہ امی کو ساتھ لیے اسی ٹیکسی والے کے ساتھ گھر واپس آئے۔ راستے میں امی کو ہوش بھی آگیا اور ماہین کو سامنے پا کر انہوں نے بے یقینی کی کیفیت میں اسے گلے لگالیا تھا۔ دونوں ہی رو رہی تھیں۔ صفیہ کے جذباتی جملوں پر کنعان نے گھبرا کر بے ساختہ ٹیکسی والے کو دیکھا تھا جو اپنی چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں میں انتہا کی شرارت لیے ان باتوں کا لطف لے رہا تھا۔ کنعان کو پہلی مرتبہ تب شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ لوگ ہوٹل ازمیر کے سامنے سے ہوتے اپنی گلی میں مڑ رہے تھے۔

☆☆☆

"ماہین باجی باعزت گھر واپس آگئی تھیں۔ ابو واپس آئے تو امی نے انہیں بھی سارا ماجرا کہہ سنایا اور ین کر ان کی پریشانی بھی کچھ نئے سرے سے بڑھی تھی۔ باجی کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ ہم سب نے وہ ایک ہفتہ سولی پر لٹکتے گزارا۔ باجی کو ایک پل کے لیے بھی نظروں سے جدا نہ کیا جاتا۔ گھر کو امی اندر سے تالا لگا کر رکھتیں۔ وہ واش روم جاتیں تو مجھے باہر پہرا دینا ہوتا۔ شادی کے دن تک وہ جیسے کسی جیل میں بند قیدی کی طرح اس گھر میں رہیں۔ اب اللہ

جانے یہ رویہ ٹھیک تھا یا نہیں۔ لیکن ان دنوں ناگزیر ہو گیا تھا۔

ماہین بالکل چپ اور پتھر ہو چکی تھی۔ کسی نے اس سے سوال نہیں کیا کہ وہ کس کی خاطر گھر سے بھاگ رہی تھی اور اب واپس آ کر کیا سوچ رہی تھی۔ جو اس نے کیا کسی سے پوچھ کر کسی کے دل کی پروا نہ کر کے کیا تھا اور اب جو کچھ ابو کر رہے تھے وہ ماہین کے دل کی پروا نہ کرتے اس سے کچھ نہ پوچھ کے کر رہے تھے۔ بالآخر شادی کا دن آیا، ابو نے چپ چاپ ماہین کو اعجاز بھائی کے ساتھ رخصت کر دیا اور وہ بھی چپ چاپ یہاں سے چلی گئیں۔ کون کس کی نظروں میں شرمندہ ہوا میں آج تک سمجھ نہیں پائی۔ اور رہ گیا وہ ٹیکسی والا۔ کنعان نے ایک آہ بھر کر سوار کی طرف دیکھا۔ ''تو ہماری بدنصیبی اپنے بچے کھچے نشان ابھی باقی چھوڑ گئی تھی۔

باجی کی شادی کے دو ماہ بعد کی بات ہے میرے اسکول میں فیئر ویل پارٹی تھی۔ ہم لوگ دسویں جماعت کو الوداعی پارٹی دے رہے تھے۔ میں گھر پر بتا کر گئی تھی کہ آج ہم ڈیڑھ دو گھنٹہ لیٹ آئیں گے لیکن امی ان دنوں بہت عجیب سی ہو چکی تھیں۔ باجی والے واقعے کے بعد بیمار بھی بہت رہنے لگی تھیں۔ مجھے کالج میں دو گھنٹے اوپر ہوئے تو وہ خود پیچھے آ گئیں۔ مجھے کالج سے لیے باہر آئیں اور ایک مرتبہ پھر ہم دونوں اس ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھیں۔ اس کا حلیہ پہلے سے کچھ الگ تھا شاید اس لیے میں پہلی مرتبہ میں پہچان نہیں پائی۔ بہرحال امی اپنی لہر میں سارا راستہ دیر ہو جانے پر مجھے ڈانٹتی آئی تھیں۔ ٹیکسی والا ایک مرتبہ پھر مسکرا رہا تھا۔ امی کے الفاظ اور میری پارٹی کی تیاری نے اس مرتبہ سراسر اسے غلط فہمی میں ڈالا، وہ سمجھا کہ میں بھی شاید کچھ غلط کر بیٹھی ہوں۔ اس کے بعد جب کبھی اس سے سامنا ہوا وہ ٹیکسی روک کر بیٹھنے کی آفر کرتا، مسکرا مسکرا کر مجھ سے اپنی آشنائی جتاتا، غیر ضروری سوال کر کے پریشان کرتا۔ میں باہر نکلتے وقت جتنا اس سے سامنے کے خیال سے خوف زدہ رہتی ہوں اتنا یہ میرے راستوں میں کھڑا ملتا ہے۔'' کنعان نے ایک سرد آہ کھینچتے سوار کو دیکھا۔

''اور میری امی۔ وہ تو تین ماہ بعد ہی ہمیں چھوڑ گئی تھیں۔ باوجود اس کے ماہین باجی اب اپنے گھر بار والی ہو گئی تھیں اور کسی کو اس حادثے کی کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ ہم امی کے ڈر خوف ختم نہ کر سکے۔ آخری دنوں میں وہ مجھے پاس بٹھا کر سمجھاتی رہتی تھیں۔'' کنعان اپنی آنکھیں صاف کرتے بتاتی چلی گئی۔

''میرے بعد تم بہت اکیلی پڑ جاؤ گی کنعان، اور اکیلی راہیں بہت گمراہ کرتی ہیں۔ اپنے قدموں کو صحیح سمت میں ڈالنا، باپ کا سر نہ جھکنے دینا، وہ برداشت نہیں کر پائے گا جیسے مجھے ختم کر ڈالا ہے تمہاری بہن نے۔''

''اور میں کبھی گھر سے نہیں بھاگی سوار، میری ماں جس صدمے سے مر گئی، میں کبھی وہ کام نہیں کر سکتی، وہ ٹیکسی والا ہمیں برے گھر کی بری لڑکیاں سمجھتا ہے، گھر سے بھاگنے والی، ڈیٹس پر جانے والی، دوستیاں کرنے والی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ ایک دن آپ کو......'' کنعان کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ''وہ کبھی آپ سے ملے گا، آپ کو میرے خلاف بھڑکائے گا۔ میری زندگی میں ایک دن مجھے ایسا بھی دیکھنا پڑ سکتا ہے۔

وہ ہتھیلی سے بار بار اپنی آنکھیں صاف کرتی جا رہی تھی اور آنسو متواتر اسی رفتار سے بہہ بہہ کر اس کا چہرا بھگو رہے تھے۔ وہ آج بول رہی تھی اور شاید اپنے اندر کی ساری گھٹن برسوں بعد پہلی مرتبہ کسی کے سامنے نکال پائی تھی۔ اپنی امی کو یاد کر کے آج جیسے وہ پہلی مرتبہ ماں کے مرنے کا سوگ منا رہی تھی، برسوں جیسے خود سے بھی یہ غم چھپاتی آئی ہو۔

''میں امی کی موت کا دن کبھی نہیں بھول سکتی، وہ دن جب اس دنیا کا سب سے قیمتی سب سے خوب

صورت سب سے قریبی رشتہ میری سگی بہن کی بدولت مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا لیکن میں نے اپنی بہن کو پھر بھی معاف کر دیا کیونکہ وہ نادم تھی اپنے کیے پر، اور وہ بھی اندر سے اتنی ہی دکھی ہے جتنی کہ میں، امی اپنے آخری دنوں میں میرا ہاتھ تھام کر مجھ سے وعدہ لیتی تھیں کہ محبت میں کبھی مت پڑنا کنعان، یہ تباہ کر دیتی ہے، بھٹکا دیتی ہے اچھا برا سجھائی دینا بند ہو جاتا ہے، کاش کہ میں نے اپنے وعدوں کا مان رکھا ہوتا۔" کنعان کہتے کہتے ایک دم رُکی، جہاں سوار اس کے آخری جملے پر یکدم چونکا تھا کنعان خود بھی بری طرح بوکھلائی تھی۔ دھیان بٹانے کو فوراً ہی چائے کی کیتلی کو اٹھا لیا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ چائے وغیرہ پینے کا ٹائم نہیں ہے۔" سوار نے گھڑی دیکھ کر کہا تو کنعان نے کیتلی فوراً واپس رکھ دی جیسے یہی چاہتی ہو کہ سوار یہاں سے چلا جائے۔ سوار نے اس کی بے ساختہ حرکت پر مسکراہٹ ضبط کی۔

"تو یعنی میں جاؤں؟" لہجہ اور چہرا ایک دم سنجیدہ تھے۔ کنعان نے ہڑبڑا کر چائے کا کپ اور کیتلی دوبارہ اٹھا لیے۔ وہ اس وقت انتہا کی حواس باختہ تھی۔

سوار نے بغور اس کی بدلتی کیفیت کا جائزہ لیا اور اس کے کچھ دیر پہلے کے جملے پر غور کیا۔ شک کی بھلا کیا گنجائش تھی۔ پیچھے بہت دیر تک بھلے وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ اسے رفیق سر کے قریب ہونے کے حوالے سے اور ہاں اکیڈمی میں بحیثیت کولیگ ایک ساتھ کام کرنے کے حوالے سے اپنا کردار اس کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونے دے سکتی تھی لیکن بہت دیر ہوئی اس کے انداز نے خود ہی اس کی نظروں کے آگے سے دھند سا چھٹنے لگے تھے۔ کنعان کا لہجہ صفائی دیتا سا نہ تھا بلکہ کسی بہت اپنے کو بدگمانی سے بچانے جیسا تھا۔ وہ جس ماحول میں جس دوست دار لہجے میں اس سے اپنے دل کی ہر بات بڑی روانی سے کہے جا رہی تھی وہ کنعان جیسی اچھی لڑکی کا کسی غیر کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر وہ آخری جملہ جسے ادا کر چکنے کے بعد اس کی گھبراہٹ نے مزید پختہ کر دیا تھا۔

"میں جاؤں کنعان؟" سوار نے اپنا جملہ دہرایا کیونکہ کنعان بنا جواب دیے چپ کی چپ کھڑی تھی۔ وہ جانتا تھا اب وہ اسے بھیجنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی، یہ اور بات کہ اب اس کے اپنے لیے جانا مشکل ہو رہا تھا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب؟"

"پہلے کبھی نوبت ہی نہیں آئی تو۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"کیوں نوبت نہیں آئی۔" وہ رسان سے کہے گیا۔ "ناظمہ میم کو سرپرائز دینے کی شام، اس روز ہوٹل کے سامنے، پارسل بناتے ہوئے۔" وہ اسے ہر وہ موقع یاد دلا رہا تھا جہاں ان دونوں کے علاوہ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ کنعان نے کچھ نہ سمجھتے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"اُس وقت۔ کیسے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور وہ اسی گہری سنجیدگی سے بڑے ہی جتاتے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو خود سمجھو۔

کنعان نے دوبارہ غور کیا، جو مواقع سوار نے بتائے ان سب پر امی اور ٹیکسی ڈرائیور والی باتیں تو کہنے کی نہیں تھیں تو سوار کس بارے میں کہہ رہا تھا۔ کنعان کے لیے اب سمجھنا مشکل نہیں تھا، اس کا بے ساختہ سر جھکا، وہ اس کے آخری جملے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ وہ انجانے میں بہت بڑی بات کہہ گئی تھی۔ "کاش" کا لفظ بتا تا تھا کہ جس بات کے ہونے سے وہ ڈر رہی تھی وہ ہو چکی تھی۔ اور کنعان کے وعدے کا مان کس کی وجہ سے ٹوٹا تھا اس کی ہڑبڑاہٹ سے ظاہر تھا۔

"محبت گمراہ نہیں کرتی کنعان، نہ تباہ کرتی ہے۔ تباہ وہ سوچ کرتی ہے جسے خود اپنے ہی ہاتھوں بے لگام کر دیا جاتا ہے۔ مان محبت کے ہو جانے سے

نہیں ٹوٹتا، محبت تو خوب صورتی ہے اس جہان کی۔ ہاں اس محبت کو غلط سمت میں لے جانے سے ٹوٹتا ہے۔ خود کو الزام مت دو، اور نہ پچھتاؤوں میں گھرنے کی ضرورت ہے، اگر تم نے وہ جملہ ''اُسی'' سے کہا ہے جس کے لیے کہنا تھا تو شاید یہ اس کے انتظار کا ثمر ہو۔''

''جی؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے اسے غائب دماغی سے دیکھے گئی۔ سوار نے ہلکا سا مسکرا کر سوالیہ ابرو اٹھایا جیسے کہہ رہا ہو اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے اور ہنس کر باہر نکل گیا۔

دیر واقعی بہت ہو چکی تھی۔ بھلے دل دماغ باتیں سوچیں آنکھیں سب یہی رہ گئی تھیں۔ لیکن اسے فی الحال اپنی بات کو طویل نہیں کرنا تھا۔ کنعان تو اپنی حیرت کے باعث پوری رات بھی یہی کھڑی رہ سکتی تھی، اس کا جملہ سوار کے جوابی جملے کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ ''انکشاف'' تو اب ہوا تھا۔

☆☆☆

ورکرز کی تنخواہ بڑھانے کے مطالبے کے پیچھے جن دو چار شرارتی قسم کے مزدوروں کا ہاتھ تھا، وقاص نے انہیں نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ کارخانے کی فضا تو چند دنوں میں ہی پہلے جیسی ہو گئی، پر نکالے جانے والے مزدوروں کو آرام نہ آیا۔

وقاص اس رات کا منظر کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا جب کال کر کے اسے کارخانے بلایا گیا جہاں ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ آگ بجھانے کی کوششیں بھی کچھ بروقت نہ تھیں۔ اور اس کا، رواں دواں کامیاب کاروبار راتوں رات کوئلہ ہو گیا۔ فیکٹری بند ہو گئی، کام مکمل ٹھپ ہو گیا کیونکہ شدید ذہنی دباؤ نے وقاص کو سوچنے سمجھنے سے معذور کر دیا تھا۔ فیاض بھائی، شمع بھابی اور نائلہ کی جذباتی سپورٹ بھی اٹھ کھڑا ہونے میں کامیاب نہیں کر پائی۔ لکڑی کے پرانے ڈیلرز کا وہ مقروض ہو چکا تھا۔ دوبارہ کام شروع کرنے کے لیے اسے کچھ نئے ڈیلرز کی تلاش تھی۔ ایک طرح سے سب کچھ ہی نئے سرے سے آغاز کرنا تھا۔

وقاص کے ایک دیرینہ دوست راشد علی نے اسے کاغان جانے کا مشورہ دیا۔ وہاں راشد کا اپنا ذاتی چھوٹا سا مکان تھا۔ وہ گرمیاں اپنی فیملی کے ساتھ وہیں گزارنے چلا جاتا اور سردیوں میں وہ گھر خالی رہتا تھا۔ کاغان میں لکڑی کے دو تین کاروباری حضرات سے اس کی ملاقات بھی راشد کی مدد سے طے پائی۔ اور وقاص پندرہ بیس دن کے لیے کاغان آ گیا تا کہ تمام معاملات آرام سے طے کر کے نئی جگہ میں اپنے ڈپریشن کو کم کر کے خود کو دوبارہ کام کے لیے آمادہ کر سکے۔ نائلہ کی صحت کے مسائل اسے سفر نہ کرنے دیتے ورنہ وہ اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پانچ ماہ پہلے اپنا چوتھا حمل بھی ضائع چلے جانے کے باعث وہ وقاص سے بھی زیادہ ڈپریس اور مایوس رہنے لگی تھی۔ جبکہ ان دنوں بھی امید سے ہی تھی۔

کاغان آ کر وقاص نے اگلے دن سے ہی کام شروع کر دیا۔ حالانکہ راشد اور فیاض بھائی نے اسے چند دن ریسٹ کا مشورہ دیا تھا لیکن وقاص جانتا تھا کہ اسے ذہنی دباؤ سے تب ہی نجات مل سکتی ہے جب آگے نئے کام کی کچھ امید پیدا ہوئی۔ اور اس بار قسمت نے بھی یاوری کی۔ تین میں سے دو جگہ سے اچھا رسپانس ملا، بلکہ سلطان صاحب کے ساتھ تقریباً تمام معاملات طے بھی پا گئے۔ وہ اسے راشد اور چند دوسرے بھروسے مند ڈیلرز کی گارنٹی پر لکڑی دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ اور پے منٹ بھی سال بھر بعد کرنے پر انہوں نے حامی بھر لی تھی۔ وقاص صحیح معنوں میں ذہنی پریشر سے کسی حد تک آزاد ہوا تھا۔

کاغان آئے اسے آج پانچواں روز تھا اور فی الحال کچھ دن مزید بھی اسے یہیں رہنا تھا۔ اس

روز سلطان صاحب سے ان کے کارخانے میں ملاقات کرکے وہ واپس اپنی رہائش کی طرف جا رہا تھا جب گرلز کالج کی چھٹی ہو جانے کے باعث رش کی وجہ سے اس نے ایک ذیلی سڑک کی طرف کار موڑی۔ یہاں دور تک دکھائی دیتے راستے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آگے سے اپنے راستے کا تعین کرتے کار چلاتے آگے آنے لگا جب نظر سڑک کنارے لنگڑا کر چلتی ایک کالج گرل پر پڑی۔ پیٹھ کر کے جاتی اس لڑکی کو پہلی نظر میں وقاص نے ایک معذور لڑکی سمجھا لیکن نزدیک سے گزرنے پر جب اس کے پاؤں پر پٹی بندھی دیکھی تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ لڑکی پاؤں کی چوٹ کی وجہ سے لنگڑا کر چل رہی تھی۔ وقاص نے شیشہ نیچے اتار کر اسپیڈ ایک دم کم کی۔

''ایکسکیوزمی۔''

''ہوں۔'' لڑکی بے طرح چونک کر رکی۔ ایک نظر بائیں ہاتھ دیکھا اور غائب دماغی سے کچھ دیر دیکھتی ہی رہی۔ ایک نہایت ہینڈسم نوجوان، بڑی سی خوب صورت گاڑی روکے اس سے مخاطب تھا۔ کیا واقعی اس سے؟ شازمہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور وقاص اپنی کار کا دروازہ کھولتے باہر آ گیا۔

''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟''

''جی...... وہ......''

''گھبرایئے نہیں، میں واقعی آپ کی ہیلپ کرنے کے خیال سے رکا ہوں۔ اس حالت میں آپ سے چلا نہیں جا رہا ہوگا۔'' جبکہ شازمہ ابھی تک اسی ایک سوچ میں غرق تھی کہ بالآخر قدرت کو اس پر ترس آ ہی گیا۔ وہ ایک حسین امیر زادے کے روبرو تھی......اور...... اور اسے یہ موقع ہرگز ضائع نہیں کرنا تھا۔ ارے قدرت کہاں روز روز ساتھ دیتی ہے۔ جیو میری پاؤں کی چوٹ۔ وہ بظاہر جھجک کا تاثر دیتے ہلکا سا سر اثبات میں ہلا کر اس کی مدد لینے کو تیار ہو گئی۔

''کہاں ہے آپ کا گھر؟'' وہ اس کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ رہا تھا۔

''جی پیدل تو بیس منٹ کا راستہ ہے۔'' شازمہ نے اپنی گھنی لمبی پلکیں اٹھا کر گھبراتے ہوئے بس ایک نظر اسے دیکھا اور وقاص کچھ دیر کے لیے اس کے خوب صورت چہرے سے نظریں ہٹانا بالکل ہی بھول گیا۔ وہ فیکٹری میں بنی کسی پلاسٹک کی گڑیا جیسی تھی۔ بے حد نازک، سفید، گلابی، چنے چنے نقوش والی۔

''کہاں جانا ہے آگے سے؟'' وقاص کی نظریں سامنے راستے پر تو مجبوراً ٹکی تھیں۔ دل تو بار بار بائیں ہاتھ کو پھسل رہا تھا۔ وہ اسے راستہ بتانے لگی اور واقعی پانچ منٹ میں اس کا گھر آ گیا۔ لیکن وہ بھی کافی اسمارٹ تھی۔

''بس میں یہیں اتروں گی۔'' اس نے جیسے عجلت میں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ رکھے وقاص کے ہاتھ پہ رکھا پھر فوراً ہی پیچھے کھینچ کر اپنی بے ساختہ حرکت پر خود ہی لجا گئی۔

''کون سا ہے آپ کا گھر؟'' وقاص نے دیکھا سامنے تو بڑی سڑک تھی۔ گھر تو بہت دور......

''جی، وہ سڑک کے پار سبز گیٹ کے ساتھ جو گلی جا رہی ہے نا، اس میں ہے۔''

''اوہ اچھا، آپ شاید احتیاطاً......''

''جی۔'' اس نے وقاص کی طرف دیکھتے اس کے اندازے کی تائید کی اور مسکرا کر شکریہ کہتے گاڑی سے نیچے اتر گئی۔

''ہائے۔ یہ لمبی بڑی گاڑی کا حسین ترین سفر۔'' شازمہ نے گھر تک کا راستہ کسی مدہوشی میں گزارا۔ کاش یہ سفر کچھ اور طویل ہوتا تو شاید تعارف وغیرہ تک بھی نوبت چلی جاتی، وہ محض آہ بھر کر رہ گئی۔ پر وقاص نے کچھ اور سوچ لیا تھا، تبھی اگلی دوپہر عین اسی وقت وہ پھر کالج گیٹ کے سامنے اس کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ اور جونہی وہ

باہر نکل کر اپنے راستے پر مڑی وقاص گاڑی لیے پیچھے آ گیا۔ آج بھی اس راستے پر وہ اکیلی تھی۔ وقاص نے ہارن بجا کر متوجہ کیا تو وہ چونک کر پلٹی پھر اسے دیکھا تو مسکرا دی۔ وقاص نے شیشہ نیچے کیا۔

''آیئے گا نہیں؟''

''آج تو پاؤں ٹھیک ہے۔'' اس نے نیچے اشارہ کیا

تو میں جاؤں؟ وقاص نے اس کا ارادہ جاننا چاہا اور یہ تو وہ بھی ہرگز نہیں چاہ رہی تھی اس لیے مسکراتے ہوئے دوسری سائیڈ سے آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''اجازت ہو تو آج ہم بھی بیس منٹ میں گھر پہنچیں؟'' وقاص نے شرارت کی تو شازمہ نے سمجھنے کے لیے کچھ ٹائم لیا پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''جی ضرور، کیونکہ کل گھر میں سب حیران ہو رہے تھے کہ آج میں معمول سے اتنے جلدی کیسے آ گئی۔''

''وہ بھی زخمی پیر کے ساتھ۔'' وقاص نے لقمہ دیا اور دونوں ہی ایک ساتھ ہنس پڑے۔

وقاص نے گاڑی گھر کے رستے پر موڑنے کے بجائے ایک دوسرے تنہا دکھائی دیتے راستے پر ڈال کر ایک سائیڈ پر روک دی۔

''یہ آپ کا روز کا راستہ ہے؟'' شازمہ نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا، نظریں جواب جاننے کے لیے وقاص کی جانب اٹھائیں تو اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''کل اتفاقاً گزرا تھا، آج دل نے کہا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

شازمہ کا دونوں مرتبہ آسانی سے کار میں بیٹھنے کی دعوت قبول کر لینا بھی وقاص کی جرات کا سبب بنا تھا۔ لڑکی شوخ اور بے باک تھی۔ کاغان کی تنہائی میں جبکہ ڈپریشن سے نجات کے لیے کسی بہانے کی اشد ضرورت تھی، وقت گزاری کا ایسا حسین سامان کون کافر چھوڑ سکتا تھا۔ البتہ اپنی ازلی احتیاط پسندی کے باعث اپنی ذاتی زندگی سے متعلق شازمہ سے اتنا ہی شیئر کیا جتنا مزاج نے اجازت دی، بلاوجہ کیا ضرورت تھی اپنے شادی شدہ ہونے کا اقرار کرنے کی۔ یہاں گزرے دس بارہ دنوں کو پھر کس نے یاد رکھنا تھا۔

وہ کالج کے بعد اب روزانہ شازمہ سے ملنے لگا تھا۔ اور وہ بھی بہانے باز نمبر ون تھی۔ روزانہ ہی گھر میں کچھ نہ کچھ ایسا کہہ آتی کہ پھر کم از کم ایک گھنٹہ وہ دونوں ایک ساتھ گزارنے لگے۔

شازمہ کے گھر میں باپ، تین بھائی، تین بھابیاں اور ان کے ڈھیر سارے بچے تھے۔ وہ گھر کے ماحول سے تنگ تھی۔ تینوں بھائی معمولی کاروبار یا نوکریوں سے جڑے بمشکل گھر کی گاڑی کو کھینچے ہوئے تھے۔ شازمہ کا رشتہ اس کے باپ نے اپنے جیسے سفید پوشوں میں کر رکھا تھا جس سے شازمہ قطعی خوش نہ تھی۔ اسے اپنے کم پڑھے لکھے معمولی دکان دار منگیتر کے نام سے بھی چڑ تھی۔ اس نے اپنے جن اونچے خوابوں کا ذکر وقاص سے کیا بلاشبہ وہ ان پر پورا اترتا تھا۔ لیکن یہ وقاص جانتا تھا کہ وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہے۔ اسے نائلہ کے پاس لوٹ جانا تھا، شازمہ کی البتہ دن بہ دن اس کی جانب بڑھتی توجہ اور محبت کی شدت کو دیکھتے وقاص نے فیصلہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے وہ اسے حقیقت ضرور بتا دے گا تاکہ وہ اس کی راہ نہ دیکھتی رہے۔ لیکن واپسی سے دو دن پہلے جب شمع بھابھی کی طرف سے پریشان کن کال آئی کہ نائلہ کی طبیعت خراب ہے اور ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں تو وقاص کے خیالات میں بدلاؤ آنے لگا۔

چوتھی مرتبہ کے بعد وہ جب خود لیڈی ڈاکٹر سے ملا تھا تو اس نے نہایت مایوسی سے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ نائلہ کا سسٹم بچہ کیری کرنے کے معاملے میں بہت کمزور ہے۔ مکمل بیڈ ریسٹ

سے کچھ کامیابی کا امکان ہے۔ لیکن شمع بھابھی نے جب پانچویں مرتبہ بھی وہی خبر سنائی تو وقاص کو یقین ہو گیا کہ مکمل بیڈ ریسٹ بھی طفل تسلی کے سوا کچھ نہیں۔ ۔اور کاغان سے واپس آتے اس نے بجائے شازمہ کو اپنا سچ بتا کر ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کے واپس آ کر بھی اس سے رابطہ برقرار رکھا۔

چار ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ ان چار ماہ میں وقاص بے پناہ مصروف رہا۔ کاغان سے واپس آ کر کارخانے کی صفائی مرمت رنگ روغن کے بعد نئے مال کے ساتھ کام کا دوبارہ آغاز، پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اسے کام کاج کے دوران کارخانے میں راتیں بھی گزارنا پڑ گئیں۔ چار ماہ بعد کام کسی حد تک چل نکلا۔ وقاص نے مہینوں بعد جیسے تھک ہار کر سکون کا سانس لیا تھا۔

اس رات وہ اتفاقاً اپنے کارخانے میں رک گیا تھا جب شازمہ کی نہایت پریشانی کے عالم میں کال آئی، اس نے بتایا کہ باپ اور بھائیوں نے اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔ اور وہ مدد کے لیے وقاص کو بلا رہی تھی۔ ۔وقاص فوری طور پر تو محض تسلی ہی دے پایا کہ ایسی کسی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر وہ قطعی تیار نہیں تھا۔ بہت سوچنے پر اسے دو ہی راہیں سجھائی دیں، یا تو وہ شازمہ پر اپنی شادی کا سچ ظاہر کر کے اس سے پیچھا چھڑوا لیتا، تا کہ جہاں اس کا باپ اس کی شادی کر رہا ہے وہ اسے قبول کرتے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے چلی جاتی۔ دوسرے وہ کچھ اس طرح شازمہ کو اپنی زندگی میں شامل کرتا کہ نائلہ کو اس کی بھنک بھی نہ پڑے، لیکن نائلہ کو وہ اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا تھا، وہ ایک بڑے گھر کی مضبوط بیک گراؤنڈ رکھنے والی عورت تھی۔ ۔وقاص نے سر نفی میں ہلایا۔ نائلہ کے معاملے میں سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک بات تھی شازمہ کو زندگی میں شامل کرنے کی تو اس حوالے سے وقاص کا واحد مفاد اولاد کی خوشی کا حصول تھا۔ نائلہ اپنی مرضی اور خوشی سے اس بات کے لیے کبھی راضی نہ ہوتی۔ لیکن ان تمام سوچوں کے باوجود وقاص ابھی تک کنفیوژ تھا۔ کسی حتمی فیصلے تک پہنچنا ابھی بہت مشکل تھا۔ اس نے ہفتہ بھر باتوں سے شازمہ کو ٹالا، لیکن اس آٹھویں صبح، وقاص کے لیے شازمہ کو ٹالنا ناممکن ہو گیا کیونکہ وہ اپنا گھر اپنا شہر چھوڑ کر اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

وقاص کے پاس اب سوائے اسے اپنانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ فوری طور پر اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر تین دن کے اندر ایک گھر کا بندوبست کر کے شازمہ سے شادی کر کے وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ اور یہ وہ دن تھے جب گھر میں سب اس کی اس روٹین کے عادی ہو چکے تھے۔ کارخانے کی مصروفیت میں وہ ہفتے کے پانچ دن ویسے ہی کارخانے کی نذر کر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی اتنی بڑی تبدیلی کا گھر میں نوٹس نہیں لیا گیا۔ شازمہ کے سامنے بھی یہی بہانہ کام آیا اور وقاص کے لیے اپنے دونوں گھروں کو کامیابی سے مینج کرنا آسان ہو گیا۔

شازمہ کے اس کی زندگی میں شامل ہوئے ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ نائلہ نے اسے ایک مرتبہ پھر اپنے امید سے ہونے کی خوش خبری سنائی۔

چھ ماہ تک شازمہ اس کے ساتھ اس پہلے گھر میں رہی جہاں شب و روز بڑے سکون سے گزرے کیونکہ شوہر ہفتے کی پانچ چھ راتیں اس کے پاس ہی گزارتا تھا۔ اور وہ تو وقاص کے معاملے میں ویسے بھی کسی شبہے کا شکار تھی ہی نہیں۔ البتہ وقاص کو چند جاننے والوں نے جب بار بار اس محلے میں آتے جاتے دیکھا تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اسی لیے وقاص کو وہ علاقہ چھوڑ کر ایک بالکل انجان علاقے کا انتخاب کرنا پڑا۔ یوں شازمہ کی آمد اس نئے محلے

میں ہوئی۔

ادھر نائلہ کی صحت دن بہ دن بہتری کی طرف گامزن ہونا شروع ہوگئی۔ پہلی مرتبہ وہ اپنے حمل کے ساتویں ماہ میں داخل ہوئی تھی۔ وقاص کو معلوم ہی اب ہوا کہ اس بار شمع بھابھی کی کوششوں سے نائلہ کی ڈاکٹر بھی تبدیل کی گئی تھی اور بچے کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے کچھ خاص ٹریٹمنٹ بھی کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار زچہ بچہ دونوں باخیریت تھے۔ وقاص کے لیے بھی نائلہ کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ تبھی نئے گھر میں اس نے شازمہ کے ساتھ اس پرانی روٹین کو ترک کردیا۔ فیکٹری کا کام یوں بھی اچھی طرح چلنے لگا تھا، اب وہ چھ راتیں نائلہ کے پاس گزارتا اور ویک اینڈ پہ شازمہ کے پاس آجاتا۔

یہاں آکر شازمہ کے ستارے تو گردش میں آگئے لیکن نائلہ نے وقاص کو بیٹی کی شکل میں اولاد کی خوشی عطا کردی۔ شازمہ کی راتیں تنہا گزرنے لگیں لیکن وقاص کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ اس کا بے تاب دل کارخانے کے بعد بیٹی کو دیکھنے اسے اٹھانے اور پیار کرنے کو ہمکتا رہتا۔

اور اب اس نئے محلے میں ایک سال گزرنے کے بعد حالات یہ کس نہج پر آکھڑے ہوئے تھے۔ شازمہ نے خالی خالی نظروں سے اس چھوٹے سے گھر کے درودیوار کو دیکھتے کارنس پہ سجی وقاص کی تصویر کو دیکھا۔

آج وقاص اسے دو آپشنز دے کر گیا تھا۔ اور بقول وقاص ان دو کے علاوہ اس کے پاس کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''آپ کسی کو بلوالیتے سر۔ ذرا جذباتی سپورٹ مل جاتی ہے۔''

''ہاں۔'' تائید میں سر ہلاتے انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سوار نے جلدی سے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔

رفیق سر کو اگلی صبح جس وقت ڈسچارج کیا گیا تب صدیق اور دیا کے ابو اشفاق انکل ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ وہی ان کو گھر بھی لے گئے اور سوار ہاسپٹل سے سیدھا اپنے ہوٹل چلا گیا تھا۔ سہ پہر تک کا وقت ہوٹل کے معاملات میں ان کا حال تک پوچھ نہیں پایا۔ اس لیے اب چار بجے کے قریب تھوڑی فرصت میسر آئی تو ان کی خیریت دریافت کرنے گھر آگیا۔

''کنعان نے اپنی پھوپھو کو کال کی ہے، امید ہے شام یا رات تک آپہنچیں گی۔ حالانکہ خاصی خفا ہوکر گئی تھیں۔'' وہ کچھ یاد کرکے مسکرائے اور سوار بھی سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ کس جانب ہے۔ البتہ تبصرہ محفوظ رکھا۔

''اور آپ کی بڑی بیٹی؟''

''میں نے کنعان کو منع کیا تھا، بلاوجہ پریشان ہوجائے گی۔ ابھی اسے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے یہاں سے گئے۔'' سیدھا ہوکر بیٹھتے انہوں نے چائے کا کپ اٹھایا اور ٹرے سوار کی طرف کھسکائی۔

''چائے لو سوار، ٹھنڈی ہوجائے گی۔''

''جی سر۔'' کسی تصور سے باہر آکر اس نے بظاہر مستعد نظر آنے کی کوشش کی اور کپ اٹھالیا۔

چائے کی ٹرے بھی اماں اندر لائی تھیں۔ جانے وہ جان کی دشمن کہاں چھپی ہوئی تھی۔ خدمت سے عاری خاتون...... انا پرست...... گرم گھونٹ نے ہونٹ جلائے تو وہ بلاوجہ ہی مسکرادیا۔ پچھلی رات کے ٹھنڈے میٹھے اقرار کے بعد توقعات ازخود بلندی کی طرف پرواز کرنے لگی تھیں۔ ایسی سوچ فطری ضرور ہوتی ہے لیکن اس میں دانش مندی کہیں نہیں ہوتی، خواہشوں کے سبک رفتار گھوڑے کو بے لگام نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس نے خوب لطف لے کر چائے ختم کی۔ ان ہاتھوں کا ذائقہ ہی بہت تھا سکون پانے کو۔

''کچھ منگوانا ہو سر تو بتادیں۔ میں لے آتا ہوں۔'' خالی کپ ٹرے میں رکھ کر وہ اٹھ کھ

ہوا۔

''کیوں شرمندہ کرتے ہو سوار۔ اپنے کام اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر تمہارا آنا ہی کیا کم ہے، پھر پچھلی رات کی اتنی طویل ڈیوٹی۔''

''معمولی سی خدمت کو ڈیوٹی کہہ کر شرمندہ تو آپ کر رہے ہیں سر۔ اتنی غیریت سے بات کریں گے تو مجھے لگے گا یہاں سے جانے کے بعد میں واقعی یہاں سے ''چلا'' گیا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے جب آپ مجھ سے پرانے دنوں سا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں آپ سے جونیئر ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میری آپ سے پہچان کا یہ رویہ کبھی تبدیل نہیں ہوسکتا۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ سوار کی جذباتی تقریر کافی طویل تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی عصمت علی سارا سامان لے آیا تھا۔ کچھ منگوانا ہوتا تو ضرور میں تم سے کہہ دیتا۔ غیریت واقعی نہیں برت رہا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم ریسٹ کرو۔''

ریسٹ کا ٹائم تو اب رات کو ہی ملے گا سر۔ آپ البتہ آرام کریں۔ مجھے کوکنگ کلاس کے لیے نکلنا ہے۔ اب اجازت چاہوں گا۔'' وہ ان سے مصافحہ کرکے باہر نکل آیا۔

ٹھنڈی ہواؤں میں لپٹی وہ بسنتی سی پھوار تھی جو سمٹ کر برآمدے کے کونے سے سوار کی کن انکھیوں کو محسوس ہوئی تھی۔ بہاروں کی وہ ملکہ کہیں بہت قریب تھی، دل ایک مسحور کن احساس کی سرخوشی میں پھیل کر سکڑا اور خوشی کی ٹھنڈی سی لہر اندر تک اُتر گئی۔ قدم سست ہوتے اب بالکل ہی رک گئے تھے۔ اس بار قدرے اعتماد سے اس نے رخ موڑ کر بائیں جانب دیکھا۔ پکے لیموں سے کچے پیلے رنگ میں وہ معمول سے کہیں زیادہ فریش اور گلابی سی نظر آ رہی تھی۔ سوار بجائے جالی اور شیشے والے دروازے سے باہر نکلنے کے چند قدم چل کر کچن کی سائیڈ پر آیا۔ وہ کچن کے دروازے سے باہر نکل کر وہیں جم گئی تھی۔ بات کرنا اب ذرا آسان تھا کیونکہ رفیق سر کے کمرے سے اب وہ دور آ گیا تھا۔ نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا جو معلوم نہیں مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی یا مسکراہٹ روکنے کی۔ سوار اپنا اعتماد البتہ مکمل بحال کر چکا تھا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھتے تھوڑا سا آگے کو جھکا۔

''اکیڈمی جا رہا ہوں۔ آؤ۔ ایک ساتھ چلتے ہیں۔''

''مم...... میں تو......'' وہ پوری ڈوب گئی۔ مدھم ساحر لہجے میں ''آؤ'' کی پکار نے پچھلی رات کے خواب کی کیفیت کو چھن سے توڑا۔ کنعان کا پورا دن کسی بے یقینی میں بسر ہوا تھا۔ رات جو ہوا کیا وہ واقعی ہوا تھا۔

''میں آج نہیں جا رہی، ابو اکیلے ہیں۔'' وہ کسی حد تک ماحول میں آ گئی۔

''ہوں۔ اچھی بات ہے۔ لیکن پکنک؟''

''جی؟'' کنعان نے تعجب سے پہلی مرتبہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''پکنک کے لیے منع تو نہیں کریں گی نا؟''

''لیکن ابو۔'' وہ اٹک سی گئی۔

''اسی لیے میں پروگرام کو تھوڑا آگے کر رہا ہوں۔'' وہ اب دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''سر کی طبیعت ان شاء اللہ سنبھل جائے گی۔ تم ہاں کر کے میری طبیعت بحال کردو۔'' وہ اب پوری طرح شرارت کے موڈ میں تھا۔ کنعان نے مسکرا کر سر ہولے سے اثبات میں ہلایا۔

''تھینک یو سو مچ کنعان۔ کل اکیڈمی میں ملتے ہیں۔ بائے۔'' وہ مسکرا کر باہر نکل گیا اور وہ خالی خالی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھے گئی۔

کوئی انہونی تھی جو ہو کر رہی۔ جس کے نہ ہونے کی ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگی جائیں اس کے ہو جانے پر تو دل درد سے تڑپتا ہے، اپنی بے بسی پر روتا اور بلکتا ہے۔ پر وہ......

کنعان نے پلکیں اوپر اٹھائیں تو نظر برآمدے کی دیوار پر لگے آئینے میں دکھائی دیتی اپنی صورت پر پڑی۔ بسنتی پیلے دوپٹے کے ہالے میں نظر آتا وہ چہرا کیوں آج اتنی شادابی لیے ہوئے تھا۔

وہ دل لوٹنے والا محض "آؤ" کہہ کر جتا دیتا ہے کہ تعلقات کی نوعیت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ جس بگاڑ سے ڈر رہی تھی۔ سوار کے لہجے نے بتا دیا کہ وہی تو سدھار ہے۔ لہروں پر ڈولتی ناؤ کو پتوار میسر آ گئے تھے، کنارہ دکھائی دینے لگا تھا۔ محبت ڈبو دیتی ہے، نرا وہم ہے۔ وہ تو استحکام سے جمی تھی، بنا کسی الجھن اور گھبراہٹ میں پڑے۔ محبت پار لے جا رہی تھی۔ سبک لہروں پر ہلکورے کھاتی کشتی کو کسی طوفان کا خوف نہیں تھا۔

وہ مسکراہٹ دبا کر اطمینان سے پلٹی۔ جو بھول رہی تھی کہ لہروں پہ تیرتی کشتی کو محض طوفانی موجوں سے ہی نہیں، کبھی کبھار موجوں میں گھومتے بھنور کا سامنا بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے گرداب در گرداب بھنور کہ امید بھری نگاہیں کنارے پر جمی رہ جاتی ہیں اور کشتی بھنور میں چکر کھاتی بے عمیق اندھیروں میں ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ پھر کنارہ دور۔ بہت دور چھوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

"کتنے ہوئے؟"

"نوے روپے۔" اس نے بجھا سگریٹ دور جھاڑیوں میں پھینکا، ادھیڑ عمر آدمی نے بٹوے سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اوپر کی جیب سے بقایا دس روپے آدمی کی طرف بڑھائے تبھی بائیں جانب سے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آ بیٹھا۔ ضرور کوئی نئی سواری آئی تھی۔ اس نے روپے سنبھال کر رخ بائیں جانب موڑا۔ ہلکی سی شناسائی کی جھلک آنکھوں میں نمودار ہوئی لیکن شناخت مکمل واضح نہیں ہو پائی۔

"یاد دلاؤں؟" سوار نے کالے چشمے کو سینے پر صاف کر کے دو بٹنوں کے درمیان لٹکایا۔ پیشانی کے بگڑے بل البتہ خوب سختی کے تیور لیے ہوئے تھے۔

"یہ داڑھی والا تو اس روز......" ٹیکسی ڈرائیور کے ذہن میں بارش والی رات کا منظر تازہ ہوا تو انداز میں واضح بے چینی کا عنصر نمایاں ہوا۔

"ٹھیک سمجھے۔" سوار نے رخ تھوڑا مزید اس کی جانب موڑا۔ "میں وہی ہوں جسے میری ہونے والی بیوی کے ساتھ تم نے میری سسرال چھوڑا تھا۔ اور تم وہ ہو جسے ٹیکسی چلانے سے زیادہ جاسوس بننے کا شوق ہے۔" سوار نے ایک ہی جملے میں اپنی وہاں موجودگی کا سبب بھی جتا دیا، ٹیکسی والا اب پوری طرح خود کو سنبھال چکا تھا۔

"میں تو تمہارے بھلے کے لیے۔"

"ہاں سمجھ گیا۔" سوار نے اس کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی۔ "اور آج میں بھی تمہارے بھلے کے لیے آیا ہوں۔ اب احسان کا بدلہ تو بنتا ہے ناں۔" سوار طنزیہ مسکرایا، ڈرائیور جواباً خاموش ہی رہا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" سوار کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہوئی

"جم......شید......" ٹیکسی والا مکمل اس کے رعب میں دبا لگ رہا تھا۔

"آئندہ محتاط رہنا جمشید۔" سوار کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سرسراہٹ تھی۔ "کسی پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے ایک بار سوچ ضرور لینا۔ آج صرف سمجھا رہا ہوں اگلی بار اتنی مہلت بھی نہیں دوں گا۔ اور یاد رکھو۔ جو میرے بارے میں جانتے ہیں، وہ بھی نہیں جانتے کہ دراصل میں کیا ہوں۔ لہٰذا کوشش کرنا کہ آگے تمہارے کسی راستے کی دیوار بن کر کم از کم "میں" کھڑا نظر نہ آؤں۔ ورنہ نقصان صرف تمہارا ہوگا۔" سوار کے لہجے کی درشتی نے جمشید کی زبان گنگ کر دی تھی۔ جوابی وار تو دور وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پایا تھا۔ اور سوار اپنی بات مکمل کر کے باہر نکل گیا۔

"ہونہہ۔" جمشید نے اس کے چلے جانے کے بعد اسٹیئرنگ پر مکا مارا۔ "دیکھ لوں گا تمہیں۔"

☆☆☆

وہ ایک بادلوں بھری صبح تھی۔ بارش کا امکان تو کم تھا، بادل البتہ زمین پر اتر آئے تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو مال روڈ دھند نما گھرے بادلوں میں پوری طرح لپٹی تھی۔ لیکن یہاں۔ جی پی او کے بائیں جانب اوپر کشمیر پوائنٹ کو جانے والا راستہ اب نسبتاً کلیئر ہو رہا تھا۔ کہیں بادلوں کی لکیر سی شرقاً غرباً جاتی دکھائی دیتی تو کہیں کوئی بالکل صاف سی جگہ آجاتی۔

ناظمہ کوکنگ اسکول کا یہ بارہ رکنی قافلہ اب وومن کالج کے آگے سے گزر رہا تھا۔ بلیک فل شرٹ، سلیولیس اوپن براؤن اپر اور براؤن پینٹ میں پہاڑوں کی چمکتی صبح سا فریش وہ سوار علی تھا جو کالج کا بورڈ دکھائی دیتے ہی بے ساختہ در آتی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے موبائل پر جھک گیا تھا۔ دیا اپنا کالج آنے پر خاصی خوش اور پرجوش نظر آنے لگی تھی۔ سیما اور بشریٰ باجی بھی کچھ پانچ چھ سال پہلے کے کسی بیچ کی اسی کالج کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ سعدیہ اور مریم پچھلے سال یہیں کی فارغ التحصیل تھیں، لہٰذا دور تک ان سب کا موضوع اپنا کالج ہی رہا۔ سوار اب دانستہ چند قدم پیچھے چلتے کنعان کی تیاری کا چپکے چپکے جائزہ لے رہا تھا۔

آج وہ اس کے فیورٹ پرپل کلر میں تھی۔ گہری جامنی قمیص پر تیز رنگوں کا پھول دار پرنٹ تھا، سر پر آج اسکارف کے بجائے انگوری بارڈر والی پرپل شال لے رکھی تھی۔ شولڈر کٹ بال اونچی پونی میں قید تھے۔ کانوں میں کرسٹل گرین ٹاپس پہنے آج وہ ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیے ہوئے تھی۔ لپ اسٹک لائٹ پنک سے کچھ زیادہ تیز تھی جو ہمیشہ سادہ رہنے والی کنعان کے چہرے کو مزید پر رونق بنا رہی تھی۔ اس نے دل کی کتاب پہ تحریر کیا "آج کا دن زندگی کے چند حسین ترین دنوں میں سے ایک ہے۔

"خوشی" کیا ہے؟ غالباً ضبط کا وہ پیمانہ جو ہاتھوں سے چھلکے تو بادہ ساری کائنات کو اپنے نشے میں رنگ ڈالے۔ وہ بھی اب تک کے وقت میں محبت کی مے کو انگلیوں میں تھامے اپنی ہی خوشیوں کی راہ روکے کھڑا تھا، دل آج مدت بعد خواہشوں، امنگوں کی آواز پہ لپک رہا تھا۔ یہ کہتے کہ ہمارا نام بھی شامل ہو محبت کی کہانیوں میں، ہم بھی لکھیں وہ داستان ہوائیں جس کی خوشبو اپنے دامن میں لیے نگر نگر گھوما کرتی ہیں۔ تم ہی اس دل بیزار کی وہ واحد خوشی ہو جس کا حصول زندگی تو جدائی موت ہے۔ رگ و پے میں دوڑتا یہ محبت کا نشہ میرے لیے بہت نیا بہت اچھوتا ہے، دل تسلیم کرتا نظر آتا ہے کہ یہ "وہ" نہیں جو تباہی کا سامان کرتی ہے۔ یہ وہ ہے جو زندگی کی طرف لاتی۔ محبت جو تقدس کے حصار میں رقصاں فقط خیال ناز سے تسکین پانے کو ہی حاصل زندگی سمجھتی ہے۔ وہ اور کنعان تو کبھی ایک دوسرے سے جدا تھے ہی نہیں، بس ملنے کا وقت قدرت نے یہی معین کیا تھا۔ اور قدرت ہی اس خوشی کی راہوں کو سہل کرے گی یہ سوار کا یقین تھا۔

سڑک کنارے ایک نسبتاً کھلی جگہ آجانے پر وہ سب ستانے کے لیے رکے تو پہلا فوٹوگرافی سیشن شروع ہوا، سوار نے سرسری ایک نظر عمران کو دیکھا تو لب مسکرا دیے، آج وہ بھی محتاط دکھائی دیتے محض وادی کے مناظر لے رہا تھا۔ سوار نے بھی چند تصاویر لڑکیوں کی مخالف سمت میں، کھائی دیتے خوب صورت مناظر کی لے کر کیم جیب میں رکھ دیا۔ کیمرے والا نیا موبائل اس نے [illegible] روز قبل ہی خریدا تھا۔ جوسز اور پانی پینے کے بعد سفر کا دوبارہ آغاز ہوا۔ آتی جاتی ٹریفک کے خیال سے سب دو، دو ہو کر قطار میں چلنے لگے۔ کنعان دیا کا ہاتھ تھامے ذرا آگے تھی اور وہ نادانستگی میں انعم کے ساتھ آگیا تھا یا شاید انعم نے اس کو چنا تھا ساتھ چلنے کے لیے۔

''ہمیں چاہیے اپنے لیے کم از کم ایک گھنٹہ جوگنگ کا وقت روزانہ صبح نکالا کریں، کتنا اچھا لگ رہا ہے آج واک کرتے، کیوں سوار؟'' وہ ہمیشہ بنا بھائی لگائے ہی اس سے بات کیا کرتی۔

''مشورہ تو بہت عمدہ ہے، لیکن آج جس طرح ڈھیروں کام دھندے چھوڑے یہاں بے فکری کی چند سانسیں لے رہے ہیں، کیا یہ روزانہ ممکن ہے؟''

''صحیح کہتے ہو سوار۔'' ان سے آگے چلتی بشریٰ باجی ہنس کر پلٹیں۔ ''ایک میں ہی اگر آج صبح اپنے یہاں کے لیے نکلنے کا نقشہ کھینچوں تو تم سب کانوں کو ہاتھ لگاؤ گے۔''

''اور کیا، آنکھ کھلتے ہی زندگی کو تیز رفتار چابی لگ جاتی ہے۔'' یہ سیما باجی تھیں۔

''اکثر تو ناشتا بھی اسی تیز رفتاری کی نذر ہو جاتا ہے۔'' مریم نے بھی تائید کی۔

''ہمیں تو ڈھنگ کا ناشتا اتوار کو ہی نصیب ہوتا ہے۔'' سعدیہ نے افسوس سے منہ بنایا۔

''مطلب جوگنگ کو پروموٹ کرنے والا یہاں ایک بھی نہیں؟'' انعم نے منہ بنایا۔

''ایسی ہی حوصلہ شکن باتوں کی وجہ سے آج ہم صحت اور صفائی دونوں میں بہت پیچھے ہیں۔'' آنسہ نے تاسف سے سر ہلاتے انعم کا ساتھ دیا۔

''ہاں ویسے جوگنگ کی اہمیت کو تو رد نہیں کیا جا سکتا۔'' رش کم ہوتے ہی دیا اور کنعان بھی تھوڑا پیچھے آگئی تھیں۔

''اور آج صبح کی تیاری اس لیے مشکل لگی کیونکہ ہم پکنک کے لیے نکل رہے تھے۔ اہتمام روٹین سے ہٹ کر تھا۔'' کنعان نے بھی پہلی مرتبہ حصہ لے کر خود کو انعم کا ہمنوا ثابت کیا۔

''ایگزیکٹلی۔'' انعم نے انگلی اٹھا کر تائید کی۔

''جوگنگ کے لیے بغیر کسی تیاری میں بڑے بندہ کم از کم آدھا گھنٹہ چالیس منٹ روزانہ نکال سکتا ہے۔''

''اور ترقی یافتہ ممالک میں زندگی کیا کم مصروف ہوتی ہے۔ مغرب میں تو مارننگ واک معمولات میں شامل ہے۔'' یہ پھر کنعان تھی جس نے اب سوار کا جملہ پکڑا تھا۔ اور کافی دیر سے چپ سوار نے بھی پہلا ڈائریکٹ جواب دیا۔

''اور ہماری مشرقی خواتین کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کا سارا دن جوگنگ میں گزرتا ہے۔'' کافی دیر سے خاموش سوار نے بھی پہلا ڈائریکٹ جواب دیا اور سیما، بشریٰ کے مشترکہ قہقہے نے کھل کر سوار کی تائید کی۔

کنعان غصے سے بل کھا کر رہ گئی۔ وہ غصے سے ادھر دیکھنا چاہتی تھی لیکن آج ان آنکھوں کے پیغام بہت بدلے بدلے تھے، وہ حسین نگاہ تو عام حالات میں سامنے ٹھہرنے نہ دیتی آج تو مفہوم ہی الگ تھا۔ اور یہ آنکھوں کی تحریر پڑھنا کتنا جادو اثر ہوتا ہے اب سے پہلے صرف سنا تھا اس بارے میں، معلوم اب ہوا کہ یہ چند حرف محبت تو بڑے ہی سادہ و آسان ہوتے ہیں، دیکھنے اور پڑھنے کے لیے جو زور چاہیے، دل اس کا متحمل نہیں ہو پاتا سوار اسے چڑا رہا تھا، اپنی جانب دیکھنے پر اکسا رہا تھا لیکن دل ناتواں میں تاب کہاں تھی۔

''ویسے تھینک یو سوار۔'' بشریٰ باجی نے بڑی دیر بعد ہنسی روکی۔ ''ہماری حالت کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں ہو سکتی۔''

''لیکن افسوس بشریٰ باجی کہ اس جملے کا مفہوم بھی صرف آپ ہی سمجھ پائیں۔'' سوار نے دکھ بھری آہ نکالی۔

''فکر نہ کرو سوار۔'' سیما باجی نے گردن پھیری۔ ''ایک ایک کر کے جب یہ سب بھی گھر گرہستی والی ہو جائیں گی تو ان ''گولڈن ورڈز'' کو یاد کر کے اپنے آپ میں مسکرایا کریں گی۔''

''اچھا؟'' سوار نے بے یقینی سے کان کی لو کھجائی۔ مسکرانے والی بات کچھ ہضم نہیں ہوئی۔ ''اپنے والی'' کے مستقبل کا تصور کیا تو سوائے اٹھا پٹخ

کے کچھ دکھائی نہیں دیا" تم سے شادی کرکے تو زندگی عذاب میں آگئی۔ سارا دن کام ختم نہیں ہوتے، اوپر سے نام نیکی کچھ نہیں۔"

"اُف......" وہ جھرجھری لے کر حال میں آیا، دل کی تسلی کے لیے فوراً دلیر بھائی کو آواز دی۔

"کیوں دلیر بھائی...... ہماری بھابھی جی گھر کے کام کاج کرکے مسکرایا کرتی ہیں؟"

"توبہ کرو۔" دلیر بھائی نے دونوں کانوں کو چھوا اور سب کا قہقہہ بلند ہوا۔

"امارا جرات نئیں کہ گرجا کر پانی بی مانگ لے، ایک گلاس پانی کے بدلے کون اتنا لمبا تقریر سنے۔"

"دیکھ لی سیما باجی...... گولڈن ورڈز کی ناقدری، گھر کے کاموں کو یہاں جوگنگ سمجھ کر کرنے والا ایک بھی نہیں۔"

"اچھا ہے ناں، اور لو مشرقی خواتین کی سائیڈ۔" عمران طنزیہ مسکرایا۔ "مشرق کے محنتی مرد تمہیں دکھائی نہیں دیے ناں۔"

"ارے۔ بس بھی کرو۔" آمنہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "ہمیں تو بھوک ستا رہی ہے، کوئی پیٹیز ہی نکال دے۔"

"ہاں آمنہ باجی یہ خوب کہا۔"

پام کے درختوں تلے وہ پھر ایک کھلی جگہ آگئے تھے۔ بیٹھنے کے لیے بنچ بھی تھے۔ نیچے جنگل کا ویو بھی بہت خوب صورت تھا۔ کچھ نے تھک کر نشست سنبھالی۔ کھانے پینے کا سامان سب نے اپنے اپنے ہینڈ بیگز میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوار نے ایک سینڈوچ، کولڈ ڈرنک کے ساتھ لیا اور وادی کی تصاویر بنانے لگا۔

"پیٹیز سوار۔" انعم ڈسپوزبل پلیٹ میں پیٹیز لیے جنگلے کے قریب آئی۔

"شکریہ انعم۔" سینڈوچ کافی تھا۔ سوار نے موبائل آف کیا۔

"آج آپ کی ڈریسنگ لاجواب ہے سوار۔"

انعم نے ایک ادا سے اسے مسکرا کر دیکھا۔

سوار بری طرح چونکا پھر جھینپ گیا۔ جواب بھی بن نہیں پایا۔ نظر بے ارادہ ہی دور کے ایک بنچ پر گئی۔ کسی نے پہلی بار چوری چوری ادھر دیکھا تھا۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں آج۔" انعم جنگلے پر ہاتھ رکھے افسردہ لہجے میں بولی اور سوار جو نیچے جنگل میں بکھری خوب صورتی کی طرف متوجہ ہونے لگا تھا، رخ موڑ کر انعم کو دیکھنے لگا۔

"اٹھارہ بیس دنوں بعد نجانے کون کہاں ہوگا۔" وہ ہنوز دکھی تھی۔

"زندگی تو مسلسل سفر ہے نا انعم جی۔" سوار کے دل پر بھی فراق یار کا سایہ سا لہرایا۔

"انسان جو دنیا کے سامنے ظاہر کرتا ہے، وہ تو درحقیقت کچھ بھی نہیں، جو دنیا اندر آباد ہے، اصل میں وہی آئینہ ہے۔ کبھی اس بات پر بھی رب تعالیٰ کا الگ سے شکر ادا کرنا چاہیے کہ دل کے آئینے کو اس نے دنیا سے پوشیدہ رکھا کیونکہ ہم اپنے اندر کی آباد دنیا سے بہت ہٹ کر سب کے سامنے آتے ہیں۔ کون جان سکتا ہے، ہنسی مذاق سے سب کا دل بہلانے والا اس وقت اپنے اندر ضبط کے کیسے امتحان سے نبرد آزما ہے، اندر کی سچی کیفیت جو یہ کہہ رہی تھی کہ قدرت کے اس زندہ منظر میں دور تک دکھائی دیتی ٹھنڈی سڑک پر اس پر پل کپڑوں والی کا ہاتھ تھامے اس کے کانوں میں محبت کی سرگوشیاں کرتے بس چلتا چلا جائے۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" انعم کے سبھی انداز آج شیرینی میں گھلے تھے، سوار نے سر جھٹکا۔

"کچھ نہیں، آیئے۔ سب کی طرف چلتے ہیں۔" چند ثانیے پہلے بس لمحے بھر کو ابلیس مردود نے بہکایا کہ اگر کسی کو جیلس کرنا ہے تو اس سے بہتر موقع میسر نہیں آسکتا، صد شکر کہ وہ گمراہ کن لمحہ آکر بے سود پلٹ گیا۔ کنعان کی توجہ پانے کے لیے کسی معصوم انجان دل سے کھیلنا کم ظرفی کا کس قدر پست درجہ ہوسکتا ہے۔ وہ چہرے پر سنجیدگی

طاری کرتے انعم سے پہلے ہی وہاں سے چند قدم آگے نکل آیا تو انعم بھی مقصد حاصل نہ ہونے پر مایوس سی پلٹ آئی۔

"چلو بھئی بہت ریسٹ کرلیا۔" اسی نے سب کو منتشر کیا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ سب کشمیر پوائنٹ پہنچ گئے۔

دلیر بھائی نے بازو پر باز بٹھا رکھا تھا۔ سوار اور عمران نے ہر اینگل سے ان کی تصاویر لیں۔ لڑکیاں وزیراعظم ہاؤس دیکھنے کی بے تابی میں ٹرین کی طرف بھاگیں، باقی سب نے کھانے پینے کی شاپس کا رخ کیا۔ دلیر بھائی اور عمران بھی انہی میں شامل تھے۔

سوار کے دماغ پہ البتہ تصویریں بنانے کی دھن لگی تھی۔ کسی نے اگر دو دن پہلے نیا موبائل لیا ہو تو ایسی کیفیت فطری ہوتی ہے۔ وہ سب سے الگ ہو کر ایک اکیلے راستے پر چل پڑا۔ تصویریں بنا لینے کے بعد اب وہ نیچے وادی میں قریب تیس چالیس فٹ نیچے ایک لکڑی کے ہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ ہجوم سے دور اس منظر نامے میں یا وہ تھا یا قدرت کی خوبصورتی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا جب ایک وٹس ایپ پیغام نے سوار کی توجہ حاصل کی۔ نمبر بالکل نیا تھا۔ وہ حیرت سے ریڈ کرنے لگا۔

"مری میں کچھ بھی واقع ہوسکتا ہے، اس کی فضا میں رومان ہے، ہوا میں تجسس ہے، اس خوش گوار سیاحتی مقام کے راستے زمین اور جنت دونوں سے بغل گیر ہوتے ہیں، اور یہاں محبت میں گرفتار ہو جانا بہت معمول کی بات ہے۔"

(امریکن جرنلسٹ کمیلے)

"واؤ۔" وہ بھیجنے والے کی معلومات کو داد دیتے ایک مرتبہ پھر پڑھنے لگا جب اسی نمبر سے ایک تصویر موصول ہونے لگی۔ مکمل ہونے پر جب وہ نمایاں ہوئی تو سوار کی آنکھیں حقیقی حیرت سے ساکن ہوئیں۔ کیونکہ وہ اس کی اپنی ہی ایک تصویر تھی۔ آج ہی کے کپڑوں میں جب وہ دلیر بھائی کے بازو پر بیٹھے باز کی تصویر لے رہا تھا۔ ہونٹوں پر نیچرل سی ہنسی لیے وہ دلیر بھائی کی تصویر بنانے میں اتنا مگن تھا کہ کہیں نزدیک سے اس کے چہرے کی تصویر لیے جانے کا اسے پتا بھی نہیں چل سکا تھا۔ اور اب یہ تھا کون۔ وہ اس پہیلیاں بجھوانے والے کے متعلق تجسس میں تھا کہ ایک اور تصویر آنا شروع ہوئی۔

"اوہ......" وہ ہلکے پھلکے انداز میں ہنس پڑا۔ شکر ہے جس کی توقع تھی۔ وہی نکلی۔ تو مطلب وہ بھی سراپا توجہ ہے، نہ بے خبر، نہ انجان۔ کنعان نے اس مرتبہ اپنی سیلفی بھیجی تھی۔ سوار کے نئے موبائل فون کا پہلا سب سے قیمتی تحفہ۔

"تمہاری توجہ کا یہ انداز پسند آیا مائی لو۔" مسکراتی سیلفی کو محبت سے دیکھتے وہ وہیں سڑک کنارے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ اب کہیں اور جانے کو دل ہی کہاں چاہ سکتا تھا۔

محبت پر میرا اعتماد بہت نیا ہے کنعان، مجھے سنبھالے رکھنے میں میری مدد کرنا، جذباتیت کہتی ہے یہ محبت ہے قید نہیں کہ روزن سے چھن کر آتی روشنی پر قناعت کرلے، اس کے لیے سارے در وا کرنے پڑتے ہیں۔ باہیں کھول کر اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

شاید اور لوگ کرتے بھی ہوں۔ سوار نے ایک آہ بھر کر کرب سے پلکیں موندیں۔ لیکن یہ میں ہوں سوار علی۔ گمراہ، باغی، نا قابل بھروسا۔ ایک تکلیف دہ یاد نے اچانک ساری خوشی کو پل میں غارت کیا۔ سکون کی راہ میں حائل اس کا ماضی، کبھی اسے چین نہ لینے دیتا۔ کوئی بھی خوشی شاید اب اسے مکمل راس نہیں آسکتی تھی۔

"یہ تم کس پہ بھروسا کر بیٹھیں کنعان۔" اس نے تھک کر موبائل والا ہاتھ ڈھیلا سا نیچے گرا دیا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حِرا احمد

انگارے



''السلام علیکم! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' ڈاکٹر نے پروفیشنل مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے مریض سے حال پوچھا۔
تیمور خان کے لیے ہلنا محال تھا لیکن پھر بھی اس نے سر کے اشارے سے ہاں میں سر ہلا دیا۔
یہ دس دن پہلے کی بات تھی۔ اس نے جوں ہی اپنی شفٹ ختم کر کے گھر جانے کے لیے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے دیکھا کہ وارڈ بوائے اسٹریچر کو گھسیٹتے ہوئے خون میں لت پت ایک نوجوان لڑکے کو ایمرجنسی کی طرف لے جا رہے تھے۔ چونکہ اس کی شفٹ ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا دل نہیں مانا کہ ایک مرتے ہوئے انسان کو اس طرح چھوڑ کر اپنی خود غرضی میں آگے بڑھ جائے جبکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگلی شفٹ کی ڈاکٹر ٹریفک میں پھنسنے کی وجہ سے آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔
مریض کی حالت کافی حد تک سیریس تھی اگر اسے فوراً طبی امداد نہ ملتی تو اس کا زندہ بچنا مشکل تھا۔ دونوں ٹانگوں اور ایک بازو پر فریکچر تھا اور بھی جسم کے دوسرے حصوں پر شدید زخموں کے نشانات تھے اور خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے مریض مکمل بے ہوش تھا۔ مریض کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ایک شناسائی کی رمق اس کے دماغ میں ابھری لیکن اگلے ہی پل اس شناسائی کی جگہ غصے نے لے لی۔ وہ اس مریض کو پہچان چکی تھی۔ اس نے فوری طور پر جو ضروری اقدامات تھے وہ کیے اور اگلی شفٹ کی ڈاکٹر آنے تک ہر طرح سے مریض کا خیال رکھتے ہوئے انسانیت کی خاطر اپنی ذمہ داری نبا ہی۔ ڈاکٹر فوزیہ کے آئی سی یو میں داخل ہوتے ہی انھیں مریض کی کنڈیشن کے بارے میں گائیڈ کرتے ہوئے اس نے نے اپنا رخ اپنی گاڑی کی طرف موڑا اور گھر آ گئی۔

☆☆☆

یہ ٹھیک ایک سال پہلے کی بات ہے جب عابی کی ماں اس کی شادی کے لیے بہت زیادہ بے تاب تھیں۔ اور انہوں نے نا جانے کس کس کو عابی کے لیے اچھا رشتہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔
جلد ہی اس کی ماں کی کوششیں رنگ لے آئیں اور عابی کے لیے ایک بہت ہی بڑے گھر سے رشتہ آیا۔ لڑکے اور اس کے خاندان کے بارے میں تمام تر تفصیلات جاننے کے بعد عابی کی ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ماں نے ہسپتال سے واپسی پر ساری تفصیلات بیٹی کے سامنے رکھ دیں۔
اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ایم بی اے کر رکھا ہے۔ اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ شکل وصورت کا بھی بہت اچھا ہے۔ یہ لفافے میں تصویر ہے بیٹا دیکھ لو۔ ہمیں تو تمہارے لیے پسند آیا ہے۔ اگر اللہ کے فضل و کرم سے یہ رشتہ ہو جاتا ہے تو یہ چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔''
''امی ابھی وہ رشتہ دیکھنے بھی نہیں آئے اور آپ نے ہماری جوڑی کو چاند سورج کی جوڑی سے بھی تشبیہہ دے دی۔'' عابی نے ہنستے ہوئے لاڈ سے ماں کو دیکھا۔
''تمھیں کیا پتا میری جان۔ یہ اولاد کتنی پیاری ہوتی ہے۔ ماں کا دل چاہتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر خوشی لا کر اپنی اولاد کو دے دے۔ جب تم ماں بنو گی نا تب تمہیں یہ جذبہ سمجھ آئے گا۔''
''امی آپ بھی نا......'' عابیہ تو اپنی امی کی بات سن کر جھینپ ہی گئی۔
''اچھا۔ میں تمہارے ابو کو کھانا دے لوں، اور ہاں یہ لڑکے والے تمھیں کل دیکھنے آ رہے ہیں۔ میری جان۔ اچھا سا تیار ہو جانا اور کل ہاسپٹل سے بھی تھوڑا جلدی نکل آنا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔
''جی امی ٹھیک ہے۔ آپ چلیں میں آتی ہوں۔''
عابیہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لیے اسے بے حد ناز و نعم کے ساتھ پالا گیا تھا۔ بے انتہا لاڈ پیار نے بھی اسے بگڑنے نہیں دیا۔ وہ ایک معصوم، باکباز اور بے حد حساس لڑکی تھی۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایک گورنمنٹ ہاسپٹل میں ڈاکٹر تھی۔ ماں ہاؤس وائف تھی اور باپ سرکاری نوکری سے ریٹائر تھے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔
خالدہ بیگم جوں ہی کمرے سے باہر گئیں۔ عابیہ کی نگاہ بیڈ پر پڑے لفافے کی طرف مبذول ہو

گئی اور اس کا ہاتھ بے اختیار لفافے کی طرف گیا۔ لفافے سے تصویر باہر نکالی تو ایک نوجوان لڑکا جس کا نام تیمور خان تھا اپنی بھرپور وجاہت کے ساتھ مسکراتا ہوا ڈاکٹر عابیہ کے دل کے تاروں کو چھیڑ گیا۔ اسے وہ لڑکا اپنا آئیڈیل لگا۔ وہ خود اپنی اس کیفیت پر حیران رہ گئی۔ وہ کوئی ٹین ایج لڑکی نہیں تھی جسے اس عمر میں رنگینیاں بہت بھاتی ہیں بلکہ وہ پچیس سال کی ایک سوبر نہایت قابل اور ذہین ڈاکٹر تھی۔ عابیہ کو یقین کرنے میں مشکل ہوئی۔ لیکن، ہاں اسے کسی ناول میں لکھی گئی بات یاد آئی کہ پہلی نظر کی محبت کا بھی اپنا ہی نشہ ہے اور واقعی اسے اس بات کی سچائی کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس نے تصویر دوبارہ لفافے میں ڈال کر اپنے تکیے کے نیچے رکھا اور کل کے آنے کا شدت سے انتظار کرنے لگی۔

دوسرے دن جوں ہی وہ بن سنور کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ رشتے کروانے والی زبیدہ آپا کے ساتھ والے صوفے پر ایک بے حد ماڈرن اور مہنگے ترین کپڑوں میں ملبوس ایک بڑی عمر کی خاتون کو ارد گرد کا جائزہ لیتے پایا۔ یقیناً یہ لڑکے کی ماں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سلام کرتی رشتے والی آپا زبیدہ عابیہ کو دیکھ کر فوراً ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہتی اٹھیں اور اسے لا کر رضوانہ بیگم کے سامنے بٹھا دیا۔ رضوانہ بیگم نے سر سے پاؤں تک عابیہ کو بغور دیکھا اور پھر اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

''دیکھیں ہم بڑے اسٹیٹس والے خاندانی لوگ ہیں۔ ہم جیسے بڑے لوگ حسب نسب اور سماجی حیثیت پر کمپرومائز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ کی بیٹی شکل و صورت کی لاکھ اچھی اور پڑھی لکھی سہی لیکن میرا بیٹا تو شہزادوں کو بھی مات دیتا ہے۔ لہٰذا مجھے نہیں لگتا کہ یہ جوڑی ایک ساتھ چل سکے گی۔ آپا زبیدہ نے تو مجھے آپ لوگوں کی حیثیت اور اسٹیٹس کے بارے میں کچھ اور ہی بتایا تھا لیکن معاف کرنا بہن، یہاں تو لگتا ہے کہ بس گزارا ہی مشکل سے ہوتا ہوگا۔ لیکن خیر بھئی ہمیں اس سے کیا۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں تو کسی بھی کم حیثیت گھر میں اپنے بیٹے کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ لوگ اپنی بیٹی کے لیے کوئی اور رشتہ دیکھ لیجیے۔ خدا حافظ!''

اس سے پہلے کہ عابیہ کی ماں کچھ بولتیں وہ نخوت سے ایک نظر گھر پر ڈالتے ہوئے تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف چل پڑیں۔

عابیہ کی ماں نے کھڑے ہو کر انہیں روکنا چاہا، لیکن عابیہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں ایسا کرنے سے روک لیا۔ زبیدہ آپا بھی کچھ کہے بغیر رضوانہ بیگم سے بات کرنے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

جس لڑکی کی خوب صورتی اور ذہانت کے چرچے دور دور تک تھے، تیمور خان کی ماں کو وہ اپنے بیٹے کے پاسنگ بھی نہیں لگی۔ عابیہ کو ایک پل میں اس عورت نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ کل جب سے تیمور خان کی تصویر دیکھی تھی تب سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو گئی تھی۔ لیکن اسی خوابوں کی دنیا نے اسے واپس حقیقت کی دنیا میں لا کر دوبارہ سے پٹخ دیا۔

''امی آج کل نیک نامی شرافت کوئی نہیں دیکھتا۔ ہر کسی کو بڑا خاندان اور بڑی حیثیت کا لالچ ہوتا ہے اور جب رشتوں کو دولت کے ترازو میں تولا جائے تو پھر رشتہ کہیں نہیں رہتا، یہ صرف ہوس ہوتی ہے۔ آپ زبیدہ آپا کو منع کر دیں کہ آج بعد وہ میرے لیے کوئی رشتہ نہ لے کر آئیں اور جتنی عزت افزائی انہوں نے آج ہماری کروادی ہے بس اتنی ہی کافی ہے۔ آج کے بعد میں اس رشتے کروانے والی عورت کو دوبارہ کبھی بھی اپنے گھر میں نہ دیکھوں۔''

اس کے دل میں کچھ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ اتنی بے عزتی وہ بھی اس انسان کی ماں کے ہاتھوں جسے اس نے پہلی ہی نظر میں اپنا دل دے دیا تھا۔ وہ اپنی اس قدر بے وقعتی پر خون کے آنسو روتے ہوئے کمرے میں بھاگ گئی۔

عابیہ کی ماں ابھی تک یہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ کوئی اتنی خوب صورت، خوب سیرت اور اعلا تعلیم

یافتہ لڑکی پر صرف اور صرف دولت اور اسٹیٹس کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے۔

☆☆☆

یہ کسی کی قربت کا احساس تھا یا کسی کی دعا کا اثر کہ ایک ایسا مریض جس کا بچ جانا تقریباً ناممکن دکھائی دیتا تھا وہ تیزی سے زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دن تیزی سے گزرتے جارہے تھے۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ تیمور کے دل میں ڈاکٹر کی محبت امربیل کی طرح گھر کرتی جارہی تھی۔ وہ اس کا چیک اپ کرنے آتی اور ایک لمحے کے لیے اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کے سارے زخم بھر گئے ہوں۔ وہ رفتہ رفتہ ڈاکٹر کے زیر اثر آرہا تھا۔ بے شمار لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں لیکن تیمور کو سفید اوور آل میں اس لڑکی کی سادگی اور معصومیت نے اپنا دیوانہ بنالیا تھا۔ اپنا ہائی اسٹیٹس، اور چارمنگ پرسنالٹی اسے ڈاکٹر کے سامنے زیرو نظر آنے لگی تھی۔

تیمور کو ایڈمٹ ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ اس لیے اب اس کے زخم کافی حد تک مندمل ہو چکے تھے۔ اس کی ٹانگوں پر پلاسٹر کھل چکے تھے اور وہ اب آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔

دو تین دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا جانے والا تھا۔ لیکن اس کا دل ڈسچارج ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اب اس کی زندگی کی ہر صبح ایسی ہو جس میں ڈاکٹر مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئے اور اس سے حال چال پوچھے۔ وہ جب صبح سو کر اٹھے تو ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو اور وہ بس اسے دیکھتا ہی جائے اور دیکھتا ہی جائے۔ وہ طے کر چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر سے شادی کرے گا۔ تیمور نے موقع دیکھتے ہی اس کے سامنے اپنا حال دل کھول کر رکھ دیا۔

''مسٹر تیمور آپ میرے لیے صرف ایک مریض تھے۔ آپ جیسے ہزاروں مریض روزانہ ہمارے پاس آتے ہیں اب اس کا کیا مطلب ہے کہ ہر کوئی آپ کی طرح اظہار محبت کرے اور میں اس کے صحت یاب ہونے کے بعد اس کے ساتھ چل پڑوں؟'' اس نے طنزیہ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''دیکھیں آپ مجھے کوئی ایرا غیرا نا سمجھیں۔ ہمارا شہر میں ایک اسٹیٹس ہے۔ ایک نام ہے۔ میری مام......'' ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کے تو سر پر لگی اور تلووں میں بجھی۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کا اسٹیٹس کتنا ہائی ہے تیمور خان۔ ہم جیسوں کو تو آپ کی مام ویسے ہی جوتے کی نوک پر رکھتی ہیں اور انہیں انسان سمجھنے کی تو غلطی بھی نہیں کرتیں۔ اسی لیے آپ کو تنبیہہ کر رہی ہوں کہ آئندہ کبھی میرے راستے میں نہ آئیے گا۔'' تیمور کی بات سنے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر خود راہداری کی طرف بڑھ گئی۔

تیمور ابھی وہیں کھڑا تھا کہ رضوانہ بیگم (جو تیمور کی ماں تھیں) اسے ڈسچارج کروانے کے لیے آگئیں اور تیمور کو کسی ڈاکٹر سے الجھتے دیکھتے ہوئے ایک دم آگے بڑھنے ہی لگیں تو ڈاکٹر عابیہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہیں رک گئیں۔ انھیں یقین نا آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے وہ بری طرح اپنے اسٹیٹس کے نشے میں ٹھکرا کر آئی تھیں۔ لیکن اب تیمور کی آنکھیں تو انھیں کوئی اور ہی کہانی سنارہی تھیں۔ وہ خیال جھٹک کر آگے بڑھ آئیں اور گم صم تیمور کو لے کر گھر واپس آگئیں۔

''مام! ڈاکٹر عابیہ آپ کو کیسے جانتی ہیں اور آپ کے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟'' تیمور بگڑے ہوئے تیور میں گھر آتے ساتھ ہی رضوانہ بیگم سے الجھ پڑا۔

''بیٹا یہ وہی لڑکی تھی جس کا میں رشتہ دیکھنے تمہارے لیے گئی تھی اور......''

وہ درمیان میں ہی بولا اٹھا۔

''لیکن امی! آپ نے تو مجھے کبھی اس لڑکی کی تصویر نہیں دکھائی اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' اس نے اپنی ماں سے غصے پوچھا۔

''میرے بچے، میری جان۔ اب تمہیں کیا بتاتی۔ دراصل ان لوگوں کا گھر بار اسٹیٹس مجھے پسند نہیں آیا تھا۔''

تیمور جذباتی ہو گیا۔

"مام۔ بھاڑ میں گیا آپ کا اسٹیٹس۔ آپ لوگوں کو کھرے اور کھوٹے کی کوئی پہچان نہیں؟ آپ لوگ ہر کسی کو صرف اور صرف دولت، جائیداد اور حیثیت کے ترازو میں ہی کیوں تولتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کی اچھائیوں اور برائیوں پر غور کرنے کی زحمت بھی کرلیا کریں۔ اوہ مائی گاڈ۔ مام......!"

تیمور نے تو اپنا سر ہی تھام لیا۔ "اور آپ نے انکار بھی کس طرح کیا ہوگا یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" تیمور اپنی ماں کی نیچر کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"بیٹا۔ تمہاری طبیعت ابھی مکمل ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تم آتے ساتھ ہی کس بحث میں پڑ گئے ہو؟ لیٹ جاؤ، آرام کرو۔"

"نہیں ہوتا آرام مام۔ نہیں ہوتا آرام۔ جس لڑکی کی عزت کو آپ ان کے گھر جاکر دو ٹکے کی کر کے آئیں ہیں نا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ اگر اس رات اپنی شفٹ ختم کرنے کے باوجود وہ وہاں میرے لیے نہ رکتی تو آج آپ کا بیٹا زندہ نہ ہوتا۔"

"آپ کل ہی میرے ساتھ چلیں گی اور ان لوگوں کے گھر جاکر ان سے معافی مانگیں گی۔"

"مم...... میں...... بیٹا...... میں ماں ہوں تمہاری۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں مام۔ اگر آپ میرے ساتھ کل ان کے گھر نہ گئیں تو اب کی بار آپ کا بیٹا سچ مچ نہیں بچے گا۔"

"اللہ نہ کرے۔" انہوں نے بے اختیار تیمور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

رضوانہ بیگم تو اپنے شاندار سے بیٹے کی ایسی دیوانوں والی حالت دیکھ کر دنگ ہی رہ گئیں۔ قدرت ایسے انہیں مات دے گی انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اولاد کو ماں باپ سے بڑھ کر کوئی نہیں چاہ سکتا۔ تھیں تو وہ ماں ہی...... تو کیسے پھر اپنے جوان خوبرو بیٹے کی یہ دیوانوں سی حالت دیکھ پاتیں۔ ان کا غصہ اور طنطنہ ایک منٹ میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور انھوں نے تیمور کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔

☆☆☆

جوں ہی تیمور نے دروازے پر بیل دینے کے لیے ہاتھ رکھا۔ عابیہ نے بے اختیار دروازہ کھول دیا۔ تیمور کو خوش گوار حیرت ہوئی۔

"آپ...... یہاں......" عابیہ نے ناسمجھی کی کیفیت میں سر ہلایا۔

"عابی بیٹا۔ کون ہے۔ اندر تو آنے دو۔"

خالدہ پوچھتے ہوئے دروازے پر آئیں اور بیگم رضوانہ کو دیکھ کر عابیہ کو پیچھے ہٹا کر خوش اخلاقی سے کہنے لگیں۔

"آیئے، آپ اندر تشریف لائیے۔"

"دیکھیں۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں اپنے اسٹیٹس کے زعم میں اتنا اونچا اڑ رہی تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کی خوشیاں نظر ہی نہیں آئیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا۔ مجھے معاف کردیں۔" رضوانہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہی عابیہ کی ماں سے التجا کی۔

"بیٹیاں اتنی سستی نہیں ہوتیں بہن، کہ ان کی عزت کی یوں دھجیاں بکھیر دی جائیں۔ اس لیے ہمیں یہ رشتہ نامنظور ہے۔"

رضوانہ بیگم کو یقین نہیں آرہا تھا کوئی انہیں بھی اس طرح دھتکار سکتا تھا۔ عابی کی ماں کے انکار کے بعد رضوانہ بیگم کو اپنا رہا سہا غرور بھی خاک میں ملتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنی جھوٹی انا اور شان و شوکت کے ہاتھوں عابی کے گھر والوں کو پہنچنے والی جذباتی تکلیف کو اب خود بھی محسوس کر رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو کھو دینے کا تصور بھی کرنا محال تھا۔ اس لیے اپنے بیٹے کی خوشیوں کی خاطر رضوانہ بیگم عابیہ کی ماں کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ عابیہ کی ماں نے اٹھ کر انہیں گلے لگالیا۔ ایک انکار رضوانہ بیگم کا سارا غرور اور تکبر خاک میں اڑا کر لے گیا تھا۔

تیمور نے عابیہ کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر زیر لب مسکرا اٹھے۔

☆☆

ناولٹ

مصباح علی سیّد

کانچ سے سائبان

منہل اپنی نانی اور مما کے ساتھ رہتی ہے۔ برابر کے پورشن میں اس کے ماموں رہتے ہیں جن کے بیٹے شجی کو وہ پسند نہیں کرتی۔ کالج کے ایک ٹرپ پر جاتے ہوئے اس کی دوستی ذیاج سے ہو گئی ہے۔

الحمد لیگل ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ اعظم لیاقت ''الحمیدز'' میں فنانس منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کے نامناسب رویے کی وجہ سے عابس حمید نے اسے ہٹا کر ہائم انسر کو ترقی دے کر اعظم لیاقت کی پوسٹ اسے دے دی۔ اعظم لیاقت ذات کی نفی کرنے والوں سے تو تھا نہیں، اس نے جاب چھوڑ دی لیکن وہ وقتاً فوقتاً آفس میں ملنے کے لیے آتا رہتا ہے۔

یونیورسٹی میں ہائم انصر نے ردابہ کو پرپوز کیا لیکن ردابہ نے اپنی محتاط فطرت کی وجہ سے سختی سے انکار کر دیا۔ بعد میں ابا کے دوست کی بیٹی نکل آنے کی وجہ سے ہائم نے اپنی ماں نعیمہ خاتون کو ردابہ کے لیے رشتہ لے جانے پر مجبور کیا۔

ہائم اور ردابہ کی شادی ہو گئی لیکن نعیمہ خاتون کا پرانی رنجش کی وجہ سے ردابہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے۔

تیسری قسط

اس نے فون بند کرتے ہی مس رابعہ کو کال ملائی تھی، ڈیوٹی آور ختم ہو رہے تھے رابعہ سب سمیٹتے اٹھ رہی تھی، اسے یہاں سے مارکیٹ جانا تھا، موبائل بیگ میں ڈالا ہی تھا کہ ٹون بجنے لگی، اس نے نمبر دیکھ کر جلدی سے پک کیا۔

''اوہ! شکر ہے ہائم۔ آپ کا فون آ گیا...... میں کرنے ہی والی تھی۔''

''خیریت؟'' ہائم کو اچنبھا ہوا۔

''لو بھئی۔ ابھی بھی خیریت، تین دن کا کہا تھا تم نے، ایک ہفتہ ہو گیا ہے تمہیں چھٹیاں کرتے ہوئے...... میری شادی ہے، میں ریزائن کر چکی ہوں، خدا کے واسطے ہائم مجھ پر رحم کھائیں، مجھے بھی گھر پر کام ہیں۔ ویسے بھی آپ کی مدر اِن لاء گھر شفٹ ہو گئی ہیں، پلیز اب آفس آ جائیں۔''

اس کے ایک ہی سانس میں شکوہ کرنے پر ہائم ہنس پڑا تھا۔

''اوکے...... اوکے۔ میں کل آ جاؤں گا۔''

ہائم نے جب اسے فائل کا کہا وہ چونک ہی گئی۔ ''کون سی فائل؟''

''ارضا فارما کی۔ براؤن کلر کا کور ہے، اُدھر میرے ڈرا میں رکھی ہے۔''

''اچھا اچھا وہ......!''

رابعہ نے جو کچھ بتایا تھا وہ سنتے ہی ہائم یک دم بیڈ کراؤن سے پشت ہٹاتے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''لیکن کیوں مس رابعہ...... آپ نے وہ فائل کیسے دے دی، آپ کو دینے سے پہلے ایٹ لیسٹ مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا...... اوہ مائی گاڈ۔''

اس نے غصہ فون کاٹ کر نکالا۔

منہل بیزاریت سے بار بار کہہ رہی تھی۔

''بابا مجھے ماما کے پاس جانا ہے...... چلیں ناں۔'' اس کی بے وقت ضد پر وہ چڑ گیا۔

''ایک تو تمہاری اماں بھی وہاں جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ اچھی ماں بیمار ہوئی ہیں، گھر کی، میاں کی فکر ہی نہیں...... ہونہہ ماں کی بیماری کا اچھا بہانہ مل گیا

ردابہ کو۔'' وہ غصے میں بڑبڑائے جارہا تھا، فائل کا سارا غصہ اب کہیں اور نکلنے والا تھا۔

☆☆☆

ہائم جب تک گھر آیا، تقریباً سب کھانا کھا چکے تھے، ثمرین آپی جانے کی تیاری میں تھیں، اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

''اتنی دیر تمہارا انتظار کیا کھانے پر، کہاں رہ گئے؟''

''الیاس کی طرف تھا، اٹھتے دیر لگ گئی۔''

اجو کو چاچو دیکھتے ہی فرمائشیں یاد آجاتی تھیں وہ توتلی زبان میں کوئی بات پوچھنا چاہ رہا تھا ہائم نے محبت میں جھک کر اسے گود اٹھا لیا ''آپ لوگ جارہے ہیں؟ ثمرین کو ماں سے ملتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ ''ظاہر ہے اب جانا ہی ہے۔ تم بہن کی شکل دیکھتے ہی غائب ہو جاتے ہو۔ بیگم تمہاری منہ بنا کمرے کی ہو جاتی ہے۔''

داماد کی پروا کیے بغیر نعیمہ کے بے لاگ بولنے پر جہاں ہائم کو برا لگا وہاں ثمرین نے بھی اشارتاً انہیں آہستہ بولنے کا کہا تھا۔ مگر نعیمہ کو ڈر تھا کسی کا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں وضاحت دے کر رکیں۔

''میں کون سا غلط کہہ رہی ہوں......اب میاں



کھانے میں شامل نہیں ہوا، تو کم از کم ردابہ کو تو ساتھ بیٹھ کر کھالینا چاہیے تھا۔ مگر نہیں...... کھانا لے، اندر چلی گئی، جیسے مہارانی ہو کہیں کی۔"

انہوں نے خفگی سے ہائم کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا، ہائم کی بھی نگاہ ادھر ہی اٹھی، وہاں مکمل سناٹا تھا، ثمرین کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آیا۔ نیم تاریک کمرے میں صرف منہل لیٹی تھی۔ واش روم کی لائٹ بھی آف تھی، اس کی نگاہ کمرے کے دوسری سمت کھلنے والی چھوٹی سی بالکونی پر گئی۔ وہ ادھر ہی گھٹنوں کے گرد بازوں لپیٹے میٹ پر بیٹھی تھی۔ ہائم کے کھنکارنے پر بھی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ بھی ساتھ ہی آ کر بیٹھ گیا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو۔"

"انتظار میں۔ کہہ کر گئے تھے نا، جلد کام نبیڑ کر رکھنا، امی کی طرف جانا تھا...... میرا تو کب سے کام ختم ہو گیا۔"

"سوری یار۔ دیر ہو گئی۔ الیاس بہت انسسٹ (اصرار) کر رہا تھا کھانے پر۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے گردن پھیر کر نروٹھے پن سے دیکھا۔ پھر دھیمی سانس لیتے سامنے دیکھنے لگی۔

"تم نے کھالیا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا، کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھی اندر چلی گی وہ بھی اٹھ گیا۔

"رئیلی سوری۔ کل چلیں گے۔ بلکہ کل تمہارے لیے سرپرائز ڈنر بھی ہے، واپسی پر اُدھر بھی چلیں گے۔"

اس نے خاص جواب نہیں دیا سوائے۔ "اٹس اوکے۔" کہہ کر منہل کے قریب ہو کر لیٹ گئی۔ دونوں کی بظاہر بند آنکھیں جلتے چراغ کی مانند سلگتی رہیں۔

☆☆☆

نعیمہ تانیہ کے سر پر تیل کی مالش کر رہی تھی، تانیہ گود میں ننھی منہل کو کھلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی بس کر دیں، میرا سر دکھنے لگا ہے۔"

"گھاس پھوس جیسے بال ہیں تیرے، تیل نہ ڈالوں تو رنگ بالکل ہی اڑ جائے۔" انہوں نے نئی مانگ نکال کر تیل انڈیلا۔

"آپ کے رگڑوں سے بچیں گے تو رنگ بحال ہو گا ناں۔"

وہ آج آفس سے جلد آ گیا تھا، کچھ ریسٹ کے بعد ابھی کمرے سے نکلا تو، بات کرتے ہوئے ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں تمہاری نسل کے کیوں کاٹتا ہے تیل......" ہائم کے تبصرے پر ایک چبھتی نگاہ ڈالی اور زور شور سے تانیہ کی کن پٹیاں رگڑنے لگیں "ایک ہمارا وقت تھا کہیں آنا جانا ہو، اماں تیل لگا کر کس کے چٹیا باندھ کر بھیجتی تھیں۔ اب آج کل کھلے چھتے لیے پھرتی ہیں، تبھی ہر چیز سے برکت اڑ گئی۔"

"تانی کل سے یونی تیل لگا کر جانا، سمجھیں۔"

وہ ٹانگ پر ٹانگ جماتے، شرارتاً محظوظ ہوا۔ جواباً تانی نے منہ چڑھایا اور ننھی منہل کے گال چھیڑتے حمایت لی۔

"منہل۔ دیکھ لو بابا پھوپھو کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" کل کیوں جائے گی، کل تو چھٹی کرے گی یونی سے...... ہیں ناں۔"

نعیمہ نے اس کے سر کو ذرا سی اپنی جانب جنبش دی تیز چلتے ہاتھ قدرے ڈھیلے پڑے تھے۔

"کیوں خیریت؟" ہائم نے پوچھا۔

"طارق کی بیٹی نے دسویں میں ٹاپ کیا ہے، سب کی دعوت رکھی ہے۔ تم بھی آفس سے جلدی آ جانا۔"

آخری فرمان پر اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئی تھیں، آج بھی وہ صرف اس لیے جلدی آیا تھا منہل اور ردابہ کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ کل ان کی دوسری ویڈنگ انورسری تھی۔ پہلی انورسری پر منہل کی آمد کی وجہ سے گھر میں ایک ہنگامہ اترا رہتا تھا، نعیمہ کے کہنے پر نظر انداز کر دی تھی۔ مگر اس سال اس کا دل تھا کسی خاص جگہ وقت گزارنے کو تھا۔ جب سے اس نے گاڑی لی تھی ردابہ کے ساتھ کچھ فرصت

سے جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اماں کے نئے فرمان نے بالکل ہی اوس گرادی۔

"امی آپ اور تانی چلی جایئے گا۔ ایکچوئلی۔"

"کیا ایکچوئلی......" اس کی پوری بات سنے بغیر وہ بولیں۔ "پچھلے مہینے تمہارے سالے کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، ضماد زارا کو لے کر عیادت کے لیے گیا تھا، اب اس کے سسرال میں فنکشن ہے کیا تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ طارق ایک ہی تو سالا ہے ضماد کا، تم اس سے بھی نہیں ملو گے۔"

"امی وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

"کیا لیکن......"

ردابہ نے چائے لاکر پاس رکھی۔ نعیمہ نے اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر تانیہ کے بال چھوڑے تیل کی شیشی پر ڈھکن کسنے لگیں۔

"امی کسی اور دن جاکر ہم گفٹ اور مبارک دے آئیں گے۔ ایکچوئلی کل میرا ردابہ کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ کل ہماری اینورسری ہے۔"

اس کی ایسی شاندار وضاحت نعیمہ کو تپانے کے لیے خوب ہی تھی۔

"دو سال ہوگئے تمہاری شادی کو، ابھی تک چونچلے نہیں ختم ہوئے۔ ایسے بیوی پر لٹو ہوا جارہا ہے، جیسے شادی کی تجھے امید ہی نہیں تھی۔"

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟" ہائم خجل ہوا تھا۔ "کیوں، کیا غلط کہہ دیا میں نے۔ تجھے بیوی کے علاوہ کچھ دکھائی بھی دیتا ہے، بھلا۔ ماں بہن بھائیوں کے رشتہ دار جائیں بھاڑ میں۔"

بولتے ہوئے انہوں نے ایک تند نگاہ ردابہ پر ڈالی، اس کے اندر کی خوف زدگی کا خیال کیے بغیر بوتل اس کے ہاتھ میں زور سے تھمائی۔

"ہاں بھیا جاؤ۔ کل جاؤ آج جاؤ۔ روز گھومو پھرو، عیاشی کرو۔ میں کون ہوتی ہوں، کچھ کہنے سننے والی۔ میری کیا حیثیت۔"

وہ "امی امی" منمناتا رہ گیا مگر وہ سنیں تب ناں، تانیہ نے منہل کو نیچے بٹھایا، بالوں کو جوڑے میں لپیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"امی۔ بھائی کہہ تو رہے ہیں، بعد میں چلے جائیں گے آپ بھی ناشروع ہی ہوجاتی ہیں، ایک بات پر۔ جانے دیں کبھی کبھی تو پروگرام بنتا ہے، ان کا۔" "میں نے کب روکا ہے، کسی کو کہیں آنے جانے سے، اتنی میری مجال۔ وہ اور مائیں ہوتی ہیں جن کے بیٹے ان کے ایک اشارے پر چلتے ہیں۔ یہاں تو جب بات کرو، اپنا ہی موقف پہلے رکھا ہوتا ہے۔ جاؤ بھئی، میری طرف سے ابھی چلے جاؤ، انتظار کا ہے کا۔" فرش پر بیٹھی ریں ریں کرتی منہل کو نعیمہ نے جھک کر گود میں اٹھایا۔ "اور بعد میں بھی جاکر احسان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں چلی جاؤں گی، ہوجائے گی تحفہ مبارکی سب کی طرف سے، کوئی تمہارے تحفوں کا بھوکا نہیں بیٹھا ہوتا۔"

ان کے لہجے سے زیادہ نظروں کی کاٹ میں ردابہ کو کھڑے رہنا دشوار ہوگیا، وہ سامنے سے ہٹ گی، ہائم بھی بدمزا ہوکر پہلو بدلتا، میگزین اٹھا کر پڑھنے لگا۔ چائے کے کپوں پر بھاپ معدوم ہوکر تھکی تہ تیرنے لگی تھی، چائے کی بسی سلوٹوں میں ابھی بہت کچھ دبانا باقی تھا۔

☆☆☆

یہ تو اُسے معلوم تھا، مما کے اسکول میں آج پرنسپل کی فیئر ویل ہے، اور ایسی آفیشلی پارٹیز پر وہ اکثر بہت بہت دیر کردیتی تھیں۔ موقع غنیمت ہی تھا۔ ذیاج کو نانو سے ملوانے کا، اس نے یونی آتے ہی ذیاج سے گھر آنے کا کہا تھا، اور ذیاج اس کی بات سن کر قدرے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

"استغفراللہ۔ تم مجھے ایسے انوائٹ کررہی ہو، اگر کسی نے سن لیا تو، کیا سوچے گا ہمارے بارے میں۔"

"کیوں، میں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا؟"

"اپنے الفاظ پر غور کرو۔" ذیاج نے اس کے الفاظ رازدارانہ لہجے میں دہرائے۔ "مما پانچ چھ بجے تک واپس آئیں گی تم اس سے پہلے پہلے آجانا۔"

''ذیاج......'' منہل نے دانت جما کر اسے گھونسا دکھایا۔
''مجھ معصوم کو کیوں گھور رہی ہو، میرا کیا قصور ہے، تم نے یہی کہا ہے۔''
''بنو نہیں۔ اتنے معصوم نہیں ہو تم۔ اس سے پہلے میں نے یہ بھی کہا ہے نانو تم سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہیں......'' اسے چڑاتے ہوئے مزید کہا تھا۔
''اصل میں وہ دیکھنا چاہتی ہیں، میں نے کوئی اندھا، کانا تو پسند نہیں کر لیا۔''
اُس کی اس بات کا ذیاج نے خوب ہی ریکارڈ لگایا تھا۔
''تمہاری حرکتوں کی وجہ سے ایسا سوچتی ہوں گی۔ انہیں یقین ہوگا، تمہیں کوئی اندھا کانا ہی پرپوز کر سکتا ہے، بلکہ ملنے گھر تک آسکتا ہے۔''
اور اب ذیاج کے سر پر منہل کے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل زور سے بجی تھی۔
''دفع ہو جاؤ، اور اگر اب تم آئے بھی تو اندھے کانے ہو کر ہی واپس جاؤ گے۔''
خیر۔ یہ تو منہل کا صرف کہنا ہی تھا۔ جب وہ اس کے گھر آیا، تو کافی عزت سے پیش آئی تھی، کہیں سے گمان نہیں ہو رہا تھا یہ یونی کی لڑاکا منہل ہی ہوگی۔ کنفیوز تو ذیاج بھی تھا۔ کسی لڑکی کے گھر وہ بھی بر دکھوے کے لیے خود اکیلے منہ اٹھائے چلے آنا اس کا پہلا اور آخری تجربہ تھا۔ اگر یہ خبر اس کے گھر تک چلی جاتی خیر اس کی بھی نہیں تھی۔ بے شک پسند ناپسند کا ماں باپ نے پورا اختیار دے رکھا تھا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا اکلوتے لاوارثوں کی طرح خود ہی اپنے رشتے کرتے پھرو۔ اس اندیشے کو دوسری بار منہل پر آشکار کیا تھا۔
''ویسے مجھے بہت عجیب سا فیل ہو رہا ہے، مجھے اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا، مما کو کہتا تو وہ ساتھ آجاتیں۔ انہیں بالکل بھی اعتراض نہیں ہونا تھا۔''
''اوہ ہو۔ فی الحال تم تو نانو سے مل لو۔ انہیں نیکسٹ ٹائم لے آنا۔'' منہل نے چائے ٹیبل پر رکھتے اسے حوصلہ دیا تھا۔
''اتنی دیر سے تو آیا ہوا ہوں، کب فری ہوں گی وہ۔''
یہ تو اب منہل کو بھی نہیں پتا تھا، نانو کب فری ہوں گی۔ ذیاج کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر منہل نانو کو بلانے گئی تو عین تب ہی بڑی ممانی نانو کو بلانے آگئی تھیں، ان کے پورشن میں ایک پرانی ملنے والی آئی ہوئی تھیں، جن سے ملوانے ممانی نانو کو لے گئیں اور ابھی تک نانو واپس نہیں آئی تھیں۔
منہل بہانے سے دو بار ان کی جانب چکر لگا آئی تھی مگر وہاں چائے کا ایسا دور چل رہا تھا جس سے لگتا تھا وہ خاتون کچھ زیادہ ہی قریبی ہیں اور جانے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں، اس نے کھڑکی سے نانو کو آنے کا اشارہ کیا، جواباً فریدہ نے بھی اُسے ایسے تسلی دی، ''کہ بس آرہی ہوں۔''
''دیکھو منہل۔ تمہارے کہنے پر میں یہاں آتو گیا ہوں، اب یہ نہ ہو تم یونی کی وہ اندھے کانے والی بات پوری بھی کروا دو۔ اگر آنٹی غصہ ہوئیں، تو میں سچ میں بھاگ لوں گا، اکیلی بھگتنا۔''
''کیا ہو گیا ہے، چپ کر کے بیٹھے رہو۔'' اس نے ذیاج کو ڈپٹ کر حوصلہ دیا تب ہی تنجی ڈرائنگ روم کے باہر سے گزرا، اور اسے کسی کے اندر موجود ہونے کا گمان ہوا تھا، وہ اندر چلا آیا۔ اس کی آنکھوں سے زیادہ بھنویں بری طرح سے سمٹیں، ایک تنقیدی نظر ذیاج کو دیکھ کر منہل کی جانب دیکھا، اس کی سانس بس خشک ہونے کے قریب ہی تھی۔ ذیاج نے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ اس کی جانب بڑھایا لیکن تنجی نے ہاتھ ملانا تو درکنار اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھا۔
''کون ہے یہ؟''
''میرے کلاس فیلو۔ انہیں نوٹس چاہیے تھے، وہی لینے آئے ہیں۔''
تنجی نے گھبرائی ہوئی منہل کو کروفر سے دیکھا اور باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ''باہر آؤ ذرا۔'' کہہ کر وہ

باہر نکل گیا، منہل بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ ذیاج کے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی، اس شخص کا تو اس نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا، وہ بھی اٹھ کر باہر دروازے کی جانب بڑھا، جہاں شجی کی آواز اس کے کانوں میں جارہی تھی۔

''نوٹس لینے آنے والوں کو ایسے بٹھا کر چائے نہیں پلائی جاتی، بے وقوف بنارہی ہو۔''

''چائے کا نانو نے کہا تھا۔''

''اچھا۔ واہ۔ دادی اماں زیادہ ہی ایڈوانس نہیں ہوگئیں، تمہیں یہاں تنہائی میں چائے پینے، پلانے کا کہہ کر، خود تائی اماں کے پورشن میں چلی گئیں، پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔ سچ سچ بتاؤ کون ہے اور کس تعلق سے یہاں بٹھا رکھا ہے۔''

''کیسی باتیں کررہے ہیں آپ۔ بھائی۔''

وہ تلملا کر بولا ''شجی نام ہے میرا۔''

''ایکسوزمی مسٹر شجی۔'' ذیاج باہر نکل کر ذرا سختی سے بولا۔ ''میں یہاں نوٹس لینے نہیں بلکہ نانو کے بلانے پر، ان ہی سے ملنے آیا ہوں۔ کہاں ہیں وہ ذرا بلادیں۔'' شجی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فریدہ دوسری جانب سے آگئیں اور فوراً ہی صورت حال سمجھ گئیں۔ انہوں نے لہجے کی سختی کو کنٹرول کرتے ہوئے شجی سے کہا۔

''شجی، تم جاؤ، اپنا کام کرو۔''

''میرے کام کی فکر میں سب ہلکان رہتے ہیں۔ پہلے اپنی نواسی کے کام تو پوچھ لیں، اجنبی سے تنہائی میں مل کر کون سے کام کیے جارہے ہیں، ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے، جس کی آپ مثال دیتی ہیں، وہ اصل میں کتنی پارسا ہے۔''

''شجی۔'' نانو ذرا سخت ہوئیں۔ ''میں نے کہا ناں، یہاں سے جاؤ۔'' نانو نے شجی کی تلملاہٹ کو یکسر بھلا کر پھر ذیاج کی جانب دیکھا۔ ''بیٹا۔ تم اندر بیٹھو، اسے ذرا غلط فہمی ہوگئی ہے، تم بیٹھو شاباش۔ منہل۔ جاؤ، ذیاج کو اندر لے جاؤ۔''

''نہیں نانو۔ میں پھر کسی دن اپنے پیرنٹس کے ساتھ آؤں گا۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ تیز قدموں سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ منہل اس کے باہر جاتے قدم دیکھتی رہی، غصہ تو فریدہ کو شجی پر بہت آیا لیکن وہ جتنا اظہار کرتیں اس نے چار لگا کر شور مچادینا تھا، پھر احمد اور علی کی الگ سے عدالت لگتی۔ مناسب یہی تھا وہ منہل کو لے کر وہاں سے ہٹ جائیں۔ اور منہل تو اس وقت اس قیدی پرندے کی مانند لگ رہی تھی، جس کے پنجرے کا دروازہ بند ہونے سے رہ گیا، اور وہ فیصلہ نہ کرپائے، اسے اڑنا ہے یا رہنا۔ باہر گھات لگائے شکاری، اندر فاقوں کا خوف۔

☆☆☆

رابعہ اور ہائم کی اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ تھی۔ جب بھی کسی ایک کو کہیں جانا ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ بہت آسانی سے کام سنبھال لیتا تھا۔ یہ اگلے دن کی بات تھی، وہ رابعہ ہی کی بدولت جلدی گھر آگیا تھا۔ کوریڈور میں قدم رکھتے ہی امی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں، قدم خود بخود تیز ہوگئے، پاؤں پر ململ کا کپڑا لپیٹے وہ ''ہائے ہائے۔'' کررہی تھیں، تانیہ کٹورے میں ہلدی تیل ڈالے ٹکور کرنے میں مگن تھی ردابہ ہلدی ملا دودھ لے کر آگئی۔

''کیا ہوا امی کو؟'' وہ فائل میز پر رکھتے فکر مندی سے ان پر جھکا تھا۔

''ہونا کیا ہے۔ وضو کرنے گئی تھی، کم بخت پاؤں پھسل گیا۔ ایک تو چار پیسے آجائیں سب سے پہلے غسل خانے کو چکنا کرنے پر تل جاتی ہے اولاد۔ تاکہ بوڑھے ماں باپ پھسل کر گریں۔ مریں، جان چھوٹے۔''

''امی بس کردیں۔'' تانیہ نے گرم پھائے رکھتے سرگوشی کی وہ متاسف سا مسکرا کر پاس بیٹھ گیا۔

''آپ سنبھل کر پاؤں رکھا کریں۔''

''ہاں..... چھت تک تو 'تو نے پتھر چڑھوا رکھا ہے، کہاں تک سنبھلوں..... ہائے پتا نہیں موچ آئی یا ٹوٹ ہی گیا کم بخت۔''

وہ ہونٹ کا کونا دبائے اُن کا پاؤں بغور دیکھ رہا

تھا ''چلیں ڈاکٹر کے یہاں لے چلتا ہوں۔''
''رہنے دے۔ درد کی ٹیوب، گولی لا دے، ہو جاؤں گی ٹھیک۔''
''اوہو چلیں، ایکسرے کروا لیتے ہیں۔ کوئی سیریس مسئلہ نہ ہو۔''
''کوئی نہیں بنتا مسئلہ، وسلہ۔ تو جا، جہاں کل جانے کے لیے اتاؤلا ہو رہا تھا۔ ورنہ تیری بیگم کہہ دے گی بڑھیا ڈرامے کر رہی ہے۔ میرا کیا ہے ہو جاؤں گی ٹھیک، کون سا دم نکل گیا۔''
''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، چلیں اٹھیں۔''
وہ اُن کے گرد بازو ڈالے اٹھنے میں مدد دے رہا تھا۔
''امی جائیں ناں۔'' تانیہ زچ ہو گئی۔ ''پہلے خود ہی شور ڈالے رہی تھیں کوئی پوچھنے والا نہیں، اب بھائی لے جا رہے ہیں، تو جا تا نہیں۔''
''اچھا میری اماں جاتی ہوں۔''
وہ بگڑ کر یک لخت اٹھیں پھر ہائم کے کندھے کا سہارا لیا۔ ''اچھا ایکسرے رہنے دے، تجھے دیر ہو جائے گی۔ نکڑ والے سے دوا لے آتے ہیں۔''
''چلیں تو سہی۔'' وہ اپنا بازو ان کی پشت میں ڈالے سہارا دیے آگے بڑھا۔ ردابہ بھی ساس کی تکلیف پر فکر مند سی تھی، ہائم پاس سے گزرتے اسے کہہ گیا تھا۔
''تم منہل کو تیار رکھنا، ہم ابھی آئے۔''
ڈاکٹر کا ٹائم ملنے میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، اس نے بہت اچھی طرح معائنہ کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا، سوجن، سرخی کچھ بھی نہیں تھی۔ ایکسرے سے منع کر رہی تھیں ہاتھ لگاتے ہی کراہتیں۔ اس نے چند دوائیں لکھ کر کل پھر بلایا۔
گھر آنے کے بعد بھی ان کی تکلیف جوں کی توں تھی، پاؤں پر دوا کا لیپ کرتے وہ کراہتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
''ہائم تم جب جاؤ گے مجھے طارق کی طرف اتار دینا، لولی لنگڑی بیٹھی رہوں گی ایک طرف۔ اب ضماد، زارا کا منہ بھی تو دیکھنا ہے، کیا کہیں گے کوئی بھی نہیں آیا۔''
طارق، زارا بھابھی کے بڑے بھائی تھے اور دعوت کے سلسلے میں اُدھر اتنے کام تھے کہ زارا دو دن پہلے ہی چلی گئیں۔ ضماد بھائی نے اسٹور سے ادھر ہی چلے جانا تھا۔ نعیمہ کو فکر تھی ضماد پہلے ہی چپ رہتا ہے اب کسی کے شامل نہ ہونے پر منہ ہی نہ بنا لے۔ زارا بھابھی پر زیادہ رعب نہ رکھنے کی ایک وجہ تو ضماد کا اپنا بہت لیا دیا سا انداز تھا سب کے ساتھ، دوسرے زارا کے میکے والے معاشی طور پر ان کی نسبت بہت مستحکم بھی تھے۔ زور ہمیشہ یا تو دبتے پر چلتا ہے یا اپنے سے کم تر پر۔ ردابہ کے میکے والے اگر بہت کم حیثیت نہیں تھے تو بس برابر ہی تھے ہاں ردابہ مزاجاً کچھ دبو ضرور تھی، کچھ ہائم چھوٹا ہونے کی بنا پر ماں سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔
''آپ کہیں نہیں جا رہیں۔'' وہ پیار بھرے تحکم سے بولا۔ تانی آپ کے پاس رہے گی، ہم طارق بھائی کی طرف ہو کر پھر کہیں اور جائیں گے۔''
نعیمہ کے کل شام والے رویے پر وہ رات کو ہی ردابہ سے طے کر چکا تھا، کہ پہلے طارق بھائی کی جانب چلیں گے، کھانے سے معذرت کر کے کہیں اور۔
''کیوں کیسا آئیڈیا ہے، امی بھی خوش، اور تم بھی۔''
اس نے اشارتاً بھنویں نچا کر ردابہ سے پوچھا۔ وہ کافی کا مگ تھماتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
''بہت مشکل ہے ہائم، بیک وقت سب رشتوں کو راضی رکھنا۔''
''ہاں مشکل تو بہت ہے۔'' اس نے کافی کی کریمی جھاگ کو چمچے سے ہلایا۔ ''لیکن اگر کوئی ایک سمجھوتا کر لے، صرف تعلق کو بچانے کے لیے تو اتنا مشکل بھی نہیں ہے یار۔''
اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر مان سے رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''بس تم جلد جلد خفا مت ہوا کرو، بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو، پھر سب ٹھیک لگتا ہے۔''

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی اپنا سر اس کے کندھے پر ٹیک دیا۔ ہائم کا بازو اب اس کے شانے کے گرد تھا اور ٹھوڑی اس کے سلکی بالوں کا لمس محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

نعیمہ جانے کس مٹی کی بنی تھیں ان کی اپنی ہی منطق تھی۔ ہائم نے کتنا اچھا حل نکال لیا تھا کہ ماں کا آرام بھی ہو جائے گا، اُن کی تفریح بھی، لیکن وہ اپنی ہی بات پر اڑی رہیں۔

''تم جاؤ گے گھڑی دو گھڑی، ہاتھ لگانے، کوئی دفتر تھوڑی ہے، حاضری لگاؤ آجاؤ۔ سو رشتہ دار ہوتے ہیں، ملنا ملانا ہوتا ہے، اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھے وہاں بٹھا کر تم جہاں مرضی جانا، واپسی پر ضماد کے ساتھ آجاؤں گی۔''

اگر یہی سب بھی ضماد کے سامنے کہنا پڑ جاتا تو وہ فوراً کہتے۔

''امی آپ درست کہہ رہی ہیں، اب ملنا ملانا، رشتہ داریوں کے تقاضے بزرگوں کو صحیح پتا ہوتے ہیں، ہمیں کہاں عقل۔''

وہ ماں کو ان کی خواہش کے مطابق وہاں بٹھا، چلتے بنتے جہاں جانا ہوتا۔ لیکن وہ ہائم تھا اپنے نام کی طرح (محبتوں میں پاگل) اُس نے کوفت سے آنکھیں میچ کر کھولیں اور گہری سانس خارج کی۔

''امی آپ چاہتی ہیں، میں ردابہ کو لے کر کہیں نہ جاؤں، تو ٹھیک ہے، کہیں نہیں جاتا۔ اب ٹھیک، آپ آرام کریں۔''

''میں ایسا کیوں چاہوں گی۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''جاؤ جہاں مرضی، روکا ہے کبھی۔ بلاوجہ ہی ماں کی ہر بات الٹ لگتی ہے تجھے۔''

''کہیں نہیں لے جا رہا میں اُسے۔ بات ختم۔''

اب اس کا موڈ بدل چکا تھا۔ اٹل انداز میں کہہ کر بات ختم کی۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی سب سن چکی تھی، اک تھکی ماندی نگاہ اس پر ڈالی، اور بس پہلی بار اتنا احتجاج کیا تھا لاؤنج میں کھیلتی تیار منہل کو جھٹکے سے اٹھا کر اندر لے گئی اور بیڈ پر پٹخنے کے انداز میں بٹھایا، خود آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی، وہ بالکل تیار تھی، بلیک سلور دھاگے اور اسٹونز کے ہلکے کام والی ڈل گولڈن چکیلی فراک، سیاہ پاجامہ، سیاہ سلور دوپٹا، اور کھلے بال، سب سے پہلے اس نے بال لپیٹے، دل نے چیخ کر کہا تھا، میک صاف کر دو، وہ سلور نگوں والے آویزے اتار رہی تھی جب وہ عقب میں آکھڑا ہوا، وہ اس کے بے حد قریب تھا مگر وہ بالکل متوجہ نہیں ہوئی۔

''ناراض ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے آویزے زور سے ڈریسنگ پر پٹخے۔

''پھر چہرہ اتنا جلا کٹا کیوں بنا رکھا ہے۔'' وہ آئینے میں اس کا عکس دیکھ رہا تھا۔

''دل سلگتا ہے تو چہرے پر، دھوئیں کے آثار فطری بات ہے۔''

اس نے ایک تاسف بھری نگاہ عکس پر ڈالی، پھر شانوں سے پکڑ کر اپنی جانب گھما لیا، اک سراہتی نگاہ اٹھی، زخمی مسکان ہونٹوں پر آتے ہی دم توڑ گئی۔

''آج کا ڈنر اور شاپنگ مجھ پر ادھار ہے۔''

''بات ڈنر شاپنگ کی نہیں ہے ہائم۔ کچھ چیزیں اس سب سے ہٹ کر بھی ہوتی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں، یار۔ لیکن۔'' وہ توقف سے بولا۔ ''ردابہ ڈیئر۔ فیملی کے معاملات، رکھ رکھاؤ، سب دیکھنا پڑتا ہے، مجبوری ہے میری۔ امی تو نہیں سمجھتیں، پلیز تم ہی سمجھ جاؤ۔''

وہ پلکیں گرائے بس سنتی رہی۔ ''میری خاطر اس کی بیشی پر سمجھوتا کر لو۔ پلیز خفا مت ہوا کرو۔''

اس کے میٹھے لہجے پر اس نے پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھا اُس کی نگاہ بڑی ملتجی سی تھی نا چاہتے ہوئے بھی وہ اثبات میں سر ہلا کر پھیکا سا مسکرا دی۔

''دیٹس گریٹ۔'' اس نے رازدانہ انداز میں

جھکتے ہوئے کہا۔ ’’ویسے آج سرخ آنکھوں والی چڑیل بہت پیاری لگ رہی ہے۔‘‘

’’لیکن اُسے اپنا بھوت بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔‘‘

ردابہ نے اُسے غصے سے پرے کرنا چاہا لیکن اس کے خفا انداز کا لطف لیتے وہ قہقہہ لگا کر، اسے نرم نگاہوں سے دیکھتا خود ہی پرے ہوگیا، اور اس کا بے ڈھنگا لپیٹا جوڑا اپنے ہاتھ کی پوروں سے ٹکرا کر کھول دیا۔ سیاہ ریشمی بال پشت سے نیچے تک پھسلتے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ طارق بھائی کی طرف جانے کے لیے آگے پیچھے کمرے سے نکلے تھے، نارمل سی تیار ہوئی تانیہ پوری بیزاریت سجائے نعیمہ کے ساتھ بیٹھی تھی، جیسے بنا تیاری کے اہم پیپر دینا پڑ جائے۔ وہ بار بار نعیمہ سے کہتی رہی۔

’’امی بھائی، بھابھی جا تو رہے ہیں، میرا جانا ضروری ہے کیا۔‘‘

اب نعیمہ اپنے منہ سے کیا بار بار ایک ہی بات کہتیں کہ کیا خبر اکیلے جائیں نا جائیں، بہت چالاک ہے ردابہ۔ اور اگر چلی ہی گئی وہاں خاندان برادری میں جانے کیا کیا کہتی پھرے۔ ڈپٹ کر کہہ دیا۔

’’ہاں ضروری ہے جانا۔ بہت ضروری۔‘‘

’’اور آپ جو گھر پر اکیلی ہوں گی، کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو۔‘‘

’’اب ایسی بھی ٹانگ نہیں ٹوٹ گئی، دو تین گھنٹوں میں تم آجاؤ گے۔ اتنے میں آرام کرلوں گی۔ شاباش۔ تم جاؤ ساتھ۔ زارا کیا سوچے گی۔‘‘

’’ایک تو زارا بھابھی کی آپ کو فکر رہتی ہے، اور تو جیسے کوئی اس گھر کا حصہ ہی نہیں ہیں۔‘‘

وہ تلخی سے کہہ کر اٹھی، تحائف والا شاپر ردابہ کے ہاتھ میں پکڑا خود اُن کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

سیاہ گیٹ کے سامنے چھوٹی سی سفید کار آرکی تھی، وہ کچھ دیر ہارن دیتا رہا، پھر باہر نکل آیا، بلو جینز پر لائٹ ٹی پنک شرٹ پہنے، چوڑا سینہ، دراز قد، ہیر کٹ بہت چھوٹا تھا، وہ متناسب قدم اٹھاتا اندر آگیا۔ طارق بھائی اسے راہ داری میں مل گئے تھے۔ باتیں کرتے اسے اندر لے آئے، وہ جلدی واپسی کے چکر میں تھا لیکن طارق بھائی کے بے حد اصرار پر اُسے کھانے کے لیے رکنا پڑا۔

’’بس یار کھانا تیار ہے، کھا کر جانا۔‘‘

انہوں نے ایک دو لوگوں سے اس کا تعارف بہت فخر سے کروا کر لاؤنج کے سامنے لگی چیئرز پر بٹھایا، اس کی جلدی جلدی کی وجہ سے فوراً کھانا لگوا دیا تھا، اس نے گنتی کے چند نوالے لیے، ہاتم اور ضماد بھائی بھی اس کے ساتھ بیٹھے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

’’بہت سخت ڈیوٹی ہوتی آپ کی۔ جیسے آج کل کے حالات ہیں۔‘‘

پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پھیکے لبوں پر انگشت پھیری۔

’’جی۔ شروع میں بہت شوق ہوتا ہے، یونیفارم اٹریکٹ کرتا ہے، بلڈنگز خراج دیتی ہیں، مگر پھر ڈیوٹیز یہ سب جھاگ کی طرح بٹھا دیتی ہیں۔‘‘

ضماد اور طارق کی مسکراہٹ کے ساتھ ہلتی گردن اس کی تائید کر رہی تھی، حالات کچھ بھی ہوں، زبانیں کچھ بھی کہتی رہیں مگر ہر قوم کی نگاہ میں فورسیز کی عزت رہتی ہی ہے، ہونی بھی چاہیے، آخر قوم کے محافظ ہوتے ہیں، سب کی نگاہوں میں عزت ایک طرف اُسے اپنے یوں بن بلائے مہمان کی طرح آکر کھانے میں شامل ہونا بہت خجالت پہنچا رہا تھا۔

’’رابیل کو گڑیا نے بتایا تھا، آپ کی کہیں پوسٹنگ ہو رہی ہے۔‘‘

طارق بھائی کے پوچھنے پر اس نے اپنے منہ کا نوالہ بہت اچھی طرح چبایا، چمچہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے سر کو ذرا جنبش دی۔

"نہیں۔ پوسٹنگ نہیں ہے، ایک کورس کے سلسلے میں ساؤتھ افریقہ جانا ہے۔"

"ہوں۔"

وہ لاؤنج سے باہر لابی میں لگائی گئیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں، وہاں سے مردوں کی میز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کھانے کے دوران تانیہ کی نگاہ، کئی بار ان کی میز پر گئی، سب اس نئے آنے والے لڑکے کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔ ضماد اور طارق بھائی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ہائم البتہ بے رغبتی سے برائے نام کھانا کھاتے خاموش بیٹھا تھا۔ یہی حال ساتھ بیٹھی ردابہ بھابھی کا تھا۔ وہ زیادہ وقت تو منہل کے چیزوں کی جانب ہمکتے ہاتھ روکنے، اور ٹشو سے صاف کرنے میں گزار رہی تھی۔ تانیہ کو رہ رہ کر امی پر غصہ آتا رہا۔

"پتا نہیں امی کو کیا ملتا ہے ہائم بھائی اور ردابہ بھابھی کے ساتھ ایسا کر کے۔ اب کون سمجھائے انہیں۔"

اس لڑکے نے ٹشو سے لب تھپتھپاتے رسٹ واچ پر وقت دیکھا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے، پلیز آپ گڑیا کو بلا دیں۔" اس کے کہنے پر طارق بھائی سر ہلاتے کرسی دھکیل کر اٹھے۔

"ہاں ہاں۔ وہ یہیں بیٹھی ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔"

طارق بھائی اسے اپنے ساتھ لیے لابی کی جانب آئے، دوسرے اسٹیپ پر قدم رکھتے ہی گڑیا کی نگاہ اپنے بھائی پر گئی تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھائی۔ آپ آ گئے۔ آئیں میں آپ کو رابیل کی فیملی سے ملواتی ہوں۔"

رابیل طارق بھائی کی وہ بیٹی تھی جس نے بورڈ میں پوزیشن لی تھی، جس کے اعزاز میں اس دعوت کا اہتمام تھا۔ اور گڑیا رابیل کی بیسٹ فرینڈ جسے پک کرنے اس کا بھائی آیا تھا، ایک تو اس کے پاس ٹائم کی کمی اوپر سے یہاں آ کر گھر سا گیا تھا۔

اب بہن گڑیا صاحبہ رابیل کی فیملی سے اس کا تعارف کروا رہی تھی جس سے کم از کم اُسے قطعاً دلچسپی نہیں تھی لیکن مروتاً سلام کرتا رہا۔ زارا، ردابہ بھی وہاں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سلام کے جواب میں سر ہلاتے مسکرائیں۔ البتہ ان کے ساتھ چہرے پر بیزاریت لیے تانیہ نے مسکرانے سے بھی گریز ہی کیا تھا۔ اس نے ایک نظر تانیہ کو دیکھا پھر گڑیا کی بات کا جواب دینے لگا۔ اس وقت تو تانیہ کو زارا بھابھی کے حوالے سے کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ہائم سے تانیہ کی دوستی بھی تو بہت تھی ناں اور آج اس کے پیارے بھائی ہائم کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔

"طارق بھائی اب ہمیں بھی اجازت دیں۔ امی گھر پر اکیلی ہیں۔"

ہائم نے پیچھے سے آ کر کہا، اس لڑکے نے بھی لاشعوری طور پر مڑ کر دیکھا۔ اب ہائم تانیہ سے مخاطب تھا، جس نے اُس اجنبی کے سلام کا جواب تو کیا دینا مسکرائی تک نہیں تھی۔

"چلو تانی اٹھو۔"

ہائم کہہ کر پھر ردابہ کی جانب بڑھا، اس کی گود سے منہل پکڑ لی۔ "اِسے مجھے دو۔"

"اچھا بھئی اللہ حافظ۔"

ہائم نے اب اس سے برائے مروت معانقہ کیا پھر ضماد بھائی کا پروگرام پوچھ کر باہر کی جانب چلا گیا، وہ دونوں بھی مشترکہ "اللہ حافظ" کہتی ہائم کے پیچھے نکل گئیں۔ لمحہ بھر گڑیا کے بھائی کی نگاہ اس بیزار لڑکی تانیہ کے عکس پر گئی ضرور تھی۔

☆☆☆

اس کا سر دیوار میں لگنے سے سر میں شدید ٹیس اٹھی تھی، اس کا ہاتھ ماتھے کی جانب بڑھا اُسے اپنے ہاتھ پر کسی سیال کا گمان ہوا۔ ویسے تو بارش ہونے سے وہ تقریباً ساری بھیگ چکی تھی، سر سے پانی کی بوندیں بھی بہہ رہی تھیں، لیکن اپنے جسم سے بہنے والے خون کا اندھیرے میں بھی پتا چل جاتا ہے۔

اس نے نفرت و بے بسی سے شجی کو دیکھا، پہلے شجی نے پورے کروفر سے قہقہہ لگایا، پھر "چہ چہ چہ" تاسف میں کرتا اس کی جانب جھکا۔

"اوہ۔ بہت نازک ہو تم تو، ذرا سے دھکے سے سر پھٹ گیا۔ آؤ میرے ساتھ تمہاری مرہم پٹی کر دوں۔"

وہ اس کی کلائی کو پکڑ کر پھر سے بھینچنے لگا۔

"شجی بھائی۔ آپ یہ ٹھیک نہیں کر رہے میرے ساتھ۔ آپ خود کے لیے بھی مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں۔" منہل کی کانپتی آواز پر شجی نے استہزأ کہا۔

"اچھاااا۔ ایسی مصیبتیں تمہارا شجی بہت بھگت چکا ہے، وہ بھی شوق سے۔ عادت ہے اُسے، تم فکر مت کرو۔"

اسے اس وقت سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیسے جان چھڑائے گیٹ کی کنڈی وہ کھول چکی تھی بس پٹ دھکیلنے رہ گئے تھے وہ ایک نظر شجی کو ایک نظر گیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے گیٹ کے ساتھ لگ گئی۔ اس کے چہرے کے نازک نقوش پر صرف ایک خوف امڈا تھا، دل کی ہر دھڑکن "مما، مما" پکار رہی تھی۔

مما نے جاتے وقت اُسے اپنے ساتھ چلنے کا کہا تھا مگر نانو کے خیال سے وہ رک گئی تھی۔ کئی دن سے اُنہیں مسلسل بخار آرہا تھا، چھوٹی ممانی کے ملنے والوں میں عقیقے کا فنکشن ہی تو تھا، خواہ مخواہ بے آرامی سے طبیعت مزید خراب ہوتی۔ لیکن اب نانو اتنی بے فکر نیند سوئی تھیں۔ خواہ بم پھٹے، زلزلہ آئے یا کسی کی زندگی تباہ ہو، وہ نیند کے زیرِ اثر تھیں۔ راہِ فرار سڑک ہی تھی اور اس وقت وہاں بھی سناٹا تھا کبھی ایک آدھ گاڑی ہارن بجاتی اُسے حوصلہ ہونے سے پہلے ہی گزر جاتی۔ منہل کی بے بسی سے شجی پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ منہل کو لگا گیٹ کے نیچے سے کسی گاڑی کے ہیڈ لائٹس کی روشنی کے ساتھ چرچراتے ٹائر رکنے کی آواز آئی تھی پھر وہ آواز بھی بادلوں کی گڑ گڑاہٹ میں بدل گئی۔

☆☆☆

وقت کا اتاؤلا مسافر تھڑے تھڑے اونچ نیچ کھیلتا بہت آگے نکل گیا تھا۔ اپنی لگی بندھی روٹین کی ان دونوں کو اس قدر عادت ہو گئی تھی جیسے گھڑی کی سوئیاں اپنے مدار میں گھومتی ہوں۔ اب ہائم نے اس کی مصروفیات، امی کے مزاج سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وقت کے ساتھ اب کچھ بھی غیر معمولی نہیں لگتا تھا۔ ویسے بھی نئی نئی شادی ہونے پر ساتھی کا ساتھ غیر معمولی دھڑکن بن کر دھڑکتا ہے، پھر سب روٹین بن جاتی ہے۔ ہائم کا پہلا سا جذباتی پن اب سرد پڑ گیا تھا، جس سے نعیمہ کے مزاج میں بھی قدرے ٹکاؤ آ ہی گیا، یا پھر شاید مصروفیات نئی شکل میں ڈھل چکی تھیں۔ اب اکثر ہی وہ آفس کا کام گھر لے آتا۔ کبھی ردا بہ منہل کے کاموں میں لگی ہوتی۔ کھانا بھی ساتھ نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اکثر تو منہل کو کھلاتے کھلاتے اس کے بچے کھانے سے پیٹ بھر جاتا۔

بسا اوقات ہائم کہہ دیتا۔ "بالکل موڈ نہیں ہے۔ آج آفس میں چائے زیادہ پی لی تھی۔"

وقت کی چال بہت عجیب ہے، اسے ذرا سی بے توجہی ملے، یا گرفت ڈھیلی ہو، تو سوتیلوں سا سلوک کرتا ہے۔ ہر پانسا پلٹنے پر بے دید اجنبی کھٹور بن کر نگاہیں پھیر لیتا ہے، وہی دور سے بانہیں کھولے آن لپٹنے کو بے قرار وقت۔ کبھی کبھی یوں پاس سے گزرتا ہے، جیسے کبھی آشنا نہ رہا ہو۔ آہ۔ نظر انداز کیا ہوا وقت بڑی سزا دیتا ہے۔ اک ٹیس بن کر دل کے آر پار ہمیشہ پیوست رہتا ہے۔ آہ یہ وقت کی چالیں۔

سسرال میں اپنی حیثیت منوانے کی خواہش میں رشتوں کو راضی کرتے کرتے وقت دو سال سے آگے بڑھ گیا، نعیمہ کی ماتھے کی سلوٹیں اب رخ بدل کر منہل کی تربیت پر لگی تھیں اٹھتے بیٹھتے ایک ہی

بات۔
"اسے قاعدہ دے کر بٹھایا کر، تین سال کی ہونے والی ہے۔ میرا ہائم تین سال کا فر فر پہاڑے سنایا کرتا تھا، ساری گنتی یاد تھی اسے۔ توڑ جوڑ سیکھ لیے تھے۔ پیلا ٹیپو ہر سال فرسٹ آتے ہیں۔ دو دو سال کے تھے ساری نظمیں یاد ہوگئی تھیں۔ یہ تو اجو ہے جو چھوٹا ہونے کے سبب ضماد لاڈ میں کچھ کہنے نہیں دیتا۔ ورنہ زارا نے تو اپنے بچوں پر بہت محنت کی، اوپر سے تھوڑا کوئی سیکھ کر اترتا ہے۔"

صرف چھوٹی سی بچی کی نالائقی کے طعنے سے بچنے کے لیے، اُسے جو وقت فری ملتا منہل کو گود میں دبائے نظمیں، حرفِ تہجی، ایلفابیٹ سکھاتی۔

تین سال سے بھی ابھی کم ہی تھی جب پلے گروپ میں داخل کروادیا، تین سال کی عمر اور اسکولنگ...... اُف، تشدد سا تشدد۔ یہ معصوم ذہن پر بڑا ظلم ہے۔ سات سال کی عمر تک تو اللہ نے بچے کو نماز سکھانے تک کا حکم نہیں دیا، بس پیار، لاڈ، محبت، اور ماں کی آغوش۔ اور آج کی مائیں بس نہیں چلتا پیدا ہوتے ہی اسکول میں بٹھا آئیں۔ جب اتنے معصوم بچے سے پیدا کرنے والی جان چھڑواتی ہو، تو کیا وہ بچہ بڑا ہو کر اس بوڑھی ماں سے جان چھڑوانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ہمیشہ آبیاری ملنے والی خوراک سے ہی ہوتی ہے۔ ردابہ بھی جان چھڑوانے کے چکر میں تھی منہل کو اسکول داخل کروادیا۔ مارکیٹ آتے جاتے اس کے لیے اسٹوری بکس، ڈرائنگ بک ضرور لاتی اور پھر باقاعدہ کام بھی کرواتی۔

☆☆☆

وہ اسکیچ بک پر جھکی رنگ بھرنے میں منہل کی مدد کر رہی تھی، پلے گروپ کے سالانہ پیپرز ہونے والے تھے، اس نے بچی کے ساتھ دن رات ایسے ایک کر رکھا تھا جیسے وہ بورڈ کلاس میں ہو، منہل نے درخت پر لگے پتے سبز کیے، نیچے گرے پتوں کے لیے ردابہ نے اسے بھورا کریون تھمایا۔

"ان میں یہ کرو۔"

"کیوں مما؟" اس نے تعجب سے دیکھا تھا۔

"یہ بھی تو لیوز ہیں۔"

"لیکن یہ سوکھ کر نیچے گر گئے ہیں ناں۔ اب ان کی زندگی ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے۔"

اس کی تمہید پر منہل نے بھورے کریون کو ناگواری سے دیکھا۔

"جن کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، وہ ایسے گندے ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں وہ سوکھ کر ختم ہو جاتے ہیں۔"

"کیا تم بچی کو اتنی فضول باتیں بتا رہی ہو۔ حد ہے بھئی، شوخ رنگ دو، تاکہ اس کے مزاج میں شوخی ہو۔"

وہ آئینے کے سامنے کھڑا کف لنکس سیٹ کرتا بولا۔ ردابہ نے اپنے آگے کو آئے بال سمیٹتے ہوئے تیار ہوتے ہائم پر بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔

"کہیں جا رہے ہو؟"

"ہوں۔"

اس نے جل لگے بال پیچھے کو سیٹ کیے پھر کلون اٹھا کر چھڑکنا شروع کیا، دل فریب مہک پورے کمرے میں پھیل گئی۔

"الیاس کی جانب سب فرینڈز جمع ہیں۔ ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

ٹائم چیک کرتے ریسٹ واچ باندھی، موبائل، چابیاں، والٹ ڈریسنگ سے اٹھا کر جیب میں رکھا۔

"جلدی آجاؤں گا۔" اس نے ایک بار پھر اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔

اس کی باہر کی ایکٹیوٹیز روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں، یا شاید آج ردابہ کو زیادہ محسوس ہوا تھا۔ آفس سے آکر چائے پیتا، فریش ہو باہر کسی دوست کولیگ کی جانب نکل جاتا، دو تین گھنٹے بعد لوٹ کر آتا تھا، تب تک وہ اپنے بہت سے کام بھگتا لیتی تھی۔ کھانے کے دوران کچھ رسمی سی بات چیت ہوتی، کچن

سمیٹ کر جب وہ کمرے میں آتی جہاں اس کے خود کے چہرے پر تھکاوٹ جھلکتی تھی وہاں ہائم پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا، زیادہ تر ''ہوں ہاں'' جتنی گفتگو رہ گئی تھی ان کے بیچ، پھر بھی وہ کبھی نہیں چونکی تھی، جیسے آج چونکی۔

''اب آپ زیادہ باہر نہیں جانے لگے۔''

اس نے بھنویں اچکا کر دیکھا پھر منہل کے گال چھوتے ہوئے مسکرایا۔

''گھر بیٹھ کر کیا کروں، تم اس کے ساتھ بزی ہو، پھر کچن میں چلی جاؤ گی۔ میں بور ہوتا ہوں۔''

اس کی گہری ہوتی نگاہوں پر وہ جاتے ہوئے کہہ گیا تھا۔ ''اچھا آج جلد آجاؤں گا۔''

ہائم کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جانے والی مہک دماغ کو تعفن زدہ کر رہی تھی، سوچوں کی رو بھٹکنے لگی۔ بہت شروع میں فریدہ نے کہا تھا

''مرد کو سب سے زیادہ چوٹ نظر انداز ہونے سے لگتی ہے، ہائم کو نظر انداز مت کیا کرو۔ میاں کی خاموش زبان اگر بیوی نہ سمجھے تو وہ چور دروازے نکال لیتے ہیں، اپنی آواز پہنچانے کے لیے۔''

''چور دروازے۔'' خدشوں نے بے طرح سر اٹھایا۔ ''نہیں ہائم ایسے نہیں ہیں، میں ان کی زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہوں۔''

شیطان کا بہترین ہتھیار وسوسے ہیں اور اپنا بہترین ہتھیار وہ ہمیشہ گھر توڑنے پر لگاتا ہے۔ اُسے انسان کے آباد گھروں سے نفرت ہے، اِس انسان ہی کی وجہ سے وہ اپنے بہترین ٹھکانے جنت سے دھتکارا گیا تھا۔ وہ کیوں چاہے گا، جس کی وجہ سے وہ دربدر ہوا، اس کا گھر بسا رہے۔

اس نے سر جھٹک کر وسوسوں کو کچلا، بیڈ سے اتری، ضروری کام بھگتائے، منہل کو کھلا پلا کر جلد سُلا دیا تھا، آج اس نے خود پر بہت دن بعد بھرپور توجہ دی تھی۔ ہائم کے آنے سے پہلے ہلکی سی تیار ہوئی کھانا ٹیبل پر لگا کر اُس کی منتظر تھی۔ نعیمہ کو اس کی تبدیلی پر اچنبھا تو ہوا تھا مگر کوئی توجہ نہیں دی کھانا کھا کر دوا کھانی تھی سو جلدی کھا کر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر اس کا انتظار کرنے کے بعد ضماد بھائی کی فیملی کھانا کھانے لگی، کھانے کے دوران ہی ضماد بھائی نے کہا تھا۔

''ہائم نے آج زیادہ ہی دیر کر دی۔ کہاں رہ جاتا ہے، تم پوچھتی نہیں اُس سے۔'' وہ چپ رہی۔

''تم بھی کھالو۔'' زارا بھابھی نے اپنی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے اُسے کوئی کام پڑ گیا ہو۔ وہ آکر کھالے گا۔''

اُسی وقت لینڈ لائن پورے زور سے بجا۔

''کہاں رہ گئے، ہیں۔'' آواز سنتے ہی وہ بے قراری سے بولی وہ وضاحت دینے لگا۔

''یار! وہ الیاس کا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا ہے، ہاسپٹل میں ہوں۔ ہوسکتا ہے دیر لگ جائے، کھانا کھا لینا۔''

رابطہ منقطع ہونے کی ٹون نے اس کا دل بھی پل بھر کے لیے روک دیا تھا، ابھی ساری تیاری میں کتنا کچھ جلنا اور پھر مٹ جانا باقی تھا۔

☆☆☆

اس کا چہرا غصے کی شدت سے جل رہا تھا۔ بس چلتا تو منہل کے منہ پر اتنے تھپڑ لگاتی کہ اس کے چہرے پر نشان پڑ جاتے۔ لیکن اس نے کبھی منہل کے چہرے پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اس چہرے پر ہائم جان جو دیتا تھا۔ ردابہ نے اگلے دانت جمائے سخت نگاہ سے گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

''اب بس بھی کر جاؤ، اور کتنی جان نکالو گی بچی کی۔''

فریدہ کی بے جا حمایت پر اب وہ آگ بگولا ہوگئی

''بچی...... یہ بچی ہے۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا اس کے لیے، اور یہ...... یہ...... کیا صلہ دے رہی ہے، اُسے یہاں بلانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا، اگر کسی کو پتا چل گیا تو ماں کیا جواب

دیتی پھرے گی۔"

"کتنی بار بتاؤں تمہیں۔ اس نے نہیں میں نے بلایا تھا اُسے، میں ملنا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کیسا ہے۔ تم بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو۔"

ردابہ نے اچنبھے سے ماں کو دیکھا۔

"امی۔ آپ نے بنا سوچے سمجھے ایک اجنبی لڑکے کو گھر بلا لیا، جبکہ میں گھر پر بھی نہیں ہوں، اور خود آپ......! آپ جا کر بھابھی کی طرف بیٹھ گئیں۔ آپ احمد بھائی، رومانہ بھابھی کو جانتی نہیں کیا۔ کہاں کہاں، کیا کیا باتیں کریں گی۔"

"تو کیا کرتی، باہر سڑک پر جا کر ملتی، یا کسی ہوٹل میں بلا لیتی، پھر تمہیں اچھا لگتا۔" فریدہ بھی آج خاصی کٹیلی لگ رہی تھیں۔

"کیا جانتی ہیں، آپ اُس ذیاج کے بارے میں، کون ہے کس فیملی کا ہے، یونی میں تو ہزاروں لڑکے پڑھتے ہیں، جو بھی دل کو اچھا لگے، اسے گھر بلا لو۔"

"جاننے، پہچاننے کے لیے ہی اسے یہاں بلایا تھا، لیکن وہ کم بخت شجی پتا نہیں کہاں سے وارد ہو گیا، ساری بات بیچ میں رہ گئی۔"

نانو کو پہلی نظر میں ہی ذیاج بہت ہی اپنا سا لگا تھا معصوم تہذیب یافتہ سا بچہ۔ انہیں رہ رہ کر شجی پر غصہ آتا رہا۔ اور حد تو شجی نے یہ کر دی تھی کہ ردابہ کے گھر آتے ہی جن کی طرح حاضر ہوا، اور ایسے شکایت لگائی تھی جیسے ردابہ سنتے ہی منہل کے دو تماچے لگائے گی اور جان چھڑانے کو اس کا ہاتھ فوراً ...ی کے ہاتھ میں تھما دے گی۔ سنتے ہی ردابہ کو بھلے جتنا بھی غصہ آیا تھا لیکن شجی کے سامنے اپنے انداز اور لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا۔ ہاں منہل نے مجھے بتایا تھا۔ اس کے ...کسی کلاس فیلو نے آنا ہے۔ خیر تم پریشان مت ہو، ...میں خود پوچھ لوں گی اس سے۔"

شجی تو کلبلا کر چلا گیا۔ اور ردابہ اب منہل سے ...پوچھ گچھ کرتے ہوئے ماں سے ہی جھگڑنے لگی۔ اور دوٹوک صاف الفاظ میں کہہ رہی تھی۔

"امی۔ میری ایک بات آپ اور منہل غور سے سن لیں، میں نے اپنی بیٹی کسی میڈیا کر فیملی میں نہیں دینی۔"

منہل اور فریدہ دونوں نے یک دم تحیر سے اسے دیکھا۔

"تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے۔ ہم ہمارے سارے ملنے جلنے والے سب مڈل کلاس فیملی سے ہیں، اور تم کب سے اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے لگیں، یا ان کی کون سی بات تمہاری توجہ کا مرکز بن گئی ردابہ۔"

"ان کا سپریٹ فیملی سسٹم۔" ردابہ نے خوب جتاتے ہوئے کہا۔ اور بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی، آنکھوں کے کڑوے پانی سے پلکیں لرزنے گی۔

"مجھے اپنی بیٹی کو کسی جوائنٹ فیملی سسٹم کا وکٹم بننے نہیں دینا۔ اور بس......اور بس...... یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔"

ردابہ کے کانپتے دل خراش لہجے پر فریدہ کا اپنا دل لرز گیا۔ منہل ردابہ کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت جانچ رہی تھی، ردابہ نے اب واضح طور پر منہل سے کہا۔

"ذیاج کے دو بڑے بہن بھائی ہیں اور ماں باپ حیات، تم اُسے کہہ دو، جب وہ اپنا ذاتی گھر بنا لے اور اُس میں رہنے کے قابل بھی ہو جائے تو یہاں کا رخ کرے، دوسری صورت میں مجھے یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔ تمہارا خیال دل سے نکال دے، سن لیا تم نے۔"

ردابہ کا اتنا دوٹوک واضح اعلان جہاں منہل کو سن سا کر گیا وہاں فریدہ کی سٹی بھی گم ہو گئی۔ البتہ ردابہ کہہ کر تیزی سے ایک جانب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اُس رات وہ تقریباً بارہ بجے آیا تھا، وہ تب بھی جاگ رہی تھی، سفاک وقت اس سے بہت

نظر انداز ہوا تھا۔ جب پکارا تو وہ نظریں بدلنے لگا۔ اس کے بہت دیر سے آنے کے باوجود وہ اپنی شعوری کوشش سے پہلے کی طرح تیار اور فریش بیٹھی رہی یہاں تک کہ ہائم خود بھی حیران سا حیران تھا۔

"خیریت، کہیں گئی تھیں۔"

"کیوں آپ کے لیے تیار نہیں ہوسکتی کیا۔"

ایسے غیر متوقع جواب پر جرابیں اتارتے اس کے ہاتھ تھم سے گئے، جھکی گردن کے ساتھ اس نے مڑ کر دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ ہائم کی آنکھوں میں بھی ایک چمک لہرائی جوتے ایک جانب رکھتے ہوئے وہ کہہ گیا۔

"بڑی جلدی خیال نہیں آگیا۔"

تاروں کی چھاؤں میں لپٹی سیاہ رات ہر سو فسوں پھیلاتی تھی، بادلوں کے پروں کو چھو کر اترتے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھڑکی کی جالی سے ٹکراتے۔ ریشمی پردے مست ہوئے لہر لہر جاتے۔

☆☆☆

علاقے میں ضمنی انتخابات کی گہما گہمی تھی، تانیہ بہت پُر جوش تھی، زرد کاٹن کے ایمبر ائیڈڈ قمیص شلوار میں بہت پیاری لگ رہی تھی، دوپٹا شانوں پر پھیلاتی وہ لاؤنج میں نکلی۔

"تو ووٹ ڈالنے جا رہی ہے یا کسی کو اُبٹن لگانے۔"

نعیمہ کی تنقیدی نگاہ پر اس نے اونچا قہقہہ لگایا۔

"امی یونہی سمجھ لو، میرا لیڈر آنے کی دیر ہے، ہمارا علاقہ دلہن کی طرح سج جائے گا۔"

"تو پھر صبح اٹھتی دلہن کو غسل دلوانے، بارہ بجا کر کیوں اٹھی ہے۔"

نعیمہ جب غصے میں ہوتیں تو کسی کو بھی نہیں بخشتی تھیں۔

تانیہ نے اپنی پارٹی کے لیے یونی میں باقاعدہ کمپین چلائی تھی، رات گئے تک فرینڈز کو میسیجز پر یاد دہانی کرواتی رہی، دونوں بھائیوں سے وعدہ لے کر سوئی تھی کہ کام پر جانے سے پہلے ووٹ کاسٹ کریں گے، زارا، ردابہ دونوں ہی اپنے شوہروں کے ساتھ ڈال آئی تھیں۔ نعیمہ نے صاف کہہ دیا تھا۔

"اگر جاؤں گی، تو اپنے پرانے لیڈر کو ہی ڈالوں گی، ورنہ نہ سہی، مجھ سے نہیں یہ نئے نو دن والے برداشت ہونے لگے۔"

تانیہ کو امی کا نہ جانا ہی اچھا لگا، رات دیر سے سوئی، دوسرے گہما گہمی میں ووٹ ڈالنے کا لطف ہی الگ تھا۔ وہ دیر سے اٹھی تھی، اور اب اس کے ساتھ جانے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ زارا بھابھی کچن میں بزی تھیں، ردابہ کی طبیعت کا کچھ دن پہلے ہی پتا چلا تھا۔ تین سال بعد وہ پھر تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی۔ تانیہ نے ردابہ کو ساتھ چلنے کا کہا نعیمہ نے گھور کر دیکھا تھا۔

"تیرا دماغ ٹھیک ہے، اس کی طبیعت پہلے ہی بھاری ہے، اگر وہاں گر گرا گئی، تو اٹھا لے گی؟ جانا تھا پہلے اٹھتی۔ اب بیٹھ جا ٹِک کے۔"

نعیمہ کی جھڑک پر اس کا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا، ملتجی نگاہ بھابیوں پر گئی۔ ردابہ کی حمایت کا مطلب تھا مکمل انکار۔ زارا بھابھی کو خیال آگیا کچھ ٹھہر کر بولیں۔

"امی آپ کہہ رہی تھیں ردابہ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ پولنگ اسٹیشن کے پاس ہی تو ہے وہ ڈاکٹر۔" بات کرتے ہوئے ردابہ کو تائیدی نظروں دیکھا۔ "تم یوں کرو، اِسے پولنگ پر چھوڑ کر آگے ڈاکٹر کے چلی جانا، واپسی پر لیتی آنا۔"

"ہاں بھئی اب یہی کسر رہ گئی، جوان جہان، اکیلی پولنگوں پر پھریں گی۔ اس نسل سے یہی امید ہے۔ جو جی میں آئے کرو، میری یہاں سنتا ہی کون ہے، بھیا۔"

انہیں پورا یقین تھا ان کی لاڈلی کسی صورت ٹلنے والی تو ہے نہیں، پھر انہیں ساتھ جانے کی ضد

کرے گی، اور اس وقت بوڑھی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں تھا اس کے ساتھ دھکے کھائیں، جب ردابہ ہی جانے کے لیے تیار ہے انہیں کیا، جائے ان کی بلا سے۔

تانیہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود ردابہ کو زبردستی کھینچتے ہوئے اٹھا لے گئی، منہل گھر پر تھی۔

ردابہ نے اسے پولنگ اسکول پر اتارا خود رکشے کو لیے ڈاکٹر کی جانب نکل گئی۔ پولنگ اسٹیشن پر خاصا رش تھا، نفری بھی اچھی خاصی تعین تھی، گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ایک لمبی قطار دیکھ کر اسے ایک بار دیر سے آنے پر افسوس ضرور ہوا تھا۔

''خیر جاؤں گی تو ڈال کر ہی۔'' ووٹ سلپ لے کر وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ آرمی یونیفارم میں ملبوس اپنی پسٹل بیلٹ میں درست کرتا وہ کرسی سے اٹھا۔ میز پر رکھی پی کیپ اٹھا کر چھوٹے ہیر کٹ پر جمائی۔ صاف ستھری رنگت پسینے گرد سے اٹ کر تھکن کا تاثر دے رہی تھی۔ اپنی آستینیں اوپر کی جانب پتہ لگا تا وہ اُسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں تانیہ کھڑی تھی۔

تانیہ کی بھی نگاہ اس پر تھی، وہ ہونٹ کا کونا دبائے یہی سوچ رہی تھی۔

''کہاں دیکھا ہے اسے۔'' کوئی جانی پہچانی شکل لگ رہی تھی، لیکن یادداشت میں بالکل نہیں آرہا تھا۔

وہ اندر پولنگ روم کا چکر لگانے کے لیے اٹھا، پاس سے گزرا، دو قدم آگے جا کر ٹھٹک کر رکا اور پلٹ کر آیا، تقریباً ڈیڑھ سال بعد وہ اُسے دیکھ رہا تھا چند پل میں ہی پہچان گیا۔ آرمی والوں کی نگاہ بھی کمال کی ہوتی ہے۔

''آپ......''

''جی آپ کون؟'' تانیہ کا لہجہ سپاٹ تھا

''پہچانا نہیں آپ نے۔''

''نہیں۔ کیا آپ ٹی وی پر کام کرتے ہیں، مطلب کوئی سلیبرٹی؟''

وہ ہونٹ سکیڑتے نفی میں سر ہلاتے دھیما سا مسکرایا۔

''گڑیا کا بھائی کیپٹن شرجیل۔''

''کون گڑیا؟''

اس کے ہنوز انداز پر اس نے پاکٹس میں ہاتھ اڑستے سر کو خم دے کر اٹھایا۔

''رابیل......طارق صاحب کی بیٹی......انہیں تو یقیناً جانتی ہوں گی۔ وہ ہم رابیل کی پارٹی میں ملے تھے۔''

رابیل نے اپنی بیسٹ فرینڈ گڑیا سے تانیہ کو بھی ملوایا تھا، بہت اچھی لڑکی تھی، کچھ دیر اس سے بات چیت بھی ہوئی۔ اسے پھر فوراً سے یاد آگیا تھا

''اوہ......السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ، گڑیا کیسی ہے۔''

''وعلیکم السلام۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کی یادداشت کچھ ٹھیک نہیں، مطلب خاصی کمزور۔''

اس کے حظ اٹھانے پر وہ تندی سے بولی۔

''دراصل میں اجنبیوں کو یاد نہیں رکھتی۔''

''اوہ گڈ۔'' پھر اس نے خود ہی موضوع کو بدل دیا ''آپ کو پتا ہے یہ اسٹیشن حساس قرار دیا گیا ہے اور آپ شاید اکیلی آئی ہیں۔''

اس کی ایک نگاہ کے درست اندازے پر وہ چڑ کر بولی۔

''اگر میری اماں اجازت دے دیتیں تو یقیناً ریلی کے ساتھ ہی آتی، میں نے تو پورا انتظام بھی کر رکھا تھا لیکن اماں نے ریلی کے آگے دھرنا دے دیا۔''

ایک اچھی خاصی گرمی، رش اوپر سے صاف لگ رہا تھا اس کی پارٹی ہارنے جا رہی ہے، کوئی ایک آدھ ووٹر ہی اس کا دکھائی دے رہا تھا۔

''ظاہر ہے میرا ووٹ ہے، خود ہی آنا تھا۔'' اس کی خاموشی پر وہ چڑ کر وضاحت دینے لگی۔

''جی جی۔ بالکل ووٹ تو آپ کا ہے۔ لیکن جس طرح سے آپ درخت کے نیچے استراحت فرما ہیں، کوئی بیلٹ پیپر یہاں لا کر نہیں پکڑانے والا، آپ کو زحمت کر کے قطار میں لگنا پڑے گا، تاکہ فارغ ہوں اور گھر جائیں۔''

''جی۔ اطلاع کے لیے شکریہ۔'' وہ لمبی ہوتی قطار سے گھبرا کر پیچھے کھڑی ہوئی تھی، اس کی بات پر منہ پھیر لیا۔

''لائیں اپنی سلپ دکھائیں۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑی ووٹ نمبر والی پرچی احسان جتلانے کے انداز میں اس کی جانب بڑھائی۔ اس نے پرچی دیکھتے ہی بوتھ اور ووٹ نمبر پر نظر ڈالی۔ پھر دوسری جانب اشارہ کیا۔

''آپ کا بوتھ اُدھر ہے۔ آئیں میں لے چلتا ہوں۔''

عام حالات میں وہ کبھی بھی کسی کے کہنے میں نہ آتی لیکن گرمی اور پیاس کی شدت کے سبب شکر ہی کیا۔ غلط بوتھ کی لائن میں لگنے سے جلد پتا چل گیا۔ وہاں رش بھی نسبتاً کم تھا، جلد ہی فارغ ہو گئی تھی۔ اس کا واپسی پر بھی گیٹ تک ساتھ ساتھ آنا تانیہ کو خاصا ناگوار لگا تھا۔ وہ ابھی باہر نکلنے ہی لگی تھی، ضماد بھائی کی گاڑی آ کر گیٹ کے آگے رکی، وہ گھبرائے ہوئے تیزی سے باہر نکلے تھے۔

دراصل خبروں میں اس پولنگ اسٹیشن کا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ انہوں نے گھر فون کر کے تانیہ کا پوچھا تھا کیوں کہ وہی رہ گئی تھی ووٹ کاسٹ کرنے سے اور ہٹنے والی فطرت نہیں تھی۔ نعیمہ نے حسب عادت ترشی سے ہی کہا۔

''وہ جیالی رکنے والی ہے۔ خود تو گئی، ردابہ کو بھی ساتھ لے گئی۔ پتا نہیں کہاں دھکے کھا رہی ہوگی۔ تیری بیگم نے ہی مشورہ دیا تھا۔''

''اوہو۔ اچھا ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔''

انہوں نے فون بند کیا اور سیدھے اُدھر نکلے، شکر ہے وہ سامنے ہی نظر آ گئی۔ پیچھے سے آتے شرجیل نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھتے اپنی ڈیوٹی کا بتایا۔ اس سے باتوں میں لگ کر ضماد کو تانیہ پر آیا غصہ بیٹھ گیا۔ واپسی پر ردابہ کو ڈاکٹر سے پک کیا، اور راستے میں ضماد شرجیل کے متعلق عام سی باتیں مگر دیر تک کرتے آئے تھے۔

☆☆☆

شہر کے مشہور شاپنگ سنٹر میں وہ دونوں ہائم کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھیں، اپنا نمائندہ ہار جانے کا غم تانیہ کو کھائے جا رہا تھا۔ بات بے بات سب سے الجھ پڑتی، اس کا موڈ ٹھیک کرنے ہائم اُسے اور ردابہ کو شاپنگ پر لے آیا تھا۔ اُس کے ایک بازو پر منہل چڑھی تھی، اور دوسرے ہاتھ میں شاپنگ بیگز، دکان در دکان پھرنے سے وہ عاجز آ گیا۔

''یار جو کچھ لینا ہے جلدی لو۔ ایک تم لوگ ہر چیز رک رک کر دیکھتی ہو، پھر وہی ناپسند۔''

''اچھا بس۔ منہل کے شوز دیکھ لیتے ہیں، پھر چلتے ہیں۔''

''جی......'' ردابہ کی بات پر تانیہ نے لمبا سا جی کہا۔ ''اگر میڈم منہل کے شوز آئیں گے تو اس کی پھپھو جانی کے بھی لازمی آئیں گے۔'' تانیہ شوخی سے کہتے ہوئے منہل کے گال پیار سے تھپکتے اگلی دکان کے اندر داخل ہو گئی۔ رنگا رنگ جوتوں سے بھری دکان میں جوتے پسند کرنے میں انہیں وقت لگا تھا اور وہاں شرجیل بھی مل گیا۔

آج وہ ٹراوزر، ٹی شرٹ پہنے عام سے حلیے میں تھا لیکن دیکھنے میں پرکشش لگتا تھا۔ یہ اُس ایک ہفتے میں دوسری ملاقات تھی۔ وہ بہت سا سامان اٹھائے اپنی ماں کے ساتھ تھا، تانیہ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک شناسائی ابھر کر معدوم ہوئی، پھر وہ قریب آ گیا۔ ہائم نے طارق بھائی کی پارٹی پر بھلے ہی تو جبھی سے اُسے دیکھا تھا مگر جلد ہی پہچان گیا۔ مردوں کی پہچان عورتوں کی نسبت زیادہ جو ہوتی ہے، کچھ ضماد نے بھی پولنگ سے آنے کے بعد شرجیل کا ذکر کھانے پر کیا تھا۔

جتنی دیر میں خواتین نے شاپنگ کی وہ دونوں باتوں میں مصروف رہے۔ تھوڑی سی دیر کی بات چیت سے شرجیل اور ہائم میں اچھی خاصی بے تکلفی سی ہوئی تھی۔ جسے رادبہ کے ساتھ تانیہ نے بھی محسوس کیا تھا۔ شرجیل کی ایک آدھ نگاہ نگوں والی سینڈل میں پاؤں پھنسائی اس اکھڑسی لڑکی تانیہ پر بھی پڑی تھی، دل کے تار بج اٹھے تھے۔

کچھ دن بعد ہی شرجیل کی امی اور بڑا بھائی، طارق بھائی کے ہمراہ اس اکھڑسی لڑکی کا رشتہ لے کر نعیمہ کے گھر پر تھے۔ قدرتی طور پر اس روز ہائم آفس کے کام سے شہر سے باہر تھا، اس کی ان سب سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی، لیکن ضماد اور نعیمہ کو رشتہ بہت پسند آیا، سوچنے کے لیے مروتاً وقت مانگا تھا۔ شرجیل کی والدہ نے التجاً کہا۔

''بہن فیصلے میں زیادہ وقت نہ لینا۔ تین چار ماہ بعد میرے بڑے بیٹے کی شادی ہے۔'' کہتے ہوئے ساتھ کھڑے بڑے بیٹے کو محبت سے دیکھا تھا، وہ منہ بند کیے مسکرایا۔

''میرا دل ہے دونوں کی ساتھ ہی کردوں۔''

''اللہ بہتر کرے گا بہن۔'' نعیمہ نے ان کا ہاتھ محبت سے دبا کر کہا۔

ہائم کو جب پتا چلا اُسے اِس رشتے پر قطعاً اعتراض نہیں تھا۔ لڑکے سے وہ دوبار مل چکا تھا، عادت کا بے حد اچھا تھا، باقی ضماد اور نعیمہ دل سے راضی تھے، نعیمہ کوئی اچھا سا دن دیکھ کر انہیں کھانے پر باقاعدہ مدعو کرنا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

زندگی کی رتھ سبک رفتاری سے رواں دواں تھی، رات کا پردہ گرتے ہی افق چاندتاروں سے سج جاتا، صبح کا سورج جھلملاتے پردے کو چیر کر اپنی کرنیں نچھاور کرتا تھا، اک سکون تھا جو ہر نس میں بہتا تھا، وقت اب اس کے ہاتھ میں تھا ''کیا خوش فہمی ہے یہ بھی، وقت بھی بھلا کسی کے ہاتھ میں رہا ہے۔'' ان دنوں وہ بہت خوش تھی ایک تو نعیمہ کی تمام دلچسپیوں کا محور تانیہ کا جہیز تھا، دوسرے منہل کی مصروفیات اور کھیل کھلونوں میں شریک ہونے کے لیے ایک نیا رشتہ دنیا میں آنے والا تھا۔ اس کا احساس ہی اس میں پھر سے توانائی بھر رہا تھا، ویسے بھی یہ آنے والا بچہ اُسے اپنے لیے بہت مبارک لگتا تھا، جو کٹیلی نگاہیں، چبھتے جملے اس نے منہل کی پیدائش اور اس کے بعد سہے تھے، اُن میں بہت فرق آ گیا تھا یا شاید وقت نے ہر چیز اپنی جگہ پر سیٹ کردی تھی، اور ان ہی دنوں فریدہ کے ہارٹ اٹیک نے ہر چیز زلزلے کی طرح اتھل پتھل کردی۔

☆☆☆

مس رابعہ نے جو کچھ فائل کے بارے میں فون پر بتایا تھا، ہائم کا دماغ الجھ کر رہ گیا تھا، اس کا فون سننے کے بعد وہ بہت دیر کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہا، اس نے جو کچھ بتایا تھا اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اِس سب کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، اُسے رہ رہ کر رابعہ پر غصہ آنے لگا۔ بالوں میں تیز تیز چلتی انگلیاں اس کی پریشانی کی غماز تھیں۔ منہل الگ بار بار ماں کے پاس جانے کی ضد کررہی تھی، فریدہ جیسے ہی ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئیں تو ردابہ ان کے ساتھ انہی کے گھر چلی گئی اور ہائم سے بہت لجاجت سے کہا۔

''پلیز مجھے کچھ دن امی کے پاس رہنے دیں، اکیلی ہوتی ہیں۔ میں ان کا کچھ دن خیال رکھ لوں گی۔''

اتنے پیار سے کہنے پر تو اگر ردابہ ہائم کی جان بھی مانگتی وہ تب بھی انکار نہ کرتا۔ اس نے مسکرا کر ہاں میں سر ہلا دیا۔ منہل اس کے پاس تھی جو آج کی پریشانی میں سر درد لگنے لگی، اُس نے اُسے زور سے ڈپٹ دیا۔

''منہل۔ بلاوجہ ضدمت کیا کرو، دکھائی نہیں دے رہا بابا کتنے پریشان ہیں۔'' وہ کمبل میں دبک کر لیٹ گئی۔ ہائم نے اعظم لیاقت کے کانٹیکٹ پر کئی بار

ٹرائی کیا۔ پہلے تو ایسے پتا چلتا جیسے وہ فون کاٹ رہا ہے، پھر اُس نے اپنا نمبر بزی پر لگا دیا۔ ہائم نے رابعہ ہی کو اسے کانٹیکٹ کرنے کو کہا اس کا بھی وہی جواب تھا۔

''ان کا نمبر بزی جا رہا ہے، میں کیا کروں ہائم۔''

''آپ کچھ نہیں کریں رابعہ۔ میرا سر توڑ دیں۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو، اگر وہ فائل نہ ملی تو نقصان کس کا ہوگا، عابس صاحب کی کمپنی اور میری جاب کا۔ غلطی ہوگئی تھی مجھ سے جو میں آپ کو ڈراز کی چابیاں دے آیا تھا۔''

''ایم سوری ہائم۔ رئیلی ویری سوری۔'' وہ منمناتے ہوئے شرمسار تھی۔ ''مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں ہوا، اعظم لیاقت فائل لے کر ہی بیٹھ جائے گا۔'' رابعہ اپنی صفائی دے رہی تھی۔

''ایٹ لیسٹ رابعہ! آپ کو مجھ سے پوچھ تو لینا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کو فائلز چیک کرنے کا کہا تھا، بانٹنے کا تو نہیں۔ جانتی بھی ہیں وہ کس قدر غیر ذمہ دار شخص ہے۔ پتا نہیں اس نے فائل کہاں پھینک دی ہوگی۔''

''میں کیا کرتی اس نے یک دم ہی مانگ لی۔ اور باقاعدہ کہا تھا، وہ انہیں ہی دینے جا رہا ہے۔''

''کیا آپ کو نہیں معلوم عابس صاحب جاپان میں ہیں، کیا اعظم لیاقت جاپان دینے جا رہا تھا۔ عابس صاحب بار بار مجھے فون کر رہے ہیں کہ فائل اسکین کر کے بھیجوں، بتایئے کیا کہوں انہیں۔ کروڑوں کی ڈیل ہے ان کی۔''

''ایم سوری...... ہائم۔ میں...... میں ایک بار پھر اعظم کو ٹرائی کرتی ہوں۔''

رابعہ نے کہہ کر فون بند کیا۔ ہائم کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے، سارا دن اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں گزر گیا۔ کوئی دوسرا نمبر بھی نہیں تھا، انہوں نے حمید صاحب سے رابطہ کیا شاید انہیں ہی گھر کا معلوم ہو، وہ یادداشت کھنگالتے ہوئے بولے۔

''پچھلا گھر تو معلوم تھا لیکن چند ماہ پہلے انہوں نے گھر شفٹ کیا ہے۔ نئے ایڈریس کا مجھے بھی معلوم نہیں۔ بہرحال کوشش کرتا ہوں شاید کہیں سے پتا چل جائے۔''

عابس صاحب کے بار بار استفسار پر بلا آخر ہائم نے انہیں سچ بتا دیا۔ جس پر وہ آگ بگولا ہو گئے تھے۔

''او مائی گاڈ۔ ہائم، تم نے اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مجھے نہیں معلوم، کسی بھی طرح اُسے ڈھونڈو، میں یہاں مزید نہیں رک سکتا۔ کروڑوں کا نقصان ہو جائے گا۔ کہیں سے ڈھونڈو اسے، جہاں سے مرضی فائل پیدا کرو، مجھے وہ فائل ہر حال میں رات تک چاہیے ہائم، دیٹس اٹ۔''

وہ رابطے کی سرتوڑ کوشش میں لگا تھا، بمشکل اس کا فون اٹینڈ ہوا اور وہ صاف مکر گیا۔

''کیا۔ مس رابعہ جھوٹ بول رہی ہیں، میں وہ فائل کیوں لوں گا، میرے کس کام کی۔ آپ لوگوں کی محبت میں اگر آفس آ ہی جاتا تھا، تو مجھ پر الزام ہی لگا دیا، کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔''

اِدھر رابعہ نے آفس آنا ترک کر دیا، اُس کی شادی بالکل قریب تھی، وہ ایک ہی جواب دیتی رہی۔

''مجھے تو آپ سے ہمدردی مہنگی پڑ گئی ہائم۔''

ہائم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، عابس صاحب اپنا کانٹریکٹ فریز کروا کر پاکستان آئے اور بے طرح ہائم پر برسے تھے۔ اُن کے والد الگ خفا تھے۔

''اگر وہ فائل نہ ملی، جانتے ہو کمپنی تم پر کتنے بڑے ہرجانے کا دعوا کر سکتی ہے، کچھ اندازہ بھی ہے۔ ہائم، تمہیں۔''

حمید صاحب نے تو صاف عابس سے کہا تھا۔

ا ملازم اس پروجیکٹ کے لیے ہونا ہی نہیں چاہیے
تھا، مگر تمہیں میری بات سمجھ لگے تب ناں۔" انہیں
را یقین تھا اعظم لیاقت نے کچھ بھی نہیں کیا، وہ کام
ں سست ضرور تھا لیکن اہم ڈاکومنٹس کبھی اُس سے
گے پیچھے نہیں ہوئے۔ سارا قصور ہی ہائم اور مس
رابعہ کا ہے۔" انہوں نے فائنلی کہہ دیا تھا۔ "ان ہی
دونوں پر ایکشن لو، پولیس سے مدد لو، سب سامنے
جائے گا۔"

☆☆☆

رابعہ شادی کے بعد اپنے سسرال حیدرآباد
لی گئی تھی۔ اس نے فون پر کچھ تسلی دی کہ وہ کچھ
ن بعد آکر خود اعظم لیاقت سے بات کرے گی،
خر وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے، یہ سب باتیں
ئم کی تسلی کے لیے ناکافی تھیں۔ جس طرح سے
بس صاحب کو غصہ تھا اس کی نوکری خطرے میں
ی، اوپر سے کیس بن سکتا تھا۔ ردابہ بھی فریدہ
ے پاس سے واپس آچکی تھی اور کئی دن سے محسوس
ررہی تھی ہائم بہت الجھا ہوا رہنے لگا ہے، بات
چھ کرو، جواب کچھ آتا تھا۔ تانیہ کے رشتے میں
ی وہ خاص دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے کئی
ر اُس سے پوچھا بھی لیکن وہ ہر بار یہ کہہ کر ٹال
یا۔

"آج کل کام بہت زیادہ ہے۔ جانتی تو ہو، یہ
ب کس قدر ذمہ داری والی ہے۔"

ایک تو ردابہ فریدہ کی طرف سے پریشان،
کٹرز نے جلد ہی بائی پاس کا کہا تھا۔ پھر اپنی حالت
ا وجہ سے اس کا بی پی یک دم اوپر نیچے ہو جاتا تھا۔
ب آفس کی نئی ٹینشن دے کر ہائم اُسے مزید پریشان
یں کرنا چاہتا تھا، اور خوف بھی تھا کہیں اس کی
بیعت کا کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔ نہ بتانے میں ہی
فیت سمجھی۔

بعض اوقات مصلحتاً چھپائی جانے والی باتیں
ں عافیت کی جگہ خرافات بن جاتی ہیں۔ خرافات
ں ایسی کہ جن کے کفارے ادا کرتے ساری حیات

داؤ پر لگ جائے۔

☆☆☆

فریدہ کی طبیعت اب خطرے سے باہر تو تھی لیکن ہر وقت کی تنہائی، اور بیماری کا دھچکا سا لگ گیا تھا۔ وہ ردابہ کو پہلے سے زیادہ یاد کرنے لگیں، اور اسے بھی وہاں سے آئے اب اچھے خاصے دن ہو گئے تھے، کمرے کی چیزیں اپنے ٹھکانے پر رکھتے ہوئے اس نے ذرا ڈراتے ہوئے ہائم سے ایک اجازت چاہی تھی۔

"ہائم اگر میں دن میں کچھ دیر کے لیے امی کی طرف ہو آیا کروں، آپ کے آنے سے پہلے آجایا کروں گی تو......" کہتے ہوئے ملتجی نگاہ سے اُسے دیکھا۔ "گھر کا کام متاثر نہیں ہوگا، اصل میں امی اپنی طبیعت کی وجہ سے بہت گھبرا رہی ہیں۔ بار بار مجھے بلاتی ہیں۔"

"تمہاری اپنی طبیعت کون سا بہت بہتر ہے، سڑکوں کی حالت دیکھی ہے، ایسے میں بسوں کے دھکے، کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔"

"کچھ نہیں ہوتا، میں اپنا خیال رکھوں گی۔ پلیز صرف چند دن ہی جاؤں گی، پھر تو تانیہ کی شادی کے سلسلے میں ٹائم ہی نہیں ملنا۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

"جاؤ گی کیسے۔ پھر منہل کا اسکول......؟"

"رکشے پر۔ اور اسکول کا کیا ہے، نرسری کلاس ہی تو ہے، جاتے ہوئے اِسے سکول سے پک کرلوں گی۔ دو چار گھنٹے کے لیے ہی صرف، زیادہ دیر نہیں ٹھہرا کروں گی۔ بات چیت کرنے سے امی کا دل بہل جائے گا، اسی بہانے دواؤں کی بھی پابندی ہوجائے گی۔"

"دیکھ لو۔" اس نے پُرسوچ سر ہلایا۔ "ایسا کرو چلی تم جانا، واپسی پر میں لیتا آؤں گا' اور ہاں تم یہاں امی سے بات مت کرنا میں خود انہیں بتادوں گا۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو سو مچ ہائم۔" وہ اس

مہربانی پر دل سے شکر گزار تھی، اور ہائم اس کے مسکراتے چہرے کی رونق پر پل بھر کو اپنی دفتری تمام پریشانی بھول سا گیا تھا۔

☆☆☆

ثانیہ کا اچھا رشتہ ہو جانے کی وجہ سے نعیمہ آج کل بہت خوش رہتی تھیں، بلا جواز پابندیاں جو پہلے دن سے ردابہ پر لگی تھیں اب ان میں بھی اچھا خاصا فرق آ گیا تھا، ہائم نے جب فریدہ کی سیریس حالت کا کچھ بڑھا چڑھا کر بتایا تو ان کا دل خود ہی پسیج گیا، بجائے یہ کہ وہ جانے کی اجازت طلب کرتا انہوں نے خود ہی کہہ دیا۔

”گھر کا کام جلدی نبٹا کر کچھ دیر کو چکر لگا آیا کرے، کل کلاں کچھ ہو ہوا گیا کہہ دے گی ماں سے ملنے بھی نہیں دیا۔“

اجازت ملنے کی دیر تھی وہ جلدی جلدی کام ختم کر منہل کو اسکول سے لے کر، رکشے پر فریدہ کی جانب چلی جاتی، واپسی پر ہائم پک کر لیتا۔ دن معمول کی ندی بن گئے تھے، بہتی ندی پر سورج کا عکس جھلملاتا تو اوپر کی سطح گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی تہ میں ٹھنڈک ڈیرہ ڈالے تھی۔ ندی تو ندی ہوتی ہے، جس کا بہاؤ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کنکر کبھی تنکے اس میں آ گرتے ہیں، بھاری چیزیں بیٹھ کر تہ میں چلی جاتی ہیں ہلکی تو ڈبونے کے باوجود بھی سطح پر تیرنے آ ہی جاتی ہیں، جیسے کاک، جیسے تنکے، جیسے کاغذ اور ہاں ڈولتے پتوار بھی تو......آہ۔

نعیمہ کا رویہ جس سے اُسے لگتا تھا کبھی چھٹکارا نہیں ملنے والا، یکسر بدل چکا تھا۔ اس کی اس روٹین پر وہ بالکل بھی خفا نہیں تھیں۔ بلکہ گھر کے کام کاج کی روٹین بھی اب زارا اور اس کی برابر کی شراکت پر آ گئی تھی۔ اگر یہی معاملہ دو تین سال پہلے ہوتا وہ اس کا جینا حرام کر دیتیں، اب تو اس کے آتے ہی فریدہ کی طبیعت کا، علاج دواؤں کا پوچھتیں۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ جس دن ردابہ کسی وجہ سے نہ جا سکتی فون پر خاصی دیر بات کر کے تسلی کر لیتی تھی، فریدہ بھی اتنا خیال ملنے پر جلد صحت کی جانب لوٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

آج وہ کئی دن بعد فریدہ کی جانب آئی تھی، واپسی پر خاصی شام ہو چکی تھی لیکن ابھی تک ہائم اُسے پک کرنے نہیں آیا تھا، اس نے بہت دیر اس کا انتظار کرنے کے بعد ہائم کو کال کر لی، وہ عجلت میں بولا۔

”میں آفس ورک میں بری طرح الجھ ہوں، تم کیب وغیرہ پر چلی جاؤ۔“ ہائم نے بہت عجلت میں کہا تھا حالانکہ وہ ردابہ کی طبیعت کا اُس سے زیادہ خود خیال رکھتا تھا۔ یقیناً وہ اُس دن بہت بزی ہی ہوگا۔ تب ہی اگلی بات نہ کہی نہ سنی، فون بند کر دیا۔

ردابہ کو اکیلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، رومانہ بھابھی نے پہلی بار اصرار سے روکا بھی تھا۔

”کچھ دیر انتظار کر لو، احمد آتے ہوں گے، و چھوڑ آئیں گے۔“

”نہیں بھابھی۔ پھر دیر ہو جائے گی، پہلے ہی آٹھ بج چکے ہیں۔ اِسے ہوم ورک بھی کروانا ہے۔“

وہ سب سے مل کر منہل کے ساتھ کیب میں گھ آ رہی تھی، مال روڈ پر ٹریفک بے طرح جم تھی، ڈرائیور نے ملحقہ لنک روڈ پر گاڑی موڑ لی، رش وہاں بھی بہت تھا، مگر کم، ٹریفک آہستہ مگر چل رہی تھی، سڑک کی دوسری جانب درختوں میں لگے برقی قمقموں میں روشن اوپن ائیر ریسٹوران لائن میں بنے تھے۔ اچھے خاصے لوگ گول ٹیبلز پر بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ دیکھنے میں یہ گمان ہوتا تھا۔ جیسے ان بے فکرے لوگوں کے لیے دنیا صرف کھانے پینے کے لیے ہی بنی ہے، وہاں ہی ردابہ نے ایک ٹیبل پر ہائم کو ایک خوب صورت لڑکی کے مقابل بیٹھے دیکھا، پل بھر کو ردابہ کی زمین آسمان سب ہل کر رہ گئے تھے۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحت جبیں

ماں جی



موسم نے انگڑائی لی تھی۔ مزید ایک آدھ بارش کی دیر تھی کہ سردیاں شروع، رات کی بارش کے بعد ہی خاصی ٹھنڈ ہو چلی تھی۔ ماں جی نے کبیر کو بلوا کر اوپر ممٹی میں رکھی پیٹی کھلوائی کہ اپنے لیے لحاف اور دیگر افراد کے لیے کمبل نکلوا سکیں۔

"یہ شہود کا، یہ تیرا اور یہ نجم......" نام ان کے لبوں سے پھسلتے پھسلتے ہی ادھورا رہ گیا۔

"محمود بھائی کے لیے کبھی کچھ نکالنا نہیں بھولتیں آپ۔ دل ان ہی میں اٹکا ہوتا ہے لیکن مانتی نہیں ہیں۔" وہ بھی کبیر تھا۔ جو دل میں آتا کہہ کر ہی دم لیتا۔

ماں جی نے اسے گھور دیکھا۔

"اس کا نام مت لیا کر میرے سامنے۔"

کبیر ہنس دیا۔

"اس کا نام خود لیتی ہیں اور منع ہم سب کو کرتی ہیں۔"

ماں جی نے اس کی کمر پر سوٹی ماری تو بلبلا اٹھا۔

"بہت زبان چلانی آ گئی ہے۔ ماں کی کمر جھک گئی تو تو نے اسے بڈھی سمجھ لیا۔ اب بھی دم خم باقی ہے۔ کمزور مت سمجھنا۔"

کبیر اپنی کمر سہلاتے دانت نکوس کر بولا۔

"ایسی غلطی تو ابا تک نہ کر سکے اور حسرت لیے دنیا سے چلے گئے۔"

وہ کمبل نکال کر کاندھے پہ لاد کر نیچے چلا گیا۔ اگلے چکر میں ماں جی کا لحاف اور اس سے اگلے میں بھابھی کا لحاف تب تک ماں جی وہیں کھڑی رہیں۔

"ماں جی! مجھے تو بتا دیں کہ محمود بھائی کو آخر کیوں گھر بدر کیا۔ وہ تو سب سے لاڈلا تھا نا آپ کا!"

ماں جی جانتی تھیں کہ وہ سوٹیاں کھا لے گا مگر پوچھے بنا نہ رہے گا۔

"لاڈلا تھا تو کیا سر پر بٹھا لیتی تاکہ مزید سر چڑھ جاتا۔ بس ہو گئی اس سے ایک نافرمانی کہ گھر بدر کر دیا۔ اب مجھے نیچے لے جا اور خبردار کہ اس کا نام بھی لیا تو۔" اس کا ہاتھ تھام کر وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔

کبیر کی زبان میں پھر سے کھجلی ہوئی۔

"آخری بات...... بس ایک آخری کہنے دیں ماں جی۔" ماں جی اب سیڑھیاں اترتیں یا اس کی کمر پر سوٹی

برساتیں۔
"باز آجا کبیر!" بس سختی سے اتنا ہی کہہ سکیں۔
"باز بھی آجاؤں گا۔ بس آخری بات۔ اپنی اکلوتی بہن کی شادی پہ تو اسے آلینے دیں۔ خود سے اسے بلوالیں۔ پھر گھر بدر تو اسے کرنا ہی ہے مگر یہ حق تو اس سے مت چھینیں۔"
ماں جی آخری سیڑھی پر تھیں۔ ہاتھ کبیر سے چھڑالیا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔
"ماں جی! چلا تو وہ جائے گا ہی کیونکہ آپ جو اسے رہنے نہیں دیں گی اور آپ کی ہر بات پر عمل ہی اس کا ایمان ہے۔ بس حوریہ کی شادی میں بلالیں۔"
ماں جی جواباً خاموش رہی تھیں تو کبیر نے بھی مزید بات کرنا بیکار سمجھا۔

☆☆☆

رات ساری آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی۔ سارا منظر کسی فلم کی مانند آنکھوں کے سامنے آجا رہا تھا۔
"نکل میرے گھر سے اپنا سامان اٹھا کر۔" وہ اس کی الماری سے اس کے سارے کپڑے نکال کر پھینک رہی تھیں۔
"ایسا کیا کردیا ماں جی کہ گھر سے ہی نکال رہی ہیں۔" وہ بتیس سالہ نوجوان ماں کے ایسے دھتکارنے پہ رو رہا تھا۔
"میں ہزار بار بھی کہوں تو نہیں سنے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ چلا جا یہاں سے۔"
"ایسی کون سی بات ہے جو آپ کو ہزار بار کہنا پڑے۔ میں تو آپ کی کہی بات پہلی بار میں ہی مان لیتا ہوں۔"
وہ زمین پر گرے کپڑے سمیٹ رہا تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے سے لگے اس کے بہن بھائی حیران تھے۔ آج ماں جی کو کیا ہوا تھا کہ اپنے لاڈلے کو گھر سے نکال رہی تھیں۔ بہو حیران تھی لیکن ماں جی سے سوال کرنے کی ہمت بھلا کس میں تھی۔
"بس کہا نا اپنی بیوی کو لے اور نکل جا اس گھر سے۔ دوبارہ یہاں کا رخ مت کرنا۔" آنکھوں سے بہتے آنسو اس نے پونچھے اور اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔
"ماں جی! محمود بھائی اور بھابھی جا رہے ہیں۔"
"جانے دو۔" وہ اسے دیکھنے کی روادار تک نہ تھیں۔
"انہیں روک لیں۔" حوریہ رو پڑی۔
"خبردار جو کسی نے یہ کام کیا۔" سب کو سانپ سونگھ گیا۔
محمود ماں جی کے پیروں کو ہاتھ لگا کر اپنی نو بیاہتا بیوی اور مختصر سامان کو لے کر دہلیز پار کر گیا۔
فجر کی اذان کانوں میں پڑی تو ماں جی نرم گرم لحاف سے نکل کر وضو کرنے اٹھیں۔
"ماں جی۔" انہیں لگا محمود نے پکارا ہے۔ وہ سارا گھر ٹٹولتے اسے ڈھونڈنے لگیں مگر وہ ہوتا تو ملتا نا۔
"ماں ہوں، ڈائن نہیں ہوں، لیکن اولاد کی خاطر جی کڑا کرنا پڑتا ہے۔" وضو کا پانی لوٹے میں بھرتے ان کی آنکھیں بھر آگئی تھیں۔

☆☆☆

"حوریہ کی شادی میں محمود بھائی بھی آئیں گے۔" کبیر اعلان کرتا سب کو حیران کر رہا تھا۔ ماں جی کے فیصلے پہ بھلا سوال اٹھا بھی کون سکتا تھا۔ کسی کی ایسی مجال کہاں تھی۔ سب اسی بات پہ خوش تھے کہ حوریہ کی شادی پر سب اکٹھے ہوں گے۔ مکمل فیملی ہوگی۔
محمود ماں کا سب سے بڑا اور فرماں بردار بیٹا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے پڑھائی کے ساتھ ٹیوشنز پڑھا کر سلائی سے گھر کی گاڑی چلانے والی ماں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ بہت ذمہ دار تھا اور اس سے چھوٹے شہود اور کبیر اتنے ہی لاپروا اور غیر ذمہ دار۔ ماں جی کو ان کی فطرت پر غصہ تو آتا مگر سوچتیں کہ وقت کے ساتھ سنبھل جائیں گے۔ سنبھلنا کیا تھا، دونوں نے ایف اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہا اور معمولی سی نوکری کرنے لگے۔ شہود نے تو پسند سے شادی بھی کرلی۔ ماں جی کو قلق تھا کہ محمود بیٹھا ہے اور شہود بیاہا گیا مگر ان دنوں محمود اپنی ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ شہود جو کوئی کام ٹک کر نہ کرتا محمود سے ہی پیسے مانگتا رہتا۔ شہود کی دیکھا دیکھی کبیر بھی اسی لائن پر چل نکلا۔
"تو، ان کی مٹھی گرم کرتا رہے گا تو وہ کبھی کچھ نہ کر سکیں گے۔" ماں جی محمود کو ٹوکتیں مگر وہ بڑا بھائی بننے سے باز نہ آتا۔
"انہیں بساتا رہے گا تو خود کب بسے گا؟" ماں جی محمود کے اس دیالو پن سے زچ ہو چلی تھیں۔

☆☆☆

"گھر آگیا محمود! بس ماں جی سے دور رہ کر انہیں دیکھ لینا۔"

محمود بھائیوں کے ہمراہ حوریہ کی شادی میں شرکت کے لیے پہنچ گیا تھا۔ کیسا جبر تھا جو اسے دل پر کرنا تھا کہ اس چھت تلے ماں جی کو دیکھ کر بھی ان دیکھا کرنا تھا۔ آٹھ سال بعد بھی وہ ان سے لپٹ نہیں سکتا تھا۔ ان کی گود میں سر نہیں رکھ سکتا تھا۔ نہ ماں جی نے اسے نظر بھر کر دیکھا نہ اس کے بیوی بچوں کو۔ لیکن وہ سب ہی ماں جی کو چاند سمجھ کر چکور بن گئے تھے۔

حوریہ کی رخصتی کے بعد شہود سلامیاں کھول کر ماں جی کو تھما رہا تھا۔ کبیر انہیں حساب کتاب کی کاپی پر لکھتا جا رہا تھا۔ محمود کے دیے لفافے میں سے چیک برآمد ہوا تھا۔ شہود کے ہاتھ کپکپا گئے تھے۔

"یہ تو دس لاکھ کا چیک ہے۔" آواز سمیت وجود بھی کانپ گیا۔

"بلا کر لا اس حاتم طائی کی اولاد کو۔ سب جمع ہو جائیں میرے کمرے میں۔ آج سب سوالوں کے جواب ملیں گے۔" ماں جی کی گھن گرج پہ دونوں سہم گئے۔

سارا گھر بمعہ محمود کے ماں جی کے کمرے میں جمع تھا۔ سب کی جان لبوں پر تھی۔ ماں جی سامنے صوفے پر بیٹھی تھیں، سر جھکا اور ہاتھ میں محمود کا چیک تھام رکھا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے پوچھا۔

"حوریہ کی سلامی۔" محمود اس بات پہ خوش تھا کہ آٹھ سال بعد ہی سہی ماں جی نے اسے مخاطب تو کیا۔

"دس لاکھ سلامی ہے یا اس کی شادی کا خرچا جو تو اکیلا اٹھانا چاہتا ہے۔" نو سال پرانی بات کا حوالہ دیا گیا تھا جب محمود نے بڑے مان سے کہا تھا۔

"ہم بھائیوں کی شادی پر آپ نے ادھار پکڑ کر گزارا کیا ماں جی۔ حوریہ کی شادی پہ دیکھنا میں سارا خرچا خود اٹھاؤں گا۔ خوب دھام دھام سے شادی کروں گا۔"

"نہیں چاہئیں ہمیں یہ پیسے۔ حوریہ کے سبھی بھائیوں نے اپنی بساط بھر کوشش کر کے اسے عزت سے رخصت کیا ہے۔ وہ سب کی بہن تھی، کسی ایک کی ذمہ داری نہیں تھی تو پھر ایک ہی کیوں خرچا اٹھائے۔"

"لیکن میں افورڈ کر سکتا ہوں ماں جی۔"

ماں جی نے اسی وقت ہاتھ اٹھاتے اسے بولنے سے روکا۔

"جاننا چاہتا ہے کہ تجھ جیسی فرماں بردار اولاد کو میں نے کیوں نکالا؟"

سب چونکے اور بری طرح چونکے۔ محمود نے سر نفی میں ہلایا۔

"تیری اسی عادت کی وجہ سے کہ دوسروں کی ذمہ داریاں بھی اپنے کاندھوں پر اس حد تک اٹھا لیتا ہے کہ باقی سب کو اپاہج کر ڈالتا ہے محمود۔"

حیرت کا جھٹکا سب کو لگا تھا۔ ماں جی کا لہجہ نرم، دکھی اور ٹوٹا ہوا تھا۔ "تو ڈاکٹر بن گیا کیونکہ تو قابل اور محنتی تھا۔ یہ سب کیوں نہ پڑھ سکے کیونکہ یہ کام چور تھے۔" بھائیوں کے سر شرمساری سے جھک گئے۔ "تو بھائیوں پہ لٹاتا رہا تو یہ ہاتھ پیر ہلانے کو گناہ سمجھ بیٹھے۔ تو کہتا تھا شہود کے بچے تیری ذمہ داری ہیں کیونکہ وہ کما نہیں رہا۔ کبیر ورک شاپ چھوڑ چکا ہے تو اس کا خرچا تجھ پر ہے۔ حوریہ کو جو چیز چاہیے وہ تو لا کر دے گا۔" ماں جی کی آواز بھرائی اور محمود کی آنکھیں۔ "تجھے اس گھر میں رکھتی تو ان بچوں کو ناکارہ کر ڈالتی۔ کیونکہ تو اپنی دینے والی فطرت سے پیچھے نہ ہٹتا اور یہ لینے والی فطرت سے۔"

محمود دھندلائی نظروں سے ماں جی کو دیکھ رہا تھا۔

"دیکھ اب دونوں بھائی کیسے ورک شاپ چلا رہے ہیں۔ اپنے اپنے خاندان کے ساتھ ماں اور بہن کو بھی کھلا رہے ہیں۔ تو یہاں رہتا تو نہ ان کی ورک شاپ چلتی نہ تیرا کلینک کھلتا۔" سب ساکت تھے۔ ماں جی بول رہی تھیں رو رہی تھیں۔

"ایک لگا تیں اور کہتیں محمود باز آجا۔" وہ رو کر ماں جی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"تو تب بھی باز نہ آتا۔" بیٹے سے واقف تھیں۔

"ایک ذمہ دار اولاد باقی اولادوں کو غیر ذمہ دار بنا رہی ہو تو ایسے کڑوے گھونٹ ماؤں کو پینے پڑتے ہیں میرے بچے۔" محمود کے سر پر بوسا دیتے وہ کھل کر رو دیں۔

کبیر نے مسکرا کر شہود کو دیکھا۔

"ماں جی ٹھیک کہتی تھیں۔ ماں ہوں ڈائن نہیں ہوں۔"

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

دلیس میں نکلا ہوگا چاند

"امی! کیا کہا آپ نے؟"

کنول نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں پھیلا کر ماں کی طرف دیکھا۔ عارفہ نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سامنے رکھی کپڑوں کی بالٹی میں سے جھک کر سفید قمیص نکالی۔ اسے اچھی طرح نچوڑ کر کئی بار جھٹکا اور صحن میں لگی تار پر پھیلا دیا۔ ڈرائیر کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے عارفہ یہ کام اپنے ہاتھوں سے ہی سرانجام دیتی تھیں۔

کنول جو صحن میں رکھی پرانی کرسی پر بیٹھی، رسالے سے لطف اندوز ہو رہی تھی ماں کا موڈ سنجیدہ دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور آگے بڑھ کر ماں کی مدد کروانے لگی۔ عارفہ نے تیکھی نظر اس پر ڈالی۔

"رہنے دو۔ سب کچھ کر لیا ہے میں نے۔"

عارفہ نے آخری سوٹ بھی تار پر پھیلایا او ربالٹی اٹھا کر صحن کے کونے میں رکھی مشین کی طرف چلی گئیں۔ کنول کھسیانی سی ہو کر سر کھجانے لگی۔ عارفہ نے اس تک ادھوری بات پہنچا کر اب مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کنول نے گہری سانس لے کر پرانی واشنگ مشین کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"اچھا امی سوری! آئندہ آپ کے ساتھ کام کروادوں گی۔" کنول نے ہمیشہ کی طرح کہا تو عارفہ نے کام ختم کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"تم یہ بات ہر بار کہتی ہو اور پھر اپنی کتابوں کی دنیا میں گم ہو کر سب بھول جاتی ہو۔" عارفہ کا لہجہ ہموار تھا۔ اس لیے کنول اندازہ نہیں لگا سکی کہ عارفہ اس سے ناراض ہیں یا نہیں۔

"اچھا یہ سب چھوڑیں اور سچ سچ بتائیں کہ کیا یہ خبر درست ہے؟" کنول نے ادھوری بات چھوڑتے ہوئے بے چینی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"کنول! اس میں سچ یا جھوٹ والی کیا بات ہے۔ ان کا گھر ہے۔ ان کی مرضی! جب دل چاہے آ کر یہاں رہیں۔" عارفہ نے لاپروائی سے کہا

"امی مجھے بھی معلوم ہے کہ اس گھر میں ان کا بھی ایک حصہ ہے مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ان کے اتنے اہم مہمان اور رہنے کے لیے اس جگہ تشریف لائیں گے۔ ویسے آ کون رہا ہے؟ یہ نہیں بتایا تائی امی نے؟" کنول نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے سوال پوچھا۔ عارفہ نے سخت نظر ڈالی تو کنول نے فوراً کان کو ہاتھ لگا کر سوری کہا۔

"کیوں اس جگہ کو کیا ہوا ہے؟ اچھی بھلی تو ہے اور ویسے بھی ہر کوئی اپنی مرضی کا مالک ہے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ یہ فضول کی ٹوہ لینا اور باتیں کرنا بند کرو۔ کوئی بھی آئے۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم بس اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ کم از کم کسی کے سامنے تو میری عزت بنی رہنے دینا۔" عارفہ نے ہمیشہ کی طرح اسے سختی سے سرزنش کی۔ کنول منہ بنا کر رہ گئی۔

"دنیا جہاں کی ماؤں کو اپنی اکلوتی اولاد سے بے حد محبت ہوتی ہے کہ ان کی خامیاں بھی نہیں دیکھتیں، مگر ایک ہماری امی جان ہیں، ساری دنیا کو اچھا کہیں گی بس اپنی اکلوتی بیٹی میں ہی خامیاں نظر آئیں گی۔ آپ سے سوال پوچھنے سے تو بہتر ہے کہ

مکمل ناول



میں اپنی کہانی ہی مکمل کر لیتی۔'' کنول بڑبڑاتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر چلی گئی اور کرسی پر بیٹھ کر رسالہ کھول لیا۔

''یہ رسالہ چھوڑو! اور چل کر میری ساتھ اوپر والا پورشن صاف کرنے میں کچھ مدد کرو۔ کچھ دنوں میں غزالہ بھابھی کے مہمان آجائیں گے۔''

عارفہ کے کہنے پر کنول کے منہ کے زاویے بگڑ



گئے مگر اس نے کچھ بھی کہنے کے بجائے رسالہ منہ کے آگے کرلیا۔ یہ اس کی ناراضی کی نشانی تھی۔

”تم اسی طرح نخرے دکھاتی رہو مگر مجھ سے امید مت رکھنا کہ میں تمہارے نخرے اٹھاؤں گی۔“

عارفہ نے غصے سے کہا اور جھاڑو اور وائپر اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ کنول نے گہری سانس کر رسالہ رکھا۔

”قسم سے اللہ جی۔ ضدی ماں کے ساتھ گزارا کرنا بھی آسان نہیں ہوتا ہے۔“ کنول کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”اور اگر ضدی کے ساتھ نالائق اولاد بھی ہو تو اس کی تربیت کرنا بھی آسان نہیں بیٹا جی۔ آتے ہوئے سرف اور فنائل کی بوتل لے آنا۔“ عارفہ نے منڈیر پر سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔ کنول نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔

”قسم سے امی! آج تو تائی امی والی حرکت کی ہے آپ نے! یعنی اوپر ان کے اثرات باقی رہتے ہیں۔“

”بہت تیز ہو تم!“

عارفہ نے اسے گھورا مگر کنول ان کے ہونٹوں پر پھیلی بے ساختہ مسکراہٹ دیکھ چکی تھی۔ کنول نے جلدی جلدی باقی کی چیزیں اٹھائیں اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ شام ڈھلے تک دونوں ماں بیٹی نے کئی مہینوں کا بند پورشن اچھی طرح صاف کرکے چمکا دیا تھا۔

☆☆☆

”کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ یہ اسکارف مت لیا کرو۔ اپنی عمر سے کئی سال بڑی نظر آتی ہو۔“

غزالہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ابھی ابھی بازار سے تھکی ہاری واپس لوٹی تھیں۔ لاؤنج میں رکھے صوفے پر وہ تینوں نیم دراز ہو کر اپنی اپنی سانسیں بحال کرنے لگیں۔ جب غزالہ کی نظر اسکارف اتارتی ہما پر پڑی تو وہ اپنی ناگواری کو نہیں چھپا سکیں۔ ہما نے منہ بنا کر ماں کی بات کو سنا۔ اسی وقت شاپنگ بیگز اٹھائے پسینے میں شرابور حیدر اندر داخل ہوا اور آتے ہی سب شاپرز زور سے زمین پر پٹخے۔

”یہ سنبھالو! مجھے کیا نوکر سمجھ رکھا ہے۔ کتنے آرام سے سب کچھ چھوڑ کر آپ تینوں اندر چلے آئے ہیں۔“ شدید گرمی کے ساتھ ساتھ حیدر کا مزاج بھی بہت گرم ہو رہا تھا۔

”میرا بچہ! تھک گیا ہے۔ سیمی! جلدی سے اٹھ۔ بھائی کے لیے ٹینگ بنا کر لا۔“ غزالہ کے کہنے پر سیمی منہ بنا کر رہ گئی۔

”میں بہت تھکی ہوئی ہوں، ہما سے کہیں۔“ سیمی نے خود سے تین سال بڑی ہما کی طرف دیکھ کر کہا۔

”رہنے دیں مما! میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جسے آپ ٹینگ پلا کر خوش کر دیں گی۔ مجھے معاف کر دیں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔“

حیدر نے چڑ کر کہا اور پاؤں جھٹک کر اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔

”دیکھا مما! آپ کے لاڈ پیار نے اس کا دماغ ہی خراب کر دیا ہے۔ کس بدتمیزی سے بات کر رہا تھا۔“

ہما نے ہمیشہ کی طرح نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

”غلطی تم لوگوں کی بھی ہے۔ ذرا بھی چھوٹے بھائی کا احساس نہیں۔ ہر وقت اسے لیے بازاروں میں پھرتی رہتی ہو۔ وہ بھی انسان ہے تھک جاتا ہے، اس لیے چڑ رہا ہے۔“ غزالہ نے اکلوتے بیٹے کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

”خیر مما۔ اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اسے خود بھی شوق ہے ہمارے ساتھ گھومنے پھرنے کا۔ اپنی مرضی کی جگہ پر آؤٹنگ کرنے ایسے ہی تو وہ نہیں جاتا ہمارے ساتھ۔“ سیمی نے اپنی شاطرانہ فطرت کے مطابق جواب دیا تو ہما اور غزالہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ اچھا اٹھو، کچھ ٹھنڈا بنا کر لے آؤ، حلق خشک ہو رہا ہے۔''
غزالہ کے کہنے پر ہما اپنی جگہ سے اٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد لال شربت کا جگ بنا کر لے آئی۔ جسے کچھ منٹوں میں وہ تینوں غٹاغٹ پی گئیں۔
''آپ لوگوں کی تھکاوٹ اتر گئی ہو تو مجھے کچھ کھانے کو دے دیں۔ صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے۔ اب شام کے چھ بج رہے ہیں۔''
حیدر نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے دہائی دی۔
''میں نے آج کچھ نہیں بنایا ہے۔'' غزالہ کے کہنے پر حیدر تھک ہار کر صوفے پر گر گیا۔
''صرف آج مما؟ آپ تو ہفتے میں ایک دن بمشکل کھانا بناتی ہیں۔'' حیدر نے چڑ کر کہا تو غزالہ تپ گئیں۔
''اپنی حد میں رہو۔ میں جتنا تمہارا لحاظ کر رہی ہوں تم اتنا ہی سر چڑھتے جا رہے ہو۔ ساری زندگی میری تم لوگوں کو پالنے اور سسرال والوں کی خدمت کرنے میں ہی گزر گئی ہے۔ اب جا کر سکون کی چند گھڑیاں ملیں ہیں تو تم سوتنوں کی طرح طعنے دینے لگ گئے ہو۔'' غزالہ کہتے کہتے جذباتی ہو گئیں اور آنکھوں پر دوپٹا رکھ کر رونے لگیں۔
''شرم نہیں آتی تمہیں۔ تم ہمیشہ مما کو دکھ دیتے ہو۔'' سیمی نے فوراً انٹری ماری اور ماں کے پاس جا کر دلاسا دینے لگی۔
غزالہ نے کن انکھیوں سے پشیمان بیٹھے حیدر کی طرف دیکھا اور دوبارہ اونچی آواز میں رونے لگیں۔
''اچھا مما۔ معاف کر دیں۔ گرمی اور بھوک کی وجہ سے ایسا ویسا بول دیا۔ پلیز اب موڈ ٹھیک کریں ناں۔ پھر ہم کچھ آرڈر کرتے ہیں۔''
حیدر نے پاس آکر ماں کے گلے میں بازو ڈالے تو غزالہ فوراً چپ ہو گئیں۔ پھر ان چاروں نے کافی سوچنے اور بحث کرنے کے بعد کھانا آرڈر کیا۔
رات کے نو بجے الیاس کا سعودی عرب سے فون آیا تو غزالہ انہیں آنے والے مہمانوں کے بارے میں بتانے لگیں۔
''یہ کیا بات ہوئی؟ وہ لوگ پرانے محلے میں کیوں رہیں گے؟ تم انہیں اپنے گھر رہنے کی دعوت دو۔'' الیاس نے سب سننے کے بعد کہا۔
''واہ جی! یہ خوب کہی آپ نے۔ اتنے سال گزر گئے آپ کے رشتے داروں کی خدمت کرتے ہوئے۔ ابھی بھی کوئی حسرت رہتی ہے آپ کو۔'' غزالہ نے تنتنا کر کہا تو الیاس فوراً بھیگی بلی بن کر منمنانے لگے۔
''ارے غصہ کیوں کرتی ہو! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ خالدہ آپا اماں مرحومہ کو بہت عزیز تھیں۔ اماں مرحومہ نے انھیں بیٹی بنایا ہوا تھا۔ کئی سال پہلے وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ اٹلی چلی گئیں تو رابطہ بہت کم ہو کر رہ گیا۔ اب اچانک سے ان کی آمد کی خبر آئی تو بے اختیار اماں مرحومہ کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ زندہ ہوتیں تو کتنی خوشی مناتیں۔'' الیاس کے لفظوں سے اداسی ٹپک رہی تھی۔
غزالہ کے بگڑے تیور مزید بگڑ گئے مگر وہ لہجے کو نرم کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔
''مجھے بھی آپ کی اماں کی چاہت یاد ہے۔ اس لیے جب میں نے سنا کہ انھیں رہائش کے لیے اندرون شہر میں ہی جگہ چاہیے تو میں نے فوراً انھیں اپنے خالی پورشن میں رہنے کی آفر کی۔ جسے انھوں نے بخوشی مان لیا کہ اس گھر سے اماں کی بہت سی یادیں جڑیں ہوئی ہیں۔ وہ بھی وہاں ہی رہنا چاہتی ہیں۔ باقی آپ فکر مت کریں، میں انھیں دعوت پر بلاؤں گی۔ ویسے عارفہ بہت سمجھ دار ہے۔ وہ مہمانوں کو آرام سے سنبھال لے گی۔ مجھ سے تو اب اتنی بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔''
غزالہ نے کہا تو اسپیکر سے الیاس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز گونجی۔
''ہمم..... وہ سب تو ٹھیک ہے مگر عارفہ بھابھی کے حالات ایسی بھاری مہمان داری کی

اجازت ہرگز نہیں دیتے ہیں۔ اسلم کی پنشن اور دکان سے آئے کرائے سے بمشکل ماں بیٹی کا گزارا ہو رہا ہے۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ خالدہ آپا کا ٹور کافی لمبا ہے۔ ان کے سسرالی رشتے داروں میں تین شادیاں ہیں۔'' الیاس نے تفصیل سے کہا۔

''اف۔ آپ بھی کہاں کہاں کی پریشانیاں پال لیتے ہیں۔ خالدہ آپا اتنے سالوں کے بعد پاکستان آ رہی ہیں۔ پھر ان کی اتنی لمبی چوڑی سسرال ہے۔ ان کے پاس کہاں وقت ہوگا کہ گھر میں ٹک کر بیٹھیں۔ اس لیے عارفہ پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ میں دیکھ لوں گی اگر کوئی مسئلہ ہوا تو کچھ مدد کر دوں گی عارفہ کی۔''

غزالہ نے تکبر سے کہا تو الیاس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''مما۔ پاپا کو اب بھی دوسروں کی فکر زیادہ ہے۔''

غزالہ نے الیاس سے ہوئی گفتگو کو احوال دونوں بیٹیوں کو سنایا تو حسب معمول دونوں نے ماں کی طرف داری کرتے ہوئے باپ کو غلط قرار دیا۔

''تو اور کیا! تم لوگ بھول گئے کہ تمہاری دادی اماں کتنی سخت اور اصول پسند تھیں۔ سارے خاندان سے رشتے داری نباہنے کا شوق تھا۔ چاہے کوئی انہیں بلائے یا نہیں، یہ خالدہ آپا ان کی کسی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ ان کی سہیلی تو پہلی بچی کی پیدائش کے کچھ سالوں بعد ہی کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر وفات پا گئیں۔ دادی اماں ٹھہریں سدا کی جذباتی۔ ان کی اپنی تو کوئی بیٹی تھی نہیں۔ اس لیے خالدہ کو منہ بولی بیٹی بنا لیا۔ ان کی شادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کچھ عرصے کے بعد میں اس گھر میں بہو بن کے اتری تو استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے یہ خالدہ بی بی ہی تھیں۔ اماں تو خالدہ کی فکر میں ایسے مبتلا رہتی جیسے وہ سگی اولاد ہو۔ میری اس وقت نئی نئی شادی ہوئی تھی مگر میری تو کسی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ہر وقت خالدہ نامہ جاری رہتا۔

اور مجھے تو سخت چڑ ہونے لگی تھی اس خالدہ نامہ سے۔ وہ محترمہ بھی آئے روز تشریف کا ٹوکرا لے آتیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ میرے منہ کے بنتے بگڑتے زاویے دیکھ کر بھی اگلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد تمہارے چاچو کی بھی شادی ہوگئی مگر تب تک خالدہ کے شوہر نے انہیں دو بچوں سمیت اٹلی بلا لیا۔ پھر جان چھوٹی میری اس بلا سے۔'' غزالہ نے تنفر سے کہا۔

''مما۔ ان کے کتنے بچے ہیں؟'' ہما نے سوال کیا۔

''پتا نہیں۔ چار یا پانچ ہوں گے۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ جب پاکستان سے گئی تھیں تب دو بیٹے تھے۔ بعد میں بھی اماں کو فون کر کے اطلاع دیتی تھیں مگر مجھے بھی ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لیے ٹھیک سے نہیں پتا۔'' غزالہ کے کہنے پر ہما سر ہلانے لگی۔

''اچھا ہے کنول صاحبہ کو بھی کچھ کام کرنا پڑے گا۔ محترمہ کے تو نخرے ہی کم نہیں ہوتے ہیں۔'' سیمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو اور کیا۔ تم سے ایک سال چھوٹی ہے۔ مگر تعلیم اور ذہانت میں کتنی پیچھے۔ بمشکل بی۔ اے کیا ہے اس نے۔ پتا نہیں کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس کی ماں تو سب کو یہ ہی بتاتی ہے۔ اب یا تو رسالے لے کر بیٹھی رہتی ہے یا پھر سلائی کڑھائی کرنے چلی جاتی ہے۔ بھلا آج کل کے دور میں ان سب چیزوں پر کون وقت ضائع کرتا ہے۔ جب کہ سب کچھ ریڈی میڈ مل جاتا ہے۔ بس پیسہ پاس ہونا چاہیے۔'' غزالہ نے نخوت سے کہا۔

''مما! یہ پیسہ ہی تو نہیں ہے ان کے پاس۔ نہیں تو آپ چاچی کے نخرے دیکھتیں۔''

حیدر نے اندر آتے ہوئے لقمہ دیا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کسی کی ہنسی اڑانا ہو تو کم ظرف لوگ یہ کام بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے

ہیں۔

"میرا بیٹا تو بہت ذہین ہے سچ میں۔" غزالہ نے فخریہ انداز میں کہا۔ تو حیدر گردن اکڑا کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"اچھا ایسا ہے حیدر کہ پرسوں ایئر پورٹ سے مہمانوں کو ریسو کرنے جانا ہے۔" غزالہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو حیدر کا منہ بن گیا۔

"اف مما! کیا ان ڈیوٹیز کے لیے میں رہ گیا ہوں۔ وہ ٹیکسی کروالیں۔" حیدر نے منہ بنا کر کہا۔

"بیٹا مجبوری ہے۔ خاندان میں اپنی عزت بھی تو بنا کر رکھنی ہے ناں۔ بس انہیں پرانے محلے میں چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔"

"مما! میری اتنی بڑی گاڑی ان چھوٹی سے گلیوں میں کیسے جائے گی؟ آپ بھی حد کرتی ہیں۔" حیدر پرانے محلے میں جانے کا سن کر ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"آرام سے میرے بیٹے۔ بے وقوف۔ جب تم وہاں اپنی نئی اور بڑی سے گاڑی میں جاؤ گے تو خود سوچو کہ تمہارے پرانے دوستوں پر کتنا زبردست امپریشن پڑے گا۔ سب جل جائیں گے تم سے۔" غزالہ کے کہنے پر حیدر کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مما!"

حیدر نے رضامند ہوتے ہوئے کہا تو غزالہ چالاکی سے مسکرا دی۔ پھر وہ چاروں وہاں بیٹھ کر اپنے خاندان کو نیچا دکھانے کی پلاننگ کرنے لگے۔ یہ بھول گئے کہ سب سے بڑا پلانر تو کوئی اور ہے۔ جس کی اعلا شان دار پلاننگ کے ہی معمولی سے مہرے ہیں ہم لوگ۔

☆☆☆

"دادی کی منہ بولی بیٹی!"

کنول نے اچار پراٹھے کا آخری نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ جو رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ سادھی روٹی کھا رہی تھیں۔ صبح سویرے فجر کے وقت دونوں ماں بیٹی اٹھ جاتیں اور نماز قرآن سے فارغ ہو کر ناشتے کی تیاری کرنے لگتیں۔ اکثر کنول ماں کا ہاتھ بٹا دیتی۔ نہیں تو باورچی خانے کی کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر ماں سے سوال جواب کرتے ہوئے، نیم کے درخت پر چہچہاتی چڑیوں کو دیکھتی رہتی۔ اکثر حسرت سے سرد آہ بھر کے رہ جاتی۔ آج بھی پرندوں کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"مجھ سے زیادہ تو یہ پرندے آزاد ہیں۔ میں تو اس چھوٹے سے گھر میں قید ہوں، اپنے ان گنت ادھورے خوابوں کے درمیان۔"

"کیا تمہارے ان گنت خوابوں میں گھر کے کام کاج یا ماں کی خدمت کرنا شامل نہیں ہے؟" عارفہ نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے سوال کیا تو کنول بدمزا ہو کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

"حد ہے امی۔ کیا کبھی کام کاج کے خواب بھی ہوتے ہیں۔ خواب تو آزاد پرندوں جیسے، ان چھوئے سے، خواہشوں کے رنگوں سے سجے ہوتے ہیں۔" کنول نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"اچھا کہیں ان خوابوں میں کسی شہزادے کا گزر تو نہیں۔" عارفہ ٹرے اٹھائے باہر آئیں اور مسکرا کر پوچھنے لگیں۔ کنول کھسیانی ہنسی ہنس پڑی۔

"شہزادے کا تو پتا نہیں۔ ہاں مگر آپ کے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے ضرور ہیں میرے خوابوں میں۔"

کنول نے دیسی گھی میں بنے پراٹھے کی خوشبو پر بے قرار ہوتے ہوئے کہا۔ عارفہ نے ٹرے پلاسٹک کی میز پر رکھی۔ تب ہی ناشتے کے دوران عارفہ نے کل رات آئے غزالہ کے تفصیلی فون کے بارے میں بتایا۔ خالدہ آپا کا نام سن کر کنول چونک گئی۔ عارفہ نے مزید تفصیل بتائی تو وہ حیرت سے سوال کرنے لگی

"ہاں اللہ بخشے تمہاری دادی کو۔ وہ اکثر خالدہ آپا کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ میری شادی کے کچھ

عرصے کے بعد ہی وہ اپنے شوہر کے پاس اٹلی چلی گئی تھیں۔ اس لیے میری ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے مگر تمہاری دادی کے منہ سے تو ہمیشہ ان کی اچھی عادات اور طبیعت کی تعریف ہی سنی ہے مگر اب دیکھو۔ اتنے سال باہر رہ کر آ رہی ہیں رنجانے ان کا مزاج کیسا ہو۔''

عارفہ نے کہتے ہوئے خالی برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی طرف چل پڑیں۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئیں تو ہاتھ میں چائے کے کپ پکڑے ہوئے تھے۔ کنول نے فوراً چائے کا کپ تھام لیا۔

''امی کے ہاتھ کی چائے۔ حق ہا۔ دنیا میں ہی جنت کے مزے۔'' کنول نے شرارت سے کہا تو عارفہ مسکرانے لگیں۔

''چائے تو تم بھی بہت مزے کی بناتی ہو۔ مگر بناتی اپنی مرضی سے ہو۔'' عارفہ نے جواباً کہا۔

''بس ہم نایاب لوگ جو ہیں۔ اس لیے اپنی مرضی کے مالک ہیں۔'' کنول نے شاہانہ انداز میں کہا تو عارفہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''اس گھر کی حد تک تو تم کہہ سکتی ہو مگر باہر کی دنیا میں شاید تمہاری اتنی وقعت نہ ہو۔ اس لیے خود پر ایسے گماں مت کیا کرو۔'' عارفہ نے اداسی سے کہا۔

''امی۔ میرا تجربہ اس سے کچھ الگ ہے۔'' کنول نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہارا تجربہ...... اچھا وہ کیسے؟'' عارفہ نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''امی۔ ہم باہر کی دنیا کے لیے چاہے کتنے ہی قیمتی یا اہم کیوں نہ ہوں مگر ہم مکمل ہمیشہ اپنوں سے ہی ہوتے ہیں۔ ہماری بنائی ہوئی دنیا، باہر کی دنیا سے بہت الگ ہوتی ہے اور ہماری دنیا میں شامل لوگ ہی ہماری اصل قوت، اصل پہچان ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں ان کا ساتھ اور یقین مل جائے تو، باقی سب بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔'' کنول نے سنجیدگی سے کہا تو عارفہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''تم ایسی باتیں کہاں سے سیکھتی ہو؟''

عارفہ کے سوال پر کنول مسکرا دی۔

''کتابوں سے، زندگی سے، وقت سے، حالات سے۔'' کنول کا لہجہ پست ہوا۔ عارفہ کے دل کو کچھ ہوا۔

''مت پڑھا کرو ایسی کتابیں جو ایسی باتیں سکھاتی ہیں۔'' عارفہ نے ڈر کر کہا۔

''نہیں پڑھوں گی۔ مان لوں گی آپ کی بات مگر پھر آپ بھی اس زندگی سے کہیں کہ مجھے کوئی بھی نیا سبق نہ پڑھائے۔ جینے دے مجھے میرے خوابوں کے گیلے اوراق کے ساتھ۔'' کنول کی لہجے کی اداسی عارفہ کے دل کو گھیرنے لگی تھی۔

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ میں نے کبھی تمہارے لیے کوئی کمی تو نہیں چھوڑی۔ پھر......''

عارفہ نے کہا تو کنول اداسی سے مسکرا دی۔ چائے کا خالی کپ پکڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں مانتی ہوں امی۔ مگر جو کی قسمت نے جگہ جگہ لکھ دی ہے۔ اس کا کیا؟''

کنول عارفہ کو سوچوں میں گم چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ عارفہ نے صحن میں پھیلتی دھوپ کو دیکھا۔ دھوپ میں حدت بڑھ چکی تھی اور شاید ان کی زندگی میں بھی......

☆☆☆

''بس کئی سال پردیس میں رہنے کے بعد اب دل گھبرانے لگا ہے۔ ایک عمر گزر گئی ہے۔ ماشاءاللہ اب چاروں بچے اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ ہیں۔ بہت عرصے سے دل کر رہا تھا کہ پاکستان کا چکر لگا کر آؤں مگر وہاں سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔ انہیں فرصت ہی نہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ خاندان میں آگے پیچھے کچھ عزیزوں کے گھر شادیاں ہیں۔ میں نے تو اس بار ضد باندھ لی کہ مجھے ہر حال میں پاکستان جانا ہے۔ بھلے باپ کے مرنے کے بعد میرا میکا ختم ہو گیا ہے مگر باقی رشتے دار تو ہیں۔ بس بھئی میں نے تو کسی کی نہیں سنی اور اپنا مختصر سا سامان باندھا اور چلی آئی۔''

خالدہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا تو غزالہ نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے ان کے سادہ سے حلیے کی طرف دیکھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنے سال باہر کے ملک رہ کر آئی ہیں بلکہ اس کے حلیے سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں کے ہی کسی دوسرے شہر سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔ سامان بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ ایک بڑا سا سوٹ کیس اور ایک بیگ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

''لگتا ہے وہاں جا کر بھی خالدہ آپا کے حالات بہتر نہیں ہوئے ہیں۔'' غزالہ نے ان کے ظاہری حلیے سے اندازہ لگاتے ہوئے سوچا۔

''ویسے خالدہ آنٹی آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی عمرہ کر کے آئی ہیں۔''

حیدر نے بیک مرر سے ان کے اچھی طرح لپیٹے سفید دوپٹے کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا مگر خالدہ اس کے لہجے کا طنز سمجھے بغیر خوش دلی سے ہنس پڑیں۔

''اللہ مبارک کرے تمہاری زبان۔ سچ میں مجھے بہت شوق ہے اللہ کے گھر کی زیارت کا۔ ان شاء اللہ بہت جلد جاؤں گی اپنی بہو کے ساتھ۔'' خالدہ کچھ سوچ کر مسکرا دیں۔

غزالہ نے بے زاری سے سر ہلایا۔ جیسے ہی پرانے محلے میں گاڑی داخل ہوئی خالدہ ماضی کی یادوں میں کھو سی گئیں۔

''اماں کو آخری بار تب دیکھا، جب میں اٹلی جا رہی تھی۔ کتنے سال ہی فون پر رابطہ رہا۔ ایک ماں کی تڑپ اپنی بیٹی کے لیے ان کے لہجے میں بار بار جھلکتی تھی مگر ہائے یہ فاصلوں کے کھیل۔ کتنے پیارے پیارے چہروں کو دوری میں باندھ دیتا ہے۔ یہ تو کوئی پردیسی ہی بتا سکتا ہے کہ میلوں کے فاصلوں کو کتنے بار آنسوؤں کے قطروں میں گنتا ہے۔'' خالدہ نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں۔

''اف! گاڑی کہاں پارک کروں؟ کتنے جاہل لوگ ہیں۔ گاڑی کو ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔''

حیدر کی بڑبڑاہٹ پر خالدہ نے چونک کر شیشے سے باہر نظر ڈالی۔ گلی میں کھیلتے بچے رکے ضرور تھے مگر گاڑی کی تعظیم میں نہیں بلکہ راستہ دینے کے لیے۔

حیدر نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور تیز لہجے میں بولا۔

''مما۔ جلدی کریں۔ میں یہاں زیادہ دیر گاڑی نہیں کھڑی کر سکتا۔ کسی بچے نے کوئی نقصان پہنچا دیا تو......''

حیدر کے کہنے پر غزالہ سر ہلاتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتریں اور گلی میں سے گزرتے دو لڑکوں کو آواز دے کر روکا۔

''غزالہ آنٹی آپ۔'' دونوں انہیں پہچانتے تھے۔

''بیٹا۔ ان آنٹی کا سامان اندر پہنچانے میں مدد کرو۔ شاباش۔'' غزالہ نے تحکم بھرے انداز میں کہا اور بہت انداز سے بیگ کندھے پر ڈالے اونچی ہیل کی ٹک ٹک میں آگے کی طرف بڑھ گئیں۔

دونوں بچے سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ خالدہ آس پاس حسرت سے نگاہ ڈالتے آگے بڑھیں اور کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئیں۔

چھوٹے سے صحن میں غرور سے گردن تانے غزالہ کھڑی بول رہی تھیں۔

''تم بھی کتنی سست ہو عارفہ۔ ابھی تک کام ختم نہیں کیے۔ پتا بھی ہے کہ آج مہمان آ رہے ہیں۔ بندہ کچھ تو خیال کرتا ہے۔''

غزالہ نے عارفہ کو جھاڑو سے کوڑا اکٹھے کرتے ہوئے دیکھا تو منہ بنا کر بولنے لگیں۔ عارفہ نے جلدی سے کوڑا سمیٹا اور صحن میں لگے واش بیسن میں ہاتھ دھو کر فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''غزالہ بھابی۔ آپ فکر مت کریں۔ کاموں سے تو میں صبح ہی فارغ ہو جاتی ہوں۔ دراصل اس

وقت ٹیوشن پڑھ کے بچے واپس جاتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد ایک بار صفائی ضرور کرتی ہوں۔ بچے ہیں ناں۔ چھوٹا موٹا گند ڈال ہی دیتے ہیں۔ آپ کیوں کھڑی کیوں ہیں۔ آپ بیٹھیں میں کچھ ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔''

عارفہ آگے بڑھ کر خالدہ آپا سے گلے ملیں اور پھر صحن میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ خالدہ سارے گھر پر طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں جبکہ غزالہ اسی طرح منہ بناتے ہوئے کھڑی رہیں۔

''میں ایک نظر اوپر بھی دیکھ لوں۔ پتا نہیں ٹھیک سے صفائی کی بھی ہے یا نہیں۔'' غزالہ بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے سڑھیاں چڑھ گئیں۔ اسی وقت بیرونی دروازہ کھلا اور تھکی ہاری، ہلکا گلابی رنگ کا آنچل سر پر اوڑھے کنول اندر داخل ہوئی۔ صحن میں بیٹھی اجنبی خاتون کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ خاتون اپنے چہرے پر سادہ سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کنول کنفیوز سی آگے بڑھی اور سلام کیا۔

''ماشاءاللہ!'' خالدہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا تو کنول نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ!'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔ اس سے پہلے کہ خالدہ جواب دیتیں۔ عارفہ ٹرے اٹھائے چلی آئیں۔

''کنول آگئیں تم۔ ان سے ملو یہ تمہاری خالدہ آنٹی ہیں۔'' عارفہ نے تعارف کروایا تو کنول چونک گئی۔ اس نے حیرت سے سیدھی سادھی معصوم چہرے والی خاتون کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔

''وہ اٹلی والی...... کیا سچ میں......!'' کنول نے حسب عادت سوالیہ انداز میں پوچھا تو عارفہ کو دل چاہا اسے ایک لگا دیں۔

''تمیز سے۔'' عارفہ نے آہستہ آواز میں اسے لتاڑا مگر خالدہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

''بھئی میرے حلیے سے نہیں لگتا نا۔ بس کیا کروں۔ پردیس میں رہ کر بھی اپنے مزاج کی سادگی نہیں گئی۔''

''جی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ یہ مشروب لیں۔''

عارفہ نے کہتے ہوئے گلاس خالدہ کی طرف بڑھایا۔ جس خالدہ نے شکریہ کہہ کر تھام لیا۔ اس وقت غزالہ بھی سڑھیاں اتر کر چلی آئی۔

''اف کتنی گرمی ہے یہاں! اے۔ سی کی سروس کروادی تم نے؟''

غزالہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک سرسری سی نظر کنول پر ڈالی اور اس کے سلام کا جواب بس سر ہلا کر دیا۔

''نہیں۔ اے۔ سی کی سروس تو نہیں ہوئی ابھی۔'' عارفہ نے پریشانی سے کہا۔

''اف او! تمہیں پتا تو ہے کہ خالدہ آپا کے لیے یہاں کی گرمی برداشت کرنا کتنا مشکل ہے۔ کم از کم تم کچھ خیال تو رکھ لیتی۔ اب کیا ہر بات میں ہی بتاؤں گی تمہیں۔ میری طرح تمہاری بھی رشتے داری بنتی ہے ان سے۔'' غزالہ نے حسب معمول عارفہ کو نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ سے نہیں گنوایا۔

''مجھے جب سے جوڑوں کی تکلیف ہوئی ہے۔ اے۔ سی بہت کم استعمال کرتی ہوں۔ تم پریشان مت ہو عارفہ۔ میں آرام سے گزارہ کر لوں گی۔'' خالدہ نے نرم لہجے میں کہا۔

کنول تپے چہرے کے ساتھ قدم اٹھاتی اندر کی طرف چلی گئی۔ غزالہ نے منہ بناتے ہوئے ٹھنڈے شربت کا گلاس اٹھا کر منہ کو لگالیا۔

''عارفہ تم آج بھی شربت گھر میں بناتی ہو۔ حیرت ہے بھئی۔ اتنا فالتو وقت ہے تمہارے پاس۔'' غزالہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ عارفہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"اچھا اسی لیے میں سوچ رہی تھی کہ اس کا ذائقہ اتنا منفرد کیوں ہے۔ عارفہ تم نے مجھے اس کی ترکیب ضرور بتانی ہے۔ کمال کا بنا ہوا ہے۔ پلیز برا مت منانا۔ مجھے ایک گلاس اور دینا۔"

خالدہ نے کہتے ہوئے اپنا خالی گلاس آگے کیا تو عارفہ خوشی سے سر ہلاتے فوراً جگ لے کر آگے ہوئیں۔

"میں اب چلتی ہوں۔ حیدر باہر انتظار کر رہا ہے۔ خالدہ آپا۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے فون کر دیجیے گا۔ پھر ملاقات ہو گی۔" غزالہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔

"خالدہ آپا۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر لیں۔ رات کا کھانا بننے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ ویسے مجھے آپ کی پسند کا اندازہ تو نہیں مگر میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گی کہ کوئی کمی باقی نہ رہ جائے۔"

غزالہ کے جانے کے بعد چھوٹے سے صحن میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ مغرب کی اذان ہونے میں کچھ دیر ہی باقی تھی۔ اپریل کی شامیں ابھی پرسکون تھیں۔ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خالدہ آپا نے چونک کر سر اٹھایا اور عارفہ کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیں۔

"آؤ! میرے پاس بیٹھو۔"

خالدہ نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس رکھی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ عارفہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"اتنے سالوں کے بعد اپنے وطن اور پھر اماں مرحومہ کے آنگن میں آکر باقی سب بھول ہی گیا اگر تم نہ پکارتیں تو پتا نہیں میں ماضی کے جھولے جھولتی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔" خالدہ کہتے ہوئے ہنس پڑیں۔ عارفہ نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

"خیر۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ تم کسی طرح کے تکلفات میں مت پڑنا۔ میرا پاکستان میں قیام تھوڑا طویل ہے۔ اس لیے میں تم پر کسی طرح کا بوجھ [illegible] گی۔" خالدہ آپا نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں مگر دوٹوک انداز میں کہا۔

"مگر......" عارفہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"دیکھو عارفہ! میں وہاں بھی سب کام خود کرتی تھی اور یہاں بھی مجھے اپنے کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ میرے لیے کسی ہوٹل میں رہائش لینا کچھ مشکل نہیں تھا مگر میں پاکستان آکر بھی غیروں کی طرح نہیں رہنا چاہتی تھی مگر کسی کے گھر رہنے کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں انہیں تنگ کروں۔" خالدہ نے سنجیدگی سے کہا تو عارفہ فوراً کہنے لگیں۔

"ارے نہیں آپا۔ بوجھ والی کیا بات ہے۔ مہمان نوازی کرنا تو ہماری روایات میں شامل ہے۔" خالدہ آپا نے ستائش بھری نظروں سے عارفہ کی طرف دیکھا۔

"تمہاری سوچ قابل داد ہے مگر میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔"

خالدہ آپا کا لہجہ دوٹوک تھا۔ عارفہ چپ کر گئیں۔ خالدہ کو کچھ محسوس ہوا تو آگے ہو کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"بہت معذرت، اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہو۔"

"ارے نہیں۔ مگر مجھے خوشی ہوتی اگر آپ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیتیں۔"

عارفہ نے سادگی سے کہا۔ اندر کمرے سے نکلتی کنول نے منہ بنا کر ماں کی طرف دیکھا اور پانی کا گلاس لینے کے لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں ضرور تمہاری خدمات سے فائدہ اٹھاؤں گی مگر کسی اور وقت پر۔ اور ہاں تم بھی مجھے غیر سمجھ کر تکلفات میں نہیں پڑوں گی۔ بولو منظور ہے۔"

خالدہ آپا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو عارفہ نے جلدی سے سر ہلایا۔ جب کہ باورچی خانے کی

کھڑکی سے دیکھتی کنول نے ایک ہاتھ سر پر مارا تھا۔
''اف یہ امی بھی نا۔'' کنول نے پانی پی کر گلاس وہاں ہی پٹخا اور باہر نکل گئی۔ جب خالدہ کی نظر اس پر پڑی۔
''کنول بیٹی۔ یہاں آؤ میرے پاس۔''
''جی آنٹی!''
کنول نے مؤدب انداز میں کہا اور بہت تمیز سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ خالدہ اس سے مختلف سوالات کرنے لگی جن کے جواب کنول بہت اعتماد سے دے رہی تھی۔ عارفہ نے انہیں باتوں میں مصروف دیکھا تو اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔ مسالا بھونتے ہوئے عارفہ نے دیکھا کہ کنول اور خالدہ اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف چلی گئی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کنول کی آمد ہوئی۔
''ان سے پوچھ لینا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' عارفہ نے مصروف سے انداز میں کہا۔
''جی پوچھ لیا ہے۔ بے فکر رہیں۔ بہت خوش ہو رہی تھیں صاف ستھرا کمرا دیکھ کے۔'' کنول کہتے ہوئے سلاد بنانے کے لیے کھیرا اٹھا کر چھیلنے لگی۔
''چلو اچھا ہے۔'' عارفہ نے مطمئن سے انداز میں کہا۔
''ویسے امی۔ تائی امی نے حسب معمول بہت چالاکی سے کام لیا ہے نا۔'' کنول کے کہنے پر عارفہ نے گہری سانس لی۔
''تم چھوڑو انہیں۔ بس خیال رکھنا کہ خالدہ آپا کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ جتنا ہم سے ہو سکے گا ہم ضرور کریں گے۔ ایک اکیلی عورت کا بوجھ ہی کتنا ہو گا۔'' عارفہ نے کہا تو کنول سر ہلانے لگی۔
''ہوں۔ ویسے خالدہ آنٹی بہت اچھی نیچر کی مالک ہیں۔ اتنا پیارا بولتی ہیں۔''
کنول کے کہنے پر عارفہ نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔
''کبھی ماں کی بھی تعریف کر لیا کرو۔''
''ماں اتنا پیارا بھی تو بولے کبھی......'' کنول نے منہ بنا کر کہا تو عارفہ مسکرا کر ہانڈی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور کنول سلاد بنانے لگی۔

☆☆☆

''اف مما۔ کیا خالدہ آنٹی اتنی پینڈو ہیں؟'' ہما اور سیمی نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اتنی کیا بھئی...... اتنی سے بھی زیادہ۔ میں نے تو انہیں مذاق مذاق میں جتا بھی دیا تھا۔'' حیدر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
وہ سب حسب معمول شام کی چائے کے ساتھ بیکری کے مختلف لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ غیبت کے مزے بھی لے رہے تھے۔
''یہ سب چھوڑو۔ تمہیں سب سے مزے کی بات تو بتائی ہی نہیں۔'' غزالہ نے چائے میں بسکٹ ڈبوتے ہوئے کہا۔
''وہ کیا مما؟'' ہما اور سیمی نے ایک ساتھ پوچھا۔
''جب تمہاری عارفہ چاچی کو یہ پتا چلا کہ خالدہ آپا کی ذمہ داری ان پر ہے تو عارفہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ قسم سے بہت مزا آیا مجھے۔ ہمیشہ ہی تو اپنے سلیقے اور طریقے کی دھاک بٹھاتی رہی ہے سب پر۔ اب کرے ناں گزارا اپنے سلیقے اور طریقے سے......اونہہ۔''
غزالہ نے منہ بنا کر کہا تو تینوں بچے ہنسنے لگے۔ وہ اپنی ماں کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بالکل ایک ہی طرح سوچنے اور سمجھنے والے۔
غزالہ نے ساری زندگی بچوں کو خود سے بہت قریب رکھا۔ اس لیے وہ ہر بات اور ہر چیز میں انہیں شریک کرتی تھیں۔ چاہے گھریلو سیاست ہو یا چال بازی کے نئے نئے طریقے۔ غزالہ نے اپنے بچوں کو ان سب میں طاق کر دیا تھا۔

کئی سال پہلے، غزالہ بیاہ کر اندورن شہر میں بنے پانچ مرلے کے دومنزلہ گھر میں آئیں تو وہاں ساس اور سسر کے ساتھ ساتھ چھوٹے دیور کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑی۔ گھر کے کاموں کے علاوہ ان پر جو اضافی ذمہ داری تھی وہ آئے روز کی مہمان داری تھی۔

کیونکہ ساس بہت ملنسار اور خوش مزاج تھیں ان کے اپنے رشتے دار تو بہت کم تھے مگر ان کی دوستیاں اور تعلق داری بہت تھی۔ کسی کو بیٹی بنایا ہوا تھا، کوئی بہن بنی ہوئی تھی، کوئی بھانجی، کوئی کچھ، کوئی کچھ......

غزالہ کا مزاج ساس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اکثر وہ کسی نہ کسی بات کو لے کر گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔ یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا، جب تک کہ دیور کی شادی نہیں ہوگئی۔ دیور کی شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی، ساس کے کہنے پر وہ اوپر والے پورشن میں شفٹ ہوگئیں۔ دراصل یہ خواہش بھی ان کی کئی سالوں سے تھی۔ جس کی خبر گھر کے سب افراد کو ہی تھی۔ علیحدہ پورشن ملتے ہی وہ ہواؤں میں اڑنے لگیں مگر بہت جلد اس کی خوشی کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔ جب انہوں نے نئی آنے والی کا اچھا سلوک اور رویہ ساس اور سسر کے ساتھ دیکھا۔ وہ لوگ بھی نئی بہو کے گن گانے لگے۔ غزالہ حسد کی آگ میں جل بجھیں اور انہوں نے نئی دلہن کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا۔ پہلے پہل اس کے ساتھ ہمدردی کرتیں، میٹھی میٹھی باتیں کر کے عارفہ کا دل بدگمان کرنے کی کوشش کرتیں مگر سامنے والی معصوم ضرور تھیں مگر بے وقوف نہیں۔

وہ غزالہ کی تیز فطرت کو بھانپ گئیں اور کچھ مجازی خدا کی بھی سخت ہدایت تھی کہ غزالہ بھابھی سے دور ہی رہنا۔ عارفہ نے ایک مخصوص فاصلہ اور گریز غزالہ سے اختیار کر لیا۔ جس پر غزالہ کو بہت غصہ آیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کسی طرح بھی ان کی دال نہیں گل رہی تو وہ عارفہ کی مخالفت میں اتر آئیں۔ جب تک ساس سسر زندہ رہے غزالہ کے زیادہ تر حربے ناکام ہی ٹھہرے مگر ان کے انتقال کے بعد غزالہ اپنی خودغرض فطرت کے رنگ بار بار دکھانے لگیں۔

الیاس ان دنوں ایک دکان پر سیلز مین کی نوکری کر رہے تھے۔ غزالہ کے حالات، تین بچوں کے ساتھ بہت مناسب سے تھے بلکہ بامشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔ جبکہ اسلم ایک کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ اچھی تھی۔ ان تینوں کا گزارا بہت اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ عارفہ اور اسلم میں بہت سے عادتیں اچھی تھیں۔ وہ کوئی بھی اچھی چیز یا پھل بانٹے بغیر نہیں کھاتے تھے۔ اسلم اکثر کسی نہ کسی بہانے اپنے بڑے بھائی کی مدد کرتے رہتے۔ اپنی بیٹی کے لیے کوئی چیز لاتے تو بھائی کے تینوں بچوں کو بھی یاد رکھتے۔ عارفہ بھی ہر دوسرے دن کوئی بھی اچھی چیز بنا کر سب سے پہلے اوپر بھیجتیں بلکہ اکثر غزالہ اپنے بچوں کو کھانے کے وقت بہانے سے نیچے بھیج دیتیں۔ اسلم اور عارفہ کے دل کی طرح ان کا دستر خوان بھی وسیع ہی تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔

کنول نے میٹرک کے امتحان دیے تھے جب ایک دن روڈ ایکسیڈنٹ میں اسلم کے انتقال کی خبر ان کے گھر پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اسلم ایک ایسی چھاؤں تھے جس کے نیچے عارفہ کی خوشیاں بھی سانس لیتی تھیں اور کنول کا معصوم دل بھی زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز بس خوشیوں کے ساز پر دھڑکتا تھا۔

مگر پھر وقت نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ عارفہ کے ہونٹ مدتوں مسکرانا بھول گئے۔ وہ دکان کے کرائے اور اسلم کو ملنے والی مخصوص رقم سے گھر کی ضروریات اور کنول کی پرورش کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں لگی رہتیں۔ اس حساب کتاب نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا اور کنول کو بڑی عمر سے پہلے ہی بہت بڑے بڑے تجربے سکھا دیے۔ وہ معصوم اور نازک سی لڑکی اپنے

خول میں سمٹ کر رہ گئی۔

اوپر بسنے والی تایا کی فیملی بہت عجیب تھی جن کی ہمدردی میں بھی طنز کے تیر چھپے ہوتے تھے۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنول اپنی کزنوں سے دور ہوتی گئی۔ ان کا رشتہ بہت سرسری سا رہ گیا۔ الیاس کے دن بدلنے لگے اور ان بدلتے دنوں کے ساتھ ساتھ، ان سب کے رویے بھی بدل گئے۔

بدلتے حالات کا سریا غزالہ کی گردن میں فٹ ہوتا گیا اور وہ دن بہ دن تکبر کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ الیاس کو ملک سے باہر نوکری مل گئی۔ وہ مستقبل کے بہت سے سہانے خواب لیے پردیس کی خاک چھاننے چلے گئے۔ الیاس کے باہر جانے کے بعد پورے گھر پر غزالہ کا کنٹرول بڑھتا گیا۔ عارفہ اپنی صلح جو فطرت کی وجہ سے خاموش رہ کر وقت گزارنا پسند کرتیں۔ جسے ان کی کمزوری سمجھا گیا۔

ہما، سیمی اور کنول ایک ہی کالج جاتی تھیں۔ سیمی کی فطرت میں حسد اور عیاری بہت زیادہ تھی جبکہ ہما کانوں کی کچی اور اندھی تقلید کرنے والوں میں سے تھی۔ ہما اور سیمی، کنول سے بڑی ہونے کے باوجود کم عقل اور بے وقوف تھیں۔ غزالہ نے اپنے تینوں بچوں کو اس طرح ٹرینڈ کیا ہوا تھا کہ وہ ماں سے دور رہ کر بھی ماں کے سکھائے اور بتائے راستے پر ہی چلتے تھے۔

پہلے پہل حیدر کو اپنے سے چند مہینے چھوٹی کنول میں کافی دلچسپی محسوس ہوتی اور وہ مختلف حیلے بہانوں سے اس کے آگے پیچھے رہتا۔ وہ خود کو کسی ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا اور کنول تو تھی ہی پریوں جیسی نازک اور پیاری! جب حیدر کی حرکتیں چھچھورے پن کی حدوں کو چھونے لگیں تو ایک دن کنول نے حیدر کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔ حیدر کو امید نہیں تھی کہ کنول چھوٹی سے بات پر اتنا ہنگامہ کر دے گی۔

ہوا یوں کہ ایک دن حیدر کنول کے لیے سرخ رنگ کا کارڈ جس پر دل اور دل پر تیر کا نشان بنا ہوا تھا اور جہاں تیر لگا وہاں خون کے چند قطرے بھی گر رہے تھے۔ کارڈ کے اندر بہت رومانٹک نظم لکھی ہوئی تھی جو شاید کسی ٹرک یا رکشے کے پیچھے سے کاپی کی گئی تھی۔ ساتھ وہ کنول کو خوش کرنے کے لیے چوڑیاں بھی پیک کر کے لایا تھا۔ دوپہر کا وقت جب سب اپنے اپنے کمروں میں تھے اور کنول صحن میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جب حیدر کو موقع غنیمت لگا اور اس نے کنول کو کارڈ اور چوڑیاں پیش کیں۔

''یہ کیا ہے؟'' کنول نے ایک نظر اٹھا کر سامنے کھڑے حیدر کی طرف دیکھا تھا۔

''کھول کر دیکھ لو۔''

حیدر نے شوخی سے کہا۔ کنول نے گہری سانس لے کر ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کی اور حیدر کے ہاتھ سے چیزیں پکڑ لیں۔ کارڈ کھول کر دیکھنے لگی۔ حیدر خوشی سے دانت نکالتا اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کنول کو کارڈ آرام سے پڑھنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر پہنچ کر حیدر نے مسکراتے ہوئے سر گھما کر دیکھا تو کنول اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

''میری شاعری پڑھ کر اتنی بے تاب ہو گئی ہے؟''

حیدر نے فخریہ سوچا مگر کنول اس کے پاس سے ہوتے ہوئے سیدھا اندر کی طرف بڑھ گئی

''ہیں! یہ کہاں جا رہی ہے؟''

حیدر نے حیرت سے سوچا اور تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ سامنے والے کمرے کے کھلے دروازے سے غزالہ صاف نظر آ رہی تھیں۔ جن کے سامنے اطمینان سے کنول کھڑی تھی۔ حیدر کی نظر غزالہ کے ہاتھ میں موجود کارڈ پر تھی۔ غزالہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیدر کا رنگ اڑ گیا۔ کنول نے تائی کو سوچوں میں گم چھوڑا اور مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ حیدر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ کنول ابھی آدھی سیڑھیوں تک پہنچی تھی جب اس نے شور کی آواز پر

پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ غزالہ ہاتھ میں پکڑے جھاڑو سے حیدر کی پٹائی کرتے ہوئے، اس کے سر سے پہلی پہلی محبت کا جن اتار رہی تھیں۔

"حیدر کے لیے یہ سبق کافی ہے۔"

کنول نے گہری سانس لی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ اس دن کے بعد سے تائی اور ان کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ساتھ، حیدر بھی کنول سے چڑنے لگا تھا۔ کنول کو نیچے دکھانے اور بدلہ لینے کا کوئی بھی موقع وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

☆☆☆

اوپر والے پورشن میں صبح سے شور اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خالدہ آنٹی کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ عارفہ نے میزبان ہونے کا فرض نباہتے ہوئے ٹھنڈے مشروب بنا کر سلیقے سے ٹرے میں رکھ کر اوپر لے گئیں۔ جہاں خالدہ بہت شرمندہ ہوئیں، ان کے سسرال سے آئے لوگوں پر عارفہ کے اچھے اخلاق کی دھاک بیٹھ گئی۔

"عارفہ تم نے کیوں تکلف کیا؟ بچیاں خود ہی کچھ کر لیتیں۔" خالدہ نے نرمی سے کہا۔

"خالدہ آپا۔ اس میں تکلف والی کیا بات ہے۔ مہمان تو اللہ کی خاص رحمت ہوتے ہیں۔" عارفہ نے کہا اور سب کو اپنے ہاتھ کا بنا مشروب پیش کیا۔

"یہ بہت خوش ذائقہ ہے آنٹی۔ کس کمپنی کا ہے؟" فروا نے گلاس ختم کر کے پوچھا تو عارفہ مسکرا دیں۔

"ماشاءاللہ عارفہ بہت سلیقہ مند ہے۔ وہ ہر چیز گھر میں ہی تیار کرتی ہے!"

خالدہ نے فخریہ انداز میں بتایا تو سب حیرت سے عارفہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"او، ریئلی آنٹی؟" فروا نے حیرت سے سوال کیا تو عارفہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسے کہتے ہیں سگھڑاپا!" خالدہ آپا کی جیٹھانی نے تبصرہ کیا۔

"مما! پلیز آپ اب سگھڑاپے اور سلیقے پر لیکچر دینا شروع مت کر دینا۔" فروا نے جلدی سے کہا تو سب ہنس پڑے۔

"میری بیٹی کنول بھی ایسی ہی ہے۔ ماں کی باتوں سے نالاں۔" عارفہ نے کہا۔

"بس بہن! بچیاں ہیں نا۔ اگلے گھر جائیں گی، تب ہی ماں کی باتوں کی قدر آئے گی انہیں۔ ابھی تو نخرے کر لیں۔" خالدہ آپا کی جیٹھانی نے منہ بنا کر کہا تو سب خواتین نے سر ہلا کر تائید کی۔

"آنٹی آپ کی بیٹی کہاں ہے؟" فروا نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ گھر پہ نہیں ہے۔ کچھ دیر تک آئے گی۔"

عارفہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ عارفہ نیچے آ کر اپنے کام نمٹاتے ہوئے دوپہر کے کھانے کا سوچنے لگیں۔ اور جلدی جلدی ہاتھ چلا کر اپنے کام ختم کیے اور پھر چادر اوڑھ کر، چھوٹا بٹوہ ہاتھ میں پکڑے گھر سے نکل گئیں۔

☆☆☆

"امی! جلدی سے پانی پلائیں۔ بہت گرمی ہے آج تو......" کنول نے صحن میں آ کر کروشیے کی بنی چادر اتار کر کرسی پر پھینکی جب اس کی نظر سامنے کھڑے انجان چہروں پر پڑی۔ کنول ایک دم ڈر گئی۔

"آپ کون؟ امی کہاں ہیں؟" کنول نے پریشانی سے انجان چہروں کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم خالدہ آنٹی کے مہمان ہیں۔ آپ عارفہ آنٹی کی بیٹی ہیں؟" فروا نے اشتیاق سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ تو بہت پیاری ہیں۔"

فروا نے کہا تو اس کے ساتھ کھڑی باقی دونوں لڑکیوں نے بھی سر ہلایا۔ کنول جھینپ کر مسکرانے لگی۔ اس وقت کھلے دروازے سے تھکی ہاری عارفہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز

دیکھ کر فروا اور کنول ساری بات سمجھ گئے۔

''آنٹی۔ میں نہاری اور نان دینے آئی تھی۔ مما نے خاص خالدہ آنٹی کی پسند پر مشہور جگہ سے منگوائی ہے۔ آپ کھانا کھالیں۔ پھر اوپر ہی آجایئے گا۔ ہم چائے بنا رہے ہیں۔'' فروا نے جلدی سے کہا۔

''مگر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ چائے اور کھانا میں بنا دیتی۔'' عارفہ نے جلدی سے کہا۔

''ارے آنٹی۔ کوئی تکلف نہیں ہے۔ یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ آپ نہاری انجوائے کریں۔ اوکے کنول۔ پھر ملتے ہیں۔ اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔'' فروا نے بے تکلفی سے کنول سے ہاتھ ملایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

خالدہ نے اپنی جیٹھانی کے دونوں لڑکوں کو بھیج کر اوپر والے کچن کے لیے چائے کا سامان منگوالیا تھا تاکہ وقت بہ وقت چائے، ناشتا بنا سکیں اور عارفہ کو بار بار زحمت نہ دینی پڑے۔ کچھ دیر کے بعد عارفہ اور کنول بھی اوپر چلی گئیں۔ چائے بہت خوش گوار ماحول اور ہنسی مذاق کے درمیاں پی گئی۔ عارفہ اور کنول نے اتنے عرصے کے بعد اتنا پرسکون ماحول اور خوشی دیکھی تھی۔

''کیا تم مجھے ایسی شرٹ بنا کر دے سکتی ہو؟''

فروا کو جب پتا چلا کہ کنول نے کڑھائی والی جو قمیص پہنی ہے وہ خود بنائی ہے تو وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔ فروا سے اس نے مختلف سوالات کیے اور بالآخر فروا نے اپنی پسند کے مطابق قمیص کا ڈیزائن فائنل کر دیا۔

''ایک ہفتے تک بنا دوں گی۔'' کنول نے اعتماد سے کہا۔

''پھر ہم بھی بنوائیں گے۔'' فروا کے ساتھ آئی دونوں لڑکیوں نے جلدی سے کہا تو کنول نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''دیکھو عارفہ۔ اگر کوئی انگلی پکڑائے تو اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم اس کا ہاتھ ہی پکڑ لو۔''

غزالہ کی تیز آواز فون کے اسپیکر سے ہوتی ہوئی پاس بیٹھی کنول کے کانوں کو بھی چھو رہی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کنول سکون سے لیٹی ہاتھ میں پکڑے ڈائجسٹ کی کہانیاں کھنگال رہی تھی۔ جبکہ عارفہ ایک سوٹ کی ترپائی میں مصروف تھیں۔ جب غزالہ کی کال آئی۔

''میں کچھ سمجھی نہیں بھابھی!'' عارفہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''خیر اب تم اتنی بھولی بھی مت بنو کہ میری بات تمہارے سر کے اوپر سے گزر گئی ہے۔'' غزالہ کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

کنول اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عارفہ نے اس کے چہرے کے بگڑے تیور دیکھ کر ہلکے سے رخ موڑا جیسے اس سے چھپانا چاہ رہی ہوں مگر ایک چھوٹے سے کمرے میں کتنا دور تک جا سکتی تھیں۔

''حیدر تین دفعہ تمہارے گھر آیا ہے۔ خالدہ کو کچھ چیزیں بھجوائی تھیں میں نے۔ مگر ہمیشہ یہ ہی سننے کو ملا کہ تم خالدہ کے ساتھ کبھی کہیں گئی ہوئی ہو کبھی کہیں۔ اور کنول! ویسے تو تمہاری بیٹی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی مگر خالدہ کے ساتھ تو ایسے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے کہ جیسے وہ اس کی سگی ہوں۔ اور وہ جو خالدہ کے سسرال سے چھچھوری سی لڑکیاں آتی ہیں، اپنی بیٹی کو ان سے دور ہی رکھو۔ کہاں وہ امیر گھر کی بگڑی ہو شہزادیاں اور کہاں تمہاری بیٹی! ایسا نہ ہو کہ کل کو ان کے رنگ میں رنگ کر تمہیں ناکوں چنے چبوا دے یہ لڑکی۔''

غزالہ کی فراٹے بھرتی زبان کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آکر اسے بریک لگی تھی یہ عارفہ نہیں جانتی تھیں۔ عارفہ کو ساری بات سمجھ آگئی۔ غزالہ کو عارفہ اور کنول کا خالدہ سے گھلنا ملنا پسند نہیں آیا تھا۔

''غزالہ بھابھی! آپ فکر مت کریں۔ میری بیٹی کو اچھے برے کی پہچان ہے۔ وہ اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلاتی ہے اور جہاں تک بات ہے خالدہ آپا کی تو آپ ہی انھیں مہمان بنا کر یہاں لے کر آئی

تھیں۔ اب آپ نہ سہی مگر مجھے تو ان کی مہمان داری کا خیال رکھنا ہی ہے نا۔'' عارفہ کے ٹھنڈے لہجے نے غزالہ کو آگ لگادی تھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری بیٹی۔ اور ہاں میں نے ایسے ویسے لوگوں کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے کہ ان کی خدمت گزاریوں میں اپنا وقت ضائع کرتی پھروں۔ ساری زندگی کے بعد اب کہیں جاکر سسرال کے جھمیلوں سے جان چھٹی ہے۔ تم کرو خالدہ آپا کی خدمتیں اور جو لعل موتی ملتے ہیں وہ سنبھال کر اپنی بیٹی کے لیے رکھ لینا۔ جہیز دینے میں کام آئیں گے۔ اونہہ۔ جس عورت کے پاس خود مہنگا کپڑا پہننے کی توفیق نہ ہو وہ تمہیں کیا دے گی؟'' غزالہ نے کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

عارفہ نے گہری سانس لے کر فون کا ریسور رکھا۔ کنول کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ عارفہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''کنول! تم ان کی باتوں پر دل چھوٹا مت کرو۔ بس غصے میں کہہ گئیں اور......''

''ہوں، امی۔ کس کی بات کر رہی ہیں؟''

کنول ایک دم چونکی اور ماں کے پریشان چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہاری تائی کی۔ کیا تم ان کی باتوں پر پریشان نہیں ہو؟'' عارفہ نے حیرت سے سوال کیا تو کنول نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔

''پھر اتنی گم صم سی کیوں بیٹھی ہوئی تھیں؟'' عارفہ نے چڑ کر پوچھا۔

کنول تھوڑا پیچھے ہٹی اور بیڈ سے ٹیک لگا کر اوندھا رکھا ڈائجسٹ اٹھایا۔

''امی۔ اس فون کا ایک کنکشن اوپر بھی ہے۔ ایکسٹینشن!'' کنول نے کہا

''ہاں تو!'' عارفہ نے ناسمجھی سے پوچھا

''امی۔ خالدہ آنٹی نے سب سن لیا ہوگا۔'' کنول نے اطمینان سے کہا تو عارفہ اپنی جگہ سے اچھل پڑیں۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' عارفہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہر روز اس وقت خالدہ آنٹی کے بیٹے کا فون آتا ہے۔ جو موبائل سروس خراب ہونے کی وجہ سے لینڈ لائن پر فون کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خالدہ آنٹی نے آپ دونوں کی گفتگو ضرور سنی ہوگی۔'' کنول نے اطمینان سے کہا اور ڈائجسٹ منہ کے آگے کرلیا۔ عارفہ پرسوچ انداز میں اسے دیکھتی رہیں۔

''اگر یہ سچ ہے تو بہت ہی غلط ہوا ہے۔'' عارفہ نے افسوس بھرے انداز میں خود کلامی کی۔ کنول کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کتنی بار تم دونوں سے کہا ہے کہ خالدہ آپا سے ملنے چلی جاؤ مگر تم دونوں کچھ سنتی ہی نہیں ہو! اس کنول کو دیکھو کیسے نمبر بنا رہی ہے۔'' غزالہ نے فون بند کر کے پاس بیٹھی دونوں بیٹیوں پر چڑھائی کی تھی۔

''مما! آپ خود تو ہمیں ساتھ لے کر نہیں جاتی ہیں۔'' ہما نے کہا تو غزالہ اسے گھورنے لگیں۔

''ہما ٹھیک کہہ رہی ہے اور ویسے بھی ہم نے ان سے مل کر کیا کرنا ہے۔'' سیمی نے منہ بنا کر کہا تو غزالہ نے گہرا سانس لیا۔

''کرنا تو کچھ نہیں مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہارے باپ تک یہ خبر پہنچے کہ کنول اور عارفہ نے ان کی بہت خدمت کی ہے اور تم دونوں انہیں سلام کرنے بھی نہیں گئیں۔'' غزالہ نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

''وہ کوئی دربار لگائے بیٹھی ہیں جہاں ہم نے سلام کرنے جانا ہے۔'' سیمی نے مذاق اڑایا

''بکومت۔ میں پرسوں خالدہ آپا کو دعوت پر بلا رہی ہوں!'' غزالہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر صرف خالدہ آنٹی کو۔'' سیمی نے تیزی سے کہا۔

''ہمم......ٹھیک ہے۔'' تینوں ماں بیٹیاں سر جوڑ کر دعوت کی تیاری پر بحث کرنے لگیں۔

☆☆☆

''کیا ہوا خالدہ آپا۔ خاموش کیوں ہیں؟''

عارفہ ٹیوشن والے بچوں کو اندر کمرے میں بٹھا کر واپس آئیں تو صحن میں کرسی پر گم صم بیٹھے ہوئے خالدہ آپا کو دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ جو ہلکے آسمانی رنگ کے چکن کے جوڑے میں تیار بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

خالدہ آپا نے گہری سانس لے کر مہربان چہرے والی عارفہ کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔ بچوں کی یاد آرہی تھی۔ چھوٹا والا تو میرے بغیر رہتا ہی نہیں۔ اب اتنے دن ہوگئے ایک دوسرے سے دور۔'' خالدہ آپا نے اداسی سے کہا۔

''ارے دل چھوٹا مت کریں۔'' عارفہ نے ہمدردی سے کہتے ہوئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو خالدہ آپا نے نرمی سے تھام کر سر ہلایا۔

''احمد ابھی آیا نہیں۔'' عارفہ نے خالدہ آپا کے نند کے بیٹے کا نام لیا جو اکثر پک اینڈ ڈراپ دینے آ جاتا تھا۔

''ہاں بس پہنچنے والا ہے۔'' خالدہ آپا نے آہستگی سے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے عارفہ۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ میں دعوت پر جاؤں اور تم......'' خالدہ آپا کہتے کہتے چپ کر گئیں۔

''اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مہمان آپ ہیں۔ ہم تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ وقت میرے ٹیوشن والے بچوں کا ہوتا ہے۔ میرا گھر سے نکلنا ممکن ہی نہیں۔'' عارفہ نے نرمی سے کہا۔

''یوں کہو کہ غزالہ کو غریب دیورانی سے ملنا پسند نہیں ہے۔'' خالدہ آپا نے سنجیدگی سے کہا تو عارفہ نے سر جھکا لیا۔

''تم اداس مت ہو عارفہ۔ کمی اچھے اخلاق والوں میں نہیں ہوتی ہے، اللہ سب کو ہدایت دے۔ آمین۔''

خالدہ آپا احمد کو دیکھ کر کھڑی ہوگئیں اور خدا حافظ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئیں۔ عارفہ گہری سانس لے کر اندر کی طرف مڑ گئیں۔

''شکر ہے کہ کنول اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ نہیں تو اسے بہت برا لگتا۔ بہت احساس ہے میری بچی!''

عارفہ نے خود کلامی کی تھی اور وہ حساس بچی واپس آتے ہوئے گھر سامنے کھڑی گاڑی میں بیٹھیں خالدہ آپا سے مل چکی تھی۔ خالدہ آپا نے اسے غزالہ کے گھر دعوت پر جانے کا بتایا تو کنول کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی مگر اس نے گھر میں داخل ہو کر اس بارے میں اپنے ماں سے کوئی بات نہیں کی کہ خاموشی دوسروں کا ہی نہیں، آپ کا اپنا بھرم بھی رکھتی ہے۔

☆☆☆

''یہ تحفہ لائی ہیں خالدہ آنٹی آپ کے لیے؟''

سیمی اور ہما سامنے رکھی چیزوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ایک گرم سوئٹر کے ساتھ پرفیوم اور باڈی مساج کا ایک پیک تھا۔

''سدا کی کنجوس ہیں خالدہ آپا!'' غزالہ نے منہ بنا کر کہا تو سیمی اور ہما ہنستے ہنستے ہوئے دہری ہوگئیں۔

''حد ہے مما۔ کیا یہ سچ میں اٹلی سے آئی ہیں۔'' سیمی نے ماں کا مذاق اڑاتے ہوئے پرفیوم کھول کر دیکھنے لگی۔

''کتنی خوب صورت بوتل ہے اس کی۔'' ہما نے ہمیشہ کی طرح چیز کے ظاہر سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''جاہل۔ خوب صورت بوتل کا اچار ڈالنا ہے۔ دفع کرو اسے۔ خالدہ آپا کو واپس کر دوں گی۔'' غزالہ نے چڑ کر کہا۔ سیمی اور ہما کے ساتھ ساتھ حیدر بھی ہنس رہا تھا۔

''ایسے ہی آپ نے انہیں دعوت پر بلایا۔'' ہما نے کہا تو غزالہ بھی منہ بنانے لگیں۔

''دعوت پر تو بلانا ہی تھا۔ تمہارے باپ کا حکم ہوتھا۔ خیر میں نے کون سا بہت اہتمام کیا ہوا تھا۔ ایک سالن اور چاول۔ بہت ہے ان کے لیے۔'' غزالہ نے نخوت سے کہا۔

''اور آپ نے عارفہ چچی اور کنول کو بھی نہیں بلایا'' حیدر نے موبائل پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا تو غزالہ نے اسے سخت تیوروں سے گھورا۔

''تمہیں بڑی فکر ہے ان کی؟'' حیدر کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

''میں نے تو ویسے ہی کہا۔'' حیدر نے اپنی جگہ سے اٹھنے میں بہتری سمجھی۔

''اونہہ! وہ ماں بیٹی تو ہر وقت خالدہ آپا کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ خالدہ آپا کے ساتھ شاپنگ کرنے سے لے کر ان کے سسرال کے ہر کام میں دونوں ماں بیٹی شامل ہوتی ہیں۔'' غزالہ نے حسد سے کہا۔

''اوہو۔ چھوڑیں بھی مما! نمبر بنانے دیں انہیں۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔'' ہما نے کہا

''تم تو سدا کی بے وقوف ہو ہما! آنٹی خالدہ کے ساتھ جو لڑکا آیا تھا۔ الیکٹریکل انجینئر ہے۔ ایویں نہیں عارفہ چچی اور کنول ان کے آگے پیچھے ہوتیں۔'' سیمی نے اپنی آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے کہا تو غزالہ چونک گئیں۔

''اوہو ہاں۔ جن کے پاس پیسہ نہیں ہوتا، وہ ایسے ہی خدمت اور مروت کے جال بچھا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں!'' غزالہ نے تنفر سے کہا۔

''اور کیا! عارفہ چچی کی بھی کوشش ہوگی کہ کنول کے لیے ایسے ہی بیٹھے بٹھائے اچھا سا رشتہ مل جائے۔''

سیمی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ہما حیرت سے سن رہی تھی۔

''اف کتنی تیز ہیں عارفہ چچی۔'' ہما نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''اور تم دونوں اول درجے کی احمق۔ کہا بھی تھا کہ خالہ آپا کے آگے پیچھے رہو۔ خیر۔ ابھی بھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کرتی ہوں کچھ۔ کنول تم دونوں سے چھوٹی ہے۔ اب اس کی شادی پہلے ہو جائے تو میرے لیے بہت شرمندگی کی بات ہو گی۔'' غزالہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مما! آج کیا آرڈر کرنا ہے؟ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' حیدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اف ایک تو اس کی بھوک۔'' سیمی نے چڑ کر بھائی کی طرف دیکھا مگر ماں کی گھوری پر فوراً چپ کر گئی۔

''میں تو آج کباب اور تکے کھاؤں گی۔'' ہما نے جلدی سے کہا۔

''باربی کیو کا موڈ ہے تو ایسا بولیں۔ کباب تکے کیا پینڈو لگتا ہے۔''

حیدر نے منہ بنا کر طنز کا تیر چلایا تو سیمی ہنس پڑی جبکہ ہما کھسیانی ہو کر رہ گئی۔ دراصل پیسے نے رنگ ڈھنگ بدل ضرور دیے تھے مگر وہ جو اصل تھا وہ شرارتی بچے کی طرح بار بار کسی نہ کسی کونے سے نکل کر ''جھانک'' ضرور کرتا تھا۔

☆☆☆

کنول نے فروا کو جو قمیص بنا کر دی۔ وہ اسے بہت پسند آئی۔ اس کی قمیص دیکھ کر خاندان اور ملنے جلنے والی کئی خواتین اور لڑکیوں نے کنول کا پتا پوچھا۔ اس طرح کچھ دنوں میں ہی کنول کو اچھا خاصا کام مل گیا۔ کنول خوش تھی کہ پہلی بار اسے بہت اچھی رقم مل رہی ہے۔ وہ دن رات لگا کر کام کرنے لگی۔ ہر ایک کی ڈیمانڈ کے مطابق کپڑے پر جدید انداز میں ہلکی کڑھائی والے قمیص سلائی سمیت بنا کر دینے لگی۔ کنول ان دنوں اتنی مصروف تھی کہ اپنے آس پاس سے قطعی لاتعلق ہو کر رہ گئی تھی۔ اکثر تو عارفہ بھی گھبرا کر اسے ڈانٹ دیتیں۔

''تمہیں کس نے کہا تھا اتنے آرڈر ایک ساتھ

لینے کو۔ ابھی ہمیں پیسے کی کیا ضرورت تھی؟"
"ابھی نہیں مگر کل تو ہو بھی سکتی ہے۔ میں اپنی بوتیک بنانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے بہت سارے پیسے چاہئیں۔" کنول نے کہا
"بوتیک سے پہلے میں تمہاری شادی کرنا چاہوں گی۔" عارفہ نے منہ بنا کر کہا۔
خالدہ آپا ایک ہفتے سے اپنے سسرال رہنے گئی ہوئی تھیں اس لیے بھی عارفہ کو خالی خالی پن لگ رہا تھا۔
"اور صاف بات ہے کہ میں اپنے جہیز کے لیے رقم نہیں دوں گی۔" کنول نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا تھا۔
"چلو کوئی بات نہیں۔ میں کون سا تمہیں جہیز دے کر رخصت کروں گی۔" عارفہ نے اطمینان سے کہا تو کنول نے آنکھیں پھاڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔
"امی۔ کہانیوں میں ایسا تو نہیں ہوتا۔ عموماً غریب گھروں میں بیٹی کی شادی ہی مسئلہ ہوتی ہے۔" کنول نے ماں کو یاد دلایا۔
"بیٹا جی! میں کہانی میں نہیں، حقیقت میں سانس لیتی ہوں۔" عارفہ نے لاپروائی سے کہا۔
"پھر تو حقیقت زیادہ تلخ ہے۔" کنول اداسی سے مسکرائی۔
"اگر رب مہربان ہو تو حقیقت سے زیادہ خوب صورت بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یقین رکھو۔"
عارفہ نے مسکرا کر کہا تو کنول ماں کے چہرے کو پرسوچ انداز میں دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

"ایک اور مصیبت۔" غزالہ نے بڑبڑاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور پرانے محلے پر نخوت سے نگاہ ڈالی۔ دوسری طرف سے دروازہ کھول کر ہما اور سیمی بھی نیچے اتر گئیں۔ حیدر گاڑی کو تھوڑا آگے لے گیا تاکہ مناسب اور محفوظ جگہ پر پارک کر سکے۔
"اف میرا دو ہزار کا جوتا۔" سیمی نے نزاکت سے کہا اور ایسے چلنے لگی جیسے جوتا زمین پر رکھ کر بہت احسان کر رہی ہو۔
"عجیب چھچھورے لوگ ہیں گلی کے۔ کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔" ہما نے جلدی سے کھلے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا اور اپنے اسکاف کو سیٹ کرنے لگی جس میں سے بالوں کی کئی لٹیں ویسے ہی باہر لٹک رہی تھیں۔
عارفہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ کہہ ہی دیں کہ ہما بی بی۔ اسی محلے میں پلی بڑھی ہو، ابھی یہاں سے گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اور آج یہاں کا ماحول عجیب و غریب لگ رہا ہے۔"
مگر عارفہ نے خاموشی سے راستہ دینا بہتر سمجھا۔ غزالہ کی بڑبڑاہٹ اندر آ کر بھی جاری تھی۔
"بھلا، خالدہ آپا کو کیا ضرورت تھی بارش میں گھر سے باہر جانے کی۔ سڑک پر سلپ ہو کر چوٹ لگوا لی ہے۔ میں تو شکر ادا کر رہی تھی کہ ان کے واپس جانے میں تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں مگر اب تو مشکل ہی لگ رہا ہے۔" غزالہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔
صبح خالدہ آپا اور عارفہ شاپنگ کرنے قریبی بازار گئی تھیں جہاں رات ہونے والی بارش کی وجہ سے پانی کھڑا تھا اور خالدہ آپا بے دھیانی میں سلپ ہو گئی تھیں۔ ان کی کمر اور دائیں ٹانگ میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔
"بس بھابھی۔ جو قسمت میں لکھا ہو۔ وہ ہو کر رہتا ہے۔" عارفہ نے سنجیدگی سے کہا۔
"اپنی بے وقوفیوں کو قسمت کا نام دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔" غزالہ نے چڑ کر کہا۔
کنول جو بے خیالی میں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ صحن میں ان سب کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ اس وقت ہی حیدر پھلوں کے شاپر پکڑ کر اندر داخل ہوا۔
"تم اچھی خدمتیں کر رہی ہو بڑی بی بی کی۔

کون سا خزانہ اپنے نام کروانا ہے بھئی۔" غزالہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"دعاؤں کا۔" کنول نے اطمینان سے جواب دیا اور ان کے پاس سے گزر کر اندر کی طرف چلی گئی۔ ہما اور سیمی کے منہ بن گئے۔

"اونہہ! نخرہ تو دیکھو اس کا۔" سیمی بڑبڑائی اور ہما کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے غزالہ اور حیدر بھی تھے۔

"خالدہ آپا نیچے والے کمرے میں ہیں۔" عارفہ کی آواز پر وہ سب رکے اور مڑ کر دیکھا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟" غزالہ نے تیکھے انداز میں کہا اور تیزی سے عارفہ کے پاس سے ہو کر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

عارفہ گہری سانس لے کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں کہ جیٹھانی کی خاطر مدارت بھی کرنی تھی۔ کنول جو خالدہ آپا کو دوائی کھلا رہی تھی، ان سب کو اندر آتا دیکھ کر اپنا کام مکمل کر کے خاموشی سے باہر نکل گئی۔

غزالہ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائے خالدہ آپا کا حال احوال پوچھنے لگیں۔ خالدہ آپا کو اپنی تکلیف سے زیادہ فکر عارفہ اور کنول کے بے آرام ہونے کی تھی۔ وہ ہر بات میں ان دونوں کی تعریف کرتیں جس پر غزالہ اور اس کے تینوں بچوں کے منہ بن جاتے۔

"آج کے دور میں ایسے سچے دل کہاں ملتے ہیں۔"

خالدہ آپا نے عارفہ اور کنول کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو غزالہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"خیر خالدہ آپا! آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہیں۔ ہم نے بھی کئی سال یہاں گزارے ہیں۔ ایسے خالص دل ہمیں تو نظر نہیں آئے۔" غزالہ نے تیکھے انداز میں کہا تو خالدہ آپا دھیرے سے مسکرا دیں۔

"ہیرے کی پہچان جوہری ہی کر سکتا ہے غزالہ۔ خیر سب چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ الیاس کب پاکستان آئے گا؟" خالدہ آپا نے موضوع تبدیل کر دیا۔

"پاکستان آ کر کیا کرنا ہے خالدہ آپا! ابھی تو کمانے دیں، اتنے خرچے ہیں۔ بچوں کی تعلیم، ان شادیاں کرنا۔ ابھی تو وقت آیا ہے میرے بچوں کا۔ بہت تنگی اور تکلیف دیکھی ہے انھوں نے۔ آج دیکھیں۔ میرے بچوں کو ان کے صبر کا پھل ملا ہے۔ مہنگی گاڑی، اچھا گھر، برانڈڈ کپڑے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے ہمیں۔" غزالہ نے فخریہ انداز میں کہا۔

"ماشاء اللہ۔ اللہ ایسا ہی کرم رکھے۔" بیڈ پر لیٹے ہوئے ان کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات واضح تھے۔

غزالہ جو انہیں ہر حال میں متاثر کرنا چاہتی تھیں، ابھی بھی ان کی تکلیف سے زیادہ فکر اسے اپنی شان و شوکت بیان کرنے کی تھی۔

کچھ دیر کے بعد عارفہ اور کنول چائے کے لوازمات کی ٹرے اٹھائے آگے پیچھے اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہ جو میری ہما نے شرٹ پہنی ہے نا۔ یہ مشہور برانڈ کی ہے۔ ہما کتنے میں لی تھی آپ نے؟"

غزالہ نے ان دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مما! فائف تھاؤزنڈ کی۔" ہما نے ایک ادا سے مخصوص لاہوری لہجے میں کہا تو خالدہ آپا کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی جسے انہوں نے فوراً چھپا لیا۔ کنول نے میز پر ٹرے رکھی۔

عارفہ نے ٹرے رکھتے ہوئے حیرت سے ہما کی قمیص کی طرف دیکھا۔

"ہما۔ یہ پانچ ہزار کی ہے؟ اس سے اچھی تو میں اتوار بازار سے کنول کی لائی ہوں۔ جس پر اتنی خوب صورت کڑھائی ہوئی ہے۔" عارفہ کے کہنے پر کنول کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"عارفہ تم بھی معصوم ہو۔ بھلا مشہور برانڈ کا

تمہارے اتوار بازار سے کیا مقابلہ۔'' غزالہ نے ہنسی اڑاتے ہوئے کہا تو وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کنول منہ بنا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جیسے شیمی اور ہما نے اپنی فتح سمجھا۔ کنول غصے میں دھپ دھپ پاؤں مارے سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔

''امی بھی ناں۔ اپنی سادگی میں ہمیشہ ہی شرمندہ کر دیتی ہیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ ان کے مشہور برانڈ سے اچھی میری قمیص ہے۔ یہ باتیں بھی کوئی کہنے والی ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں تو......''

کنول کی نظر سامنے پڑی اور وہ ایک دم چپ کر گئی۔ کھلے مین دروازے سے ایک انجان شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس سے پہلے وہ شخص کچھ کہتا اس نے پھولوں کا گملا اٹھا کر اس شخص کی طرف پھینک دیا جو اس شخص کے ماتھے پر لگا اور وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

کنول کو موقع غنیمت لگا اور وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اندر والے کمرے کی طرف بڑھی مگر اس شخص کے پاس سے گزرتے ہوئے، بے ساختہ رک گئی۔ کنول نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا

اس کا نازک ہاتھ اس انجان شخص کے مضبوط او رسخت ہاتھ میں قید تھا۔ وہ شخص خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

''اس ڈرون حملہ کی وجہ پوچھ سکتا ہوں محترمہ!'' اس شخص کا لہجہ سخت تھا۔ کنول کو غصہ آ گیا۔

''اگر تم مجھے کمزور سمجھ رہے ہو تو یہ بھول ہے تمہاری۔ ابھی شور مچا کر سب گھر والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔'' کنول نے دبنگ انداز میں کہا۔

''ایک سیکنڈ میں حملہ کرنے والی خوں خوار لڑکی کو کون کمزور سمجھ سکتا ہے؟ بتاؤ مجھ پر حملہ کیوں کیا؟'' انجان شخص کافی ضدی معلوم ہو رہا تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔ نہیں تو.....'' کنول نے غصے سے کہا اور اپنے دوسرے ہاتھ کے ناخن اس کی کلائی میں چبھو دیے۔

''جنگلی بلی۔'' اس شخص نے کہتے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیا۔ کنول تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔

''امی دیکھیں۔ ہمارے گھر میں کون گھس گیا ہے۔''

کنول نے شور مچایا تو عارفہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اٹھ کر باہر کی طرف لپکے۔

''کون ہے یہ؟''

غزالہ نے حیرت سے سامنے کھڑے چھ فٹ کے لمبے چوڑے وجیہہ لڑکے کو دیکھا۔ جس کی بڑی بڑی آنکھوں کا رنگ لائٹ براؤن تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی شیو کے ساتھ چہرے پر تھکن واضح تھی۔ نیلی جینز پر اور شرٹ کے ساتھ وہ رف حلیے میں بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''میں عمیر ہوں۔'' سامنے کھڑے شخص نے اتنی سوالیہ نگاہوں کو خود پر مرکوز دیکھا تو آگے بڑھ کر اعتماد سے بولا۔

''خالدہ آپا کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا!'' عارفہ نے جلدی سے کہا تو عمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آؤ بیٹا۔ تمہاری ماں اس کمرے میں ہیں۔'' عارفہ نے عمیر کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے اندر لے گئیں۔ غزالہ کو ایک شادی میں جانا تھا اس لیے وہ سب مزید وہاں نہ رک سکے مگر دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

☆☆☆

عمیر کی اچانک آمد نے جہاں باقی سب کو حیران و پریشان کر دیا تھا وہاں ہی خالدہ آپا بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ عمیر کو گلے لگا کر کتنی ہی دیر روتی رہیں۔

''اف اماں۔ اب بس بھی کریں۔ اتنی ہی مجھ سے محبت ہے تو جلدی واپس کیوں نہیں آ گئیں۔ روز فون پر منتیں کرتا تھا، قسمیں دیتا تھا مگر آپ کو تو یہاں کسی نے قید ہی کر لیا تھا۔'' عمیر نے منہ بنا کر کہا اور ماں کے آنسوؤں سے گیلے چہرے کو نرمی سے ٹشو سے

صاف کرنے لگا۔خالدہ آپا محبت سے مسکرادیں۔

''اور تمہیں میری اتنی ہی پروا تھی تو پہلے کیوں نہیں آگئے۔میں بھی روز کہتی تھی کہ ایک بار پاکستان آکر تو دیکھو۔''

خالدہ آپا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آتو گیا ہوں آپ کے پاکستان۔اف کتنی مشکل سے گھر ڈھونڈا ہے مت پوچھیں۔''

عمیر کہتے ہوئے تھکے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔اس نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔عارفہ پہلے ہی دونوں ماں بیٹے کو چھوڑ کر کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔

''کیوں کیا کوہ قاف میں واقع ہے ہمارا ملک؟'' کنول نے جوس کا گلاس سائیڈ میز پر رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو عمیر نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ملک کا تو پتا نہیں مگر آپ ضرور کوہ قاف کی کوئی چڑیل لگتی ہیں۔'' عمیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''جی اور آپ دوسرے دیس کے گمشدہ جن۔جو غلطی سے اس طرف آنکلا ہے۔'' کنول نے منہ بنا کر کہا۔تو خالدہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''تم دونوں پہلی ملاقات میں ہی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہو۔'' خالدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ کا بیٹا ہی ایسا ہے۔خیر آپ کو کچھ چاہیے ہوا تو آواز دے لیجیے گا۔'' کنول نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑ گئی۔

''اور اگر مجھے کچھ چاہیے ہوا تو؟'' عمیر نے شرارت سے کہا۔کنول رکی اور مڑ کر تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''تو خود زحمت کر لیجیے گا۔'' کنول نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کیوں تنگ کر رہے تھے بچی کو؟'' خالدہ نے پیار سے بیٹا کو چپت لگائی۔

''اور جو آپ نے مجھے تنگ کیا؟'' عمیر نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''وہ کیسے؟'' خالدہ نے معصومیت سے سوال کیا۔

''ایک تو دو مہینے سے آپ سے دور رہ رہا تھا اور آپ ہر روز فون پر مجھے پاکستان آنے کا لالچ دیتیں۔کبھی کہتی یہاں یہ کھانے کو ملتا ہے۔کبھی کہتیں یہاں کا موسم بہت اچھا ہے۔کبھی کچھ کبھی کچھ......

جب آپ نے دیکھا کہ آپ کا ذہین اور سمجھ دار بیٹا ایسے قابو نہیں آئے گا تو پھر آخری بلیک میلنگ کے طور پر آپ نے روتے ہوئے فون پر اپنی تکلیف کے بارے میں جس طرح بتایا تو مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہر چیز چھوڑ کر فوراً پاکستان جانے والی پہلی دستیاب فلائٹ کی ٹکٹ لی۔شکر ہے کہ آپ نے یہاں کا ایڈریس پہلے ہی مجھے لکھوایا ہوا تھا۔

ویسے اماں۔اتنی خواری اٹلی سے آنے میں نہیں ہوئی جتنی ایئر پورٹ سے یہاں تک آنے میں ہوئی ہے۔اف۔آپ دو مہینے سے اس جگہ رہ رہی تھیں۔''

عمیر نے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو چائے کے ٹرے اٹھائے اندر آتی کنول کا منہ بن گیا۔

''کیوں؟اس جگہ میں کیا مسئلہ ہے؟ویسے بھی اٹلی سے آنے والے اکثر لوگوں سے زیادہ تمیزدار اور شریف لوگ رہتے ہیں یہاں۔'' کنول نے چائے کی ٹرے میز پر پٹختے ہوئے کہا۔عمیر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے گھورنے لگا۔

''جی۔تمیز کا اعلاترین مظاہرہ تو دیکھ چکا ہوں میں۔'' عمیر نے اپنی کلائی میں چبھے ناخنوں کے نشان دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکر کریں۔اسی پر جان چھوٹ گئی۔'' کنول کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''یہ لڑکی ہماری جاسوسی کر رہی ہے۔'' عمیر نے ماں کی طرف جھک کر آہستہ آواز میں کہا تو خالدہ

ہنس پڑیں۔

کچھ دیر کے بعد عارفہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ خالدہ آپا کو کنول اور عمیر کے درمیان ہونی والی غلط فہمی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگیں۔ جو غزالہ فیملی کے جانے کے بعد، چائے بناتے ہوئے کنول نے بتائی تھی۔ خالدہ آپا سن کر ہنسنے لگیں جبکہ عمیر سر جھٹک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھکاوٹ سے اس کا برا حال تھا۔ وہ چائے پی کر آرام کرنا چاہ رہا تھا۔

''عمیر کو کھانے میں کیا پسند ہے؟''

عارفہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو چائے کے لوازمات سے انصاف کرتا عمیر چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے لیے فی الحال یہ ہی بہت ہے آنٹی۔ میں بس لمبی نیند لوں گا۔'' عمیر نے چائے ختم کر کے کپ ٹرے میں رکھا۔

''عارفہ! تم کسی قسم کے تکلف میں مت پڑنا۔ عمیر کی طبیعت میری جیسی ہی ہے سادہ...... تم بے فکر رہو۔''

خالدہ نے نرمی سے کہا تو عارفہ مسکراتے ہوئے ٹرے اٹھا کر باہر آ گئیں۔ کنول باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔ عارفہ نے رات کے کھانے کے بارے میں سوچتے ہوئے کنول کو خالدہ آپا کی باتیں بتائی۔

''ہاں تو کیا ضرورت ہے جنگلی آدمی کے لیے کوئی تکلف کرنے کی...... رہنے دیں۔''

کنول کہتے ہوئے باہر نکل گئی تو عارفہ سر جھٹک کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔ مہمان کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو، ایک اچھے میزبان کو مہمان داری کا ہنر آنا چاہیے۔

☆☆☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ اپنے بستر میں کروٹیں بدلتے کنول مختلف سوچوں میں گم تھی۔ خالدہ آنٹی کی وجہ سے دونوں ماں بیٹی اوپر والا کمرا استعمال کر رہی تھیں۔ اس لیے کنول کو نئی جگہ عجیب سی بے چینی گھیرے رکھتی۔ ابھی بھی تھک ہار کر اس نے ساتھ لیٹی ہوئی ماں کی طرف دیکھا۔

''امی۔ اگر نیند نہیں آ رہی تو باتیں ہی کر لیں۔''

کنول نے کہنی کے بل تھوڑا سا اٹھ کر دیکھا تو گہری سانس لے کر عارفہ نے آنکھیں کھولیں۔

''تم سوئی کیوں نہیں؟'' عارفہ نے پوچھا تو کنول ماں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''ہاں ہاں۔ پتا ہے کہ نئی جگہ ہے اس لیے نیند نہیں آ رہی۔''

عارفہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ کنول جواب دیتی کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

''امی۔ آواز نیچے سے آئی ہے۔'' کنول کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اوہو! کہیں خالدہ آپا کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔ عمیر کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔ چلو دیکھتے ہیں۔''

دونوں ماں بیٹی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور احتیاط سے دروازہ کھول کر، آرام سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچیں۔ صحن میں جلتے واحد بلب کی روشنی میں سامنے کا منظر واضح تھا۔ صحن میں رکھی پرانی کرسی پر وہ آرام سے بیٹھا تھا۔ سامنے رکھی میز پر چاولوں سے بھری پلیٹ پر دہی ڈالے مزے سے کھا رہا تھا۔

''ارے بیٹا۔ بھوک لگی تھی تو مجھے جگا دیتے۔ میں تو تمہارے جاگنے کا انتظار کر کے بارہ بجے سونے کے لیے گئی تھی۔'' عارفہ نے جلدی سے کہا تو عمیر نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''سوری آنٹی! مگر مجھے اس وقت بہت بھوک لگ گئی۔ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''کوئی بات نہیں، ٹھہرو۔ میں شامی کباب بھی تل کر لاتی ہوں۔ چاول کے ساتھ اچھے لگیں گے۔'' عارفہ کہتے ہوئے جھٹ کچن میں گھس گئی۔ کچھ دیر

کے بعد کباب تل کے لے آئیں۔

کنول بھی اسے نظر انداز کرتے ہوئے، صحن میں لگی رات کی رانی سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مصروف رہی۔ کنول نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی۔ اس وقت عمیر نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ عمیر نے ہاتھ سے اپنی پلیٹ کو کور کرتے ہوئے ذرا سا رخ موڑ لیا۔ جیسے اس کی نظروں سے بچنا چاہ رہا ہو۔

"کیا ہوا عمیر!" عارفہ نے پانی کی بوتل میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آنٹی۔ میری اماں کہتی ہیں کہ پیاری شکلوں اور اچھے کھانے کو جلد نظر لگتی ہے۔ اس لیے بچ رہا ہوں۔"

عمیر نے سنجیدگی سے کہا تو عارفہ نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا مگر جب نظر غصے سے دھپ دھپ کر کے سیڑھیاں چڑھتی کنول پر پڑی تو سمجھ کر بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"میری بیٹی کی نیت اور نظر بہت سچی اور سیر ہے، بےفکر رہو۔"

عمیر سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے کھانا ختم کرنے تک عارفہ چائے بنا کر لے آئی۔

"میں سچ میں بہت شرمندہ ہو رہا ہوں آنٹی۔"

عمیر نے دل سے کہا تو عارفہ نے اس کا کندھا تھپتھپا کر وہاں سے چلی گئیں۔ عمیر نے گہری سانس لی تو گہری رات میں پھیلی خوشبو کو محسوس کیا تو سر گھما کر صحن کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ کھڑی تھی اور بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

رات دیر سے سونے کی وجہ سے کنول صبح سویرے نہیں اٹھی۔ دس بجے کنول جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو صحن میں لگی رونق دیکھ کر حیران رہ گئی۔ غزالہ کی فراٹے بھرتی زبان اور ان کے تینوں بچوں کے ابھرتے قہقہوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔ عمیر شاہانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ آج تو خالدہ آنٹی بھی صحن میں رکھے تخت پر موجود تھیں۔

"ضرور عمیر ہی انھیں کمرے سے باہر لایا ہوگا۔"

کنول نے اندازہ لگایا اور آگے بڑھ کر اونچی آواز میں سلام کیا۔ سب نے سرسری سا جواب دیا اور پھر سے باتوں میں مگن ہو گئے۔

"میں نے سوچا کہ بچہ پہلی بار پاکستان آیا ہے۔ اسے یہاں کا کیا پتا، میرے بچے تو شہر کی ہر بڑی اور معروف جگہ سے واقف ہیں۔ سارا شہر گھماؤں گی...... ناشتا تو پسند آیا ناں تمھیں۔" غزالہ نے میز پر رکھی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت لاجواب ہے ان کا ذائقہ۔ اماں اکثر یہاں کے کھانوں اور ذائقوں کا ذکر کرتی تھیں مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ مگر اب مان لیا۔"

عمیر نے کہا تو غزالہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ صبح صبح کی گئی محنت ضائع نہیں گئی تھی۔ حیدر کو بھیج کر سری پائے کے ساتھ حلوہ پوری اور نان چنے منگوا لیے تھے۔ عمیر اتنا سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"یہ سب کون کھائے گا؟" عمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم سب۔"

سیمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر سب نے مل کر ناشتا کیا۔ عارفہ حسب معمول برتن رکھنے اور اٹھانے میں مصروف رہیں۔ خالدہ آپا کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اس لیے عمیر انہیں کمرے سے باہر لے آیا تھا۔

"آجاؤ۔ تم بھی ناشتا کر لو۔"

عارفہ نے چائے کپوں میں ڈالتے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔ کنول نے سر ہلاتے ہوئے بریڈ کا سلائس لیا اور اس پر جیم لگانے لگی۔

"اتنا کچھ تو بچا ہوا ہے ناشتے میں۔ یہ کیوں

لے رہی ہو۔'' عارفہ نے ٹوکا۔
''میں بچی ہوئی چیزیں نہیں کھاتی ہوں امی! مجھے مگ میں چائے دیجیے گا۔'' کنول کہتی ہوئی پلٹی تو عمیر سے سامنا ہوا۔
''عارفہ آنٹی! امی کی دوائی کے بارے میں بتا دیجیے۔''
عمیر کہہ عارفہ کو رہا تھا مگر نظریں کنول پر تھیں۔
کنول سر ہلا کر باہر نکل گئی اور اندر کمرے سے دوائی والا شاپر لے کر عمیر کے ہاتھ میں پکڑایا اور جلدی جلدی سے ساری دوائی سمجھا دی۔ غزالہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہیں پھر اس کے اشارہ کرنے پر ہما تیزی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر دوائیاں تھام لیں۔
''میں دے دیتی ہوں آنٹی کو!''
ہما نے نرم لہجے میں کہا۔
کنول سر جھٹک کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور وہاں رکھے اسٹول پر بیٹھ کر ناشتا کر کے کمرے میں گئی۔ کچھ دیر کے بعد باہر نکلی تو چادر اوڑھی ہوئی تھی۔
''امی میں جا رہی ہوں۔'' کنول نے خالدہ آپا کے پاس بیٹھے چائے پیتیں عارفہ سے کہا اور جمی محفل کو نظر انداز کرتی گھر سے نکل گئی۔
''بہت نخرہ ہے اس لڑکی میں۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔''
غزالہ نے آہستہ آواز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''خیر چھوڑو۔ میں سوچ رہی ہوں کہ خالدہ آپا کو شہر کے مشہور ڈاکٹر کو چیک کروا دیتے ہیں۔'' غزالہ نے مصنوعی فکرمندی سے کہا۔
''نہیں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ اس کی ضرورت نہیں۔'' خالدہ آپا نے سنتے ہی انکار میں سر ہلایا۔
''ارے آپا۔ اس عمر میں ایسی چوٹ لگ جائے تو......''
غزالہ ہمدردی سے کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر خالدہ آپا کے پاس چلی گئیں اور انہیں ڈاکٹر پر لے جانے پر قائل کرنے لگیں۔ عمیر نے متاثر کن نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

خالدہ آپا کو احساس تھا کہ عارفہ اور کنول اپنے کمرے سے در بدر ہونے کی وجہ سے بے آرام ہو رہی ہیں مگر ابھی وہ سیڑھیاں چڑھنے کے قابل نہیں تھیں۔ خالدہ آپا اپنی حساس طبیعت کی بنا پر بار بار اس بات کا اظہار کرتیں۔ کیونکہ وہ لیٹے ہوئے دیکھتی رہتی تھیں کہ کبھی کوئی چیز لینے کنول نیچے آ رہی ہے کبھی کچھ۔
کئی دنوں سے عمیر ماں کے منہ سے یہ سن رہا تھا۔ ایک دن تنگ آ کر بول ہی پڑا۔
''اف اماں! آپ کو اتنی ٹینشن ہے تو میں اوپر چلا جاتا ہوں۔ ان محترمہ سے کہیں کہ اپنے دولت کدے میں تشریف لے آئیں۔''
''اپنے دولت کدے میں آنے کے لیے ہمیں کسی باہر والے کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''
کنول نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے چھوٹی ٹرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ عمیر نے اس گھورا، جواباً کنول نے بھی گھوری ڈال کر جواب دیا۔
''خالدہ آنٹی۔'' کنول نے پاس آ کر سوپ میز پر رکھا۔ ''آپ پریشان مت ہوں۔ ہمارے لیے تو نیچے اوپر کے چکر لگانا اتنا مسئلہ نہیں ہے مگر آپ کے لیے سیڑھیاں چڑھنا مسئلہ ضرور بن جائے گا۔''
کنول کہتے ہوئے سوپ انہیں پلانے لگی۔
خالدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''تمہاری جیسی بیٹیوں کے والدین بہت خوش نصیب ہوتے ہیں۔''
''میرے بابا بھی یہ کہتے تھے۔''
کنول کی مدھم آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ عمیر نے چونک کر دیکھا مگر کنول کی پشت اس کی طرف تھی۔

"میرے پاس اس مسئلے کا ایک حل ہے۔"
غزالہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ غزالہ کے پیچھے سمی، ہما اور حیدر بھی تھے۔ سب نے گرم جوشی سے عمیر اور خالدہ آپا کو سلام کیا۔ کنول کو حسب معمول نظرانداز کر گئے۔ کنول نے اپنا کام مکمل کیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

عمیر نے بہت غور سے دیکھا تھا۔

"لگتا ہے کہ اس کی اپنے رشتہ داروں سے بھی نہیں بنتی ہے۔" عمیر نے حیرت سے سوچا۔

"کیسا حل؟" عارفہ نے اندر آتے ہوئے سوال کیا تو غزالہ کا منہ بن گیا۔

"میں خالدہ آپا اور عمیر بیٹا کو اپنے گھر لے جاتی ہوں۔ ایک تو ہمارا گھر بہت بڑا اور کشادہ ہے۔ وہاں کمرے کی تنگی نہیں ہوگی۔ دوسرا میں خالدہ آپا کا خیال تم سے بہتر رکھ سکتی ہوں۔" غزالہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"مگر میں خالدہ آپا کی ہر ممکن خدمت کر رہی ہوں۔" عارفہ نے جلدی سے کہا۔

"اونہہ! اگر تم اتنی ہی پروا کرتیں تو خالدہ آپا اس حال کو نہ پہنچتیں۔" غزالہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایسا مت کہو غزالہ!" خالدہ آپا نے ہاتھ اٹھا کر غزالہ کو روکا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عارفہ اور کنول نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ بہت محبت دی ہے۔ میں ساری زندگی اس خلوص اور محبت کا قرض نہیں اتار سکتی۔" خالدہ آپا کے لہجے میں شکرگزاری تھی۔

"خالدہ آپا۔ آپ بھی جذباتی ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ فرض ہے ہمارا!"

غزالہ نے بمشکل اس تعریف کو ہضم کیا اور خالدہ آپا کو گلے سے لگا کر تسلی دی۔ عارفہ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

"عمیر بھائی۔ آج ہم آپ کو اپنا شہر دکھائیں گے۔" حیدر نے کہا تو عمیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اماں ٹھیک نہیں ہیں۔ پھر سہی۔" عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کے منہ سے اتنی صاف اردو کے ساتھ لفظ اماں سن کر تو ایسا ہرگز نہیں لگتا کہ آپ اٹلی سے آئے ہیں۔" سمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میری وجہ سے۔" عمیر کے بولنے سے پہلے خالدہ آپا کہنے لگیں۔

"میں نے اپنے سب بچوں کی تربیت بہت دھیان اور سمجھ داری سے کی ہے۔ مغرب کے رنگ میں رنگنے نہیں دیا۔ میں گھر میں اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتی ہوں۔ سچ پوچھیں تو یہاں سے جانے کے بعد، اپنے ملک کی ایک ایک چیز بہت شدت سے یاد آتی ہے۔"

خالدہ آپا نے تفصیل سے کہا۔

"عمیر بیٹا۔ تم گھومو پھرو۔ سیر کرو۔ میں اب بہت بہتر ہوں۔" خالدہ آپا نے بیٹے سے کہا۔

"تو اور کیا۔ یہ دن بار بار تو نہیں آنے ہیں۔" ہما نے جلدی سے کہا۔

"عمیر سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھ سے بہت اٹیچ ہے۔ اس لیے تو میری تکلیف کے بارے میں سنتے ہی فوراً پاکستان آ گیا۔ حالانکہ میں تو اسے کب سے بلا رہی تھی کہ شادی اٹینڈ کرلو مگر یہ نہیں مانا۔ اب شادیاں بھی گزر گئیں تو یہ آ گیا۔"

خالدہ آپا نے کہا تو عمیر ہنس پڑا۔

"آپ کی خوشی کے لیے میں شادی کروا لیتا ہوں اماں! بس آپ ٹھیک ہو جائیں۔"

"سو بسم اللہ۔ لڑکی ہم ڈھونڈیں گے۔"

غزالہ نے جلدی سے کہا تو عمیر حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ ان سے پوچھے کہ "آپ کس خوشی میں اتنی خوش ہو رہی ہیں" مگر پھر ماں کی ہدایات یاد آئیں کہ ہر بات کا اظہار کرنا ضروری نہیں تو وہ چپ کر گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ سب گھومنے پھرنے کے لیے وہاں سے نکل گئے۔ کنول ڈھلتی دوپہر میں گھر لوٹی تو

ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ صرف عارفہ اور خالدہ آپا موجود تھیں۔ کنول نے سکھ بھری سانس لی تھی۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے بعد خالدہ آپا اور عمیر اوپر والے پورشن میں چلے گئے۔ کنول کو اپنا کمرے میں آ کر بہت سکون ملا۔ خالدہ آپا کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ ایک دن کنول خالدہ آپا کے دھلے ہوئے کپڑے اتارنے چھت پر گئی تو وہاں عمیر کو دیکھ کر چونک گئی۔ عمیر چھت کی منڈیر پر لٹکا ادھر ادھر جھانک رہا تھا۔ تار پر پھیلے کپڑے اتار کر زور زور سے ٹوکری میں رکھتے ہوئے کنول نے اسے گھورا۔ عمیر نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا

''محترم۔ یہ آپ کا یورپ نہیں ہے۔ جو شتر بے مہار کی طرح آس پاس تانک جھانک کر رہے ہیں۔''

عمیر نے ڈھلتے سورج کی اداس کرنوں میں گھری زندگی جیسی تلخ مگر دلکش لڑکی کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔

''محترمہ۔ ذرا غور سے دیکھیں۔ میں تانک جھانک کر رہا ہوں یا آس پاس والی مشرقی لوگ مسلسل مجھ پر اظہار رائے کر رہے ہیں۔''

عمیر کے اشارہ کرنے پر کنول نے ساتھ والی چھت کی طرف دیکھا جہاں براجمان دو لڑکیاں اور ان کی اماں عمیر کی طرف دیکھ کر مسلسل اشارے کرتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ عمیر سے بھی سوال جواب جاری تھے۔ جن کے جواب دیتے ہوئے عمیر منڈیر پر لٹک گیا تھا۔ کنول نے ہاتھ میں پکڑی چادر زور سے ٹوکری میں پھینکی اور تیز تیز قدم اٹھا کر منڈیر کے پاس آئی۔

''رفعت آنٹی۔ آپ کو ہمارے مہمان سے کیا دلچسپی ہے جو اتنے سوال جواب کر رہی ہیں؟''

''اے لڑکی۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' رفعت نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

''تکلیف یہ ہے کہ کبھی ہم سے تو اتنے پیار سے بات نہیں کی۔'' کنول نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ عمیر دلچسپی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

''تم اس قابل ہو۔'' رفعت نے بھی کہا تو عمیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ کنول نے اسے گھورا پھر سامنے والی آنٹی کی طرف دیکھا۔

''میں کس قابل ہوں یہ آپ کو جاننا ضروری نہیں۔ خبردار جو دوبارہ ہمارے مہمان پر بری نظر ڈالی۔''

کنول نے وارننگ دی اور واپس مڑ گئی۔ رفعت نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا مگر جاتے ہوئے وہ عمیر کو ہاتھ ہلانا نہیں بھولی تھیں۔ جواباً عمیر نے بھی خیر سگالی کا ثبوت دیتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ وہ واپس مڑا تو کنول اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''ہاتھ ہلانے سے دل نہیں بھرا تو ہاتھ پکڑ لیجیے گا۔ اس کام میں تو ماہر ہیں آپ۔''

کنول کہتے ہوئے مڑ گئی مگر اسے فوراً ہی رکنا پڑا۔ عمیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''اجازت دینے کا شکریہ!''

عمیر کا لہجہ شرارتی تھا۔ کنول نے مڑ کر گھورا اور پھر دوسرے ہاتھ کو لہراتے ہوئے اپنے منہ کے پاس کر کے ناخنوں پر پھونک ماری۔ عمیر نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔

''سمجھ دار ہیں جناب۔ واپس آتے ہوئے ٹوکری اٹھا کر لے آنا۔'' کنول نے شان بے نیازی سے کہا اور واپس چلی گئی۔ عمیر نے منہ بنا کر کپڑوں سے بھری ٹوکری کی طرف دیکھا تھا۔

''عام سی لڑکی کی نظر میں ہیرو جیسے لڑکے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔'' عمیر ٹوکری اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کنول سلائی کڑھائی کے سینٹر سے واپس لوٹ رہی تھی تو گلی کے نکڑ پر کھڑے کچھ آوارہ

لڑکوں کو دیکھ کر اس کے قدم سست ضرور ہوئے مگر رکے نہیں۔ کنول تیز تیز قدم اٹھا کر ان کے پاس سے گزری تو لڑکوں نے اونچا قہقہہ لگایا۔ کنول ایک دم رک گئی۔ کچھ قدم دور حیدر اپنی چمچماتی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

کنول نے غصے سے پیچ و تاب کھاتی آگے بڑھی۔ جب حیدر کے پاس سے ہو کر کوئی آگے بڑھا۔

"ایکسکیوزمی۔ کیا بہت فنی بات ہے جو آپ لوگوں کی ہنسی نہیں رک رہی ہے۔"

عمیر نے سنجیدگی سے کہا تو لڑکے ایک دم چپ کر گئے۔ عمیر کو دیکھ کر مجبوراً حیدر کو بھی آگے آنا پڑا۔ آس پاس محلے کے گزرتے ہوئے چند بزرگ بھی رک گئے۔ لڑکے سٹپٹا گئے۔

"نہیں بھائی۔ ہم تو بس ویسے ہی۔" ایک لڑکے نے جلدی سے کہا۔

"اگلی بار خیال رکھنا۔" عمیر کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔ لڑکے سر ہلاتے وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

"آپ سے کس نے کہا تھا کہ میری مدد کریں۔"

کنول نے گھر کے اندر داخل ہوتے عمیر کو گھورتے ہوئے سوال کیا تو عمیر رک گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا۔ جبکہ کنول اس کے لائٹ براؤن آنکھوں میں نرم سی روشنی دیکھ کر کنفیوز ہو گئی اور سوال کا جواب لیے بغیر واپس پلٹنے لگی۔

"ایک لڑکی سے سیکھا ہے کہ کس طرح دوسروں سے لڑ کر کسی اپنے کی حفاظت کرتے ہیں۔" عمیر نے شرارت سے کہا۔

کنول رکی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔

"اور وہ لڑکی خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک مدت سے اکیلے ہی لڑ رہی ہے۔"

کنول کا لہجہ نم تھا وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ اس لمحے عمیر کو اس کی محرومی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ آج حیدر کی بے حسی دیکھا اسے سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے تایا کی فیملی سے الگ کیوں رہتی ہے۔

☆☆☆

"کیا آج آپ کے پاس کچھ وقت ہو گا؟"

کنول ناشتے سے فارغ ہوئی تو عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں ضرور۔" کنول نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"پھر آج میری ذمہ داری آپ کے سر۔" عمیر نے معصومیت سے کہا۔

"مطلب؟" کنول نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ اپنا شہر نہیں دکھائیں گی مجھے؟" عمیر نے اطمینان سے کہا۔

"مگر روز تو آپ گھومنے پھرنے گئے ہوتے ہیں۔ ابھی بھی حسرت ہے آپ کو۔" کنول نے طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل تائی اور ان کے بچوں کے روز کے چکر لگ رہے ہیں۔

"ہاں مگر میرا ماننا ہے کہ جس طرح سب لوگوں کے دیکھنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے منظر خود دریافت کرتا ہے۔ ویسے بھی آپ کی تائی امی مجھے شہر کی جن بڑی اور مشہور جگہوں مالز وغیرہ میں لے کر جا رہی ہیں وہ سب میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ میں کچھ نیا، کچھ الگ دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس سے اس مٹی کی پہچان، اس کی خوشبو، اس کی روایت نظر آئے۔"

عمیر نے تفصیل سے کہا تو کنول پرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"اوکے ڈن۔" کنول نے مسکرا کر کہا تو عمیر نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سر تسلیم خم کیا تھا۔

موسم بدل گیا تھا۔ گرمی کی شدت میں بہت کمی آ چکی تھی۔ کنول اور عمیر گھر سے نکلے تو صبح کا سورج سر پر تھا۔ شہر کی چھوٹی بڑی گلیوں سے ہوتے، جگہ جگہ رک کر لسی اور چٹ پٹی چیزیں کھاتے، وہ شہر کے تاریخی مقامات کی سیر کو نکل گئے۔ عمیر بہت حیرت

اور خوشی سے لاہور کے تاریخی مقامات کو دیکھ رہا تھا۔ شاہی قلعے کی در و دیوار میں پراسرایت اور تاریخ رقم تھی۔ عمیر اپنے ڈی ایس ایل آر (جدید کیمرے) سے ہر منظر کو قید کر رہا تھا۔ لاہور کے خوب صورت او ر پرسکون باغوں میں پھرتے، ان دونوں نے بے شمار باتیں کی تھیں۔ اس دن عمیر کا احساس ہوا کہ کنول فطرتاً بہت سادہ مزاج کی لڑکی ہے اور اس کا دل بہتے پانی کی طرح شفاف ہے۔

''تم نے کبھی فٹ پاتھ سے کتابیں خریدی ہیں؟'' کنول نے اچانک سوال کیا تو عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو آج تمہیں علم و ادب کا نیا جہاں دکھاتی ہوں۔''

کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ عمیر کو پرانے لاہور کی ان سڑکوں پر لے کر گئی جہاں سڑک پر لگے اسٹالوں اور فٹ پاتھ پر نایاب کتابوں کا ایک ڈھیر تھا۔ عمیر حیرت سے دیکھتا رہا۔

''مائی گاڈ۔ یہ تو بہت غلط بات ہے۔ یعنی یہاں کے لوگوں کو کتابوں کی قدر ہی نہیں ہے۔''

عمیر نے نیچے بیٹھ کر جب کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو سر گھما کر اپنے ساتھ بیٹھی مگن انداز میں کتابیں کنگھالتی کنول کی طرف دیکھا۔ جس نے ہلکی مسکراہٹ اسے دی تھی جیسے اس سے ایسے ہی رویے کی توقع تھی۔

''تم ہنس رہی ہو؟ کیا تم میری بات کو سنجیدہ نہیں لے رہیں؟ کیا تم جانتی ہو کہ اس کتاب کی اصل قیمت کیا ہے جو اس طرح ردی میں پڑی ہوئی ہے۔'' عمیر نے ایک موٹی کتاب اٹھا کر کنول کے سامنے لہرائی۔ کنول نے اطمینان سے کتاب ہاتھ میں لی اور اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے کافی دنوں سے اس کتاب کی تلاش تھی۔ شکریہ۔'' کنول نے مسکرا کر کہا اور کچھ پیسے نکال کر کتاب فروش کو دیے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

عمیر حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہیں؟'' کنول نے نرم لہجے میں کہا۔

''ہاں میرا حیران ہونا بے کار ہے کیوں کہ تم جانتی ہی نہیں کہ ان کتابوں کی اصل قیمت تمہارے دیے چند نوٹوں سے کہیں زیادہ ہے۔''

عمیر نے منہ بنا کر کہا اور اٹھ کر آگے کی طرف چل پڑا۔ کنول کی طرف اس کی پشت تھی۔

''آپ کی ہر بات بجا ہے مسٹر عمیر مگر آپ بھی ایک بات نہیں جانتے ہیں؟'' کنول کی سنجیدہ آواز پر عمیر نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کتاب کو سینے سے لگائے مطمئن کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''یہ ردی میں پڑی کتابیں، میرے جیسے بہت سے مستحق طالب علموں کا پردہ رکھ لیتی ہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ ان کی اصل قیمت ہمارے ادا کیے چند نوٹوں سے بہت زیادہ ہے مگر یہ چند نوٹ بھی ایک غریب طالب علم کے لیے نکالنا اکثر بہت مشکل ہوتا ہے۔''

کنول کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ عمیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ کنول چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے پاس آئی مگر رکی نہیں۔ وہ چلتی رہی اور عمیر بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''ابو کی وفات کے بعد امی کے لیے اکیلے بقا کی جنگ لڑنا مشکل ہو گیا تو میں نے امی کے ساتھ مل کر گلی محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔ کالج کی فیس بہت زیادہ تھی۔ اوپر سے آنے جانے کا خرچا، کتابیں وغیرہ۔ تب میری طرح کی ایک مستحق لڑکی نے مجھے فٹ پاتھ پر بکنے والی ان کتابوں کے بارے میں بتایا۔ جب تک باپ زندہ تھا میرے شوق کو مدنظر رکھ کر بہت سی کتابیں، میگزین لا کر دیتے رہے مگر ابو کے جانے کے بعد میں نے اپنا شوق یہاں سے پورا کیا۔'' کنول نے دھیرے لہجے میں بتایا۔ عمیر کافی دیر چپ رہا۔

''تم کپڑے ڈیزائن بھی کرتی ہو ناں؟'' عمیر

نے پرسوچ انداز میں سوال کیا تو کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔
''مجھے بہتر لگا کہ میں کوئی ایسا ہنر سیکھوں جو مستقبل میں میرے کام آسکے۔ الحمدللہ، میرے ڈیزائن کیے ڈریس بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔ کچھ دنوں میں ایک دو کمپنی میں اپنے کام کا سیمپل دینے جاؤں گی۔''

کنول نے سادگی سے کہا تو عمیر نے حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی ذات سے وابستہ ہر سچائی کو فخر سے بتاتی تھی۔ وہ کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار نہیں تھی۔ وہ جو تھی، ویسا ہی شو کرتی تھی۔

''اچھا سنو...... کچھ پیسے ہیں؟'' کنول کے پوچھنے پر عمیر چونکا اور جلدی سے جیب سے والٹ نکال کر اسے دکھانے لگا۔
''ہاں بہت ہیں۔'' عمیر نے فخر سے کہا۔
''کافی چھچھوری حرکت ہے یہ۔ اس طرح تو بہت آرام سے والٹ چوری ہو سکتا ہے۔'' کنول نے منہ بنا کر کہا اور پھر ادھر ادھر دیکھتی سڑک کراس کرنے لگی۔ عمیر نے ڈر کر جلدی سے والٹ جیب میں رکھ لیا۔ کنول ایک دکان جس کے سامنے بہت رش تھا۔ وہاں جا کر رک گئی۔
''چلو اب گرم گرم پٹھورے کھلاؤ مجھے۔'' کنول نے ایک میز اور کرسی کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر عمیر کی طرف دیکھا۔ جو حیرت سے اس دکان کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو حلوہ پوری ٹائپ ہے ناں مگر تمہاری تائی تو کہتی ہیں کہ حلوہ پوری ناشتے میں کھاتے ہیں۔'' عمیر نے حیرت سے بڑی سی کڑاہی میں تیزی سے ڈلتی اور نکلتی پوریوں کو دیکھا۔
''یہ حلوہ پوری سے ملتے جلتے ہیں۔ تم کھاؤ گے تو پتا چلے گا ناں۔'' کنول نے کہتے ہوئے لڑکے کو آرڈر دیا۔
عمیر حیران نظروں سے سارے عمل کو دیکھ رہا تھا کہ کس طرح پٹھورے بن رہے تھے اور کیسے لوگوں کو سرو کیے جا رہے تھے۔
''جس طرح تم ندیدوں کی طرح لوگوں کو دیکھ رہے ہو یہ مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔'' کنول نے ٹوکا تو عمیر سر جھٹک کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
''پاکستان ذائقے میں مالا مال ہے۔'' عمیر نے پٹھوروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
''صرف ذائقے میں؟'' کنول نے ٹھنڈی بوتل پیتے ہوئے سوال کیا۔
''کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو لگتا ہے کہ خوب صورتی میں بھی......''

عمیر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو کنول نے اسے گھورا۔ عمیر فوراً اپنے سامنے رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''تمہاری اس بات سے ایک بات تو ثابت ہوئی۔'' کنول نے کہا۔
''کون سی بات؟'' عمیر نے حیرت سے پوچھا۔
''کہ ماشاء اللہ مرد ہر جگہ ہی نظر باز ہوتے ہیں۔'' کنول نے اس پر چوٹ کی جسے سمجھ کر عمیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ کنول بھی مسکرانے لگی۔
عمیر نے رات سونے سے پہلے جب اپنے کیمرے میں قید کیے منظر دیکھے تو چونک گیا۔ اس کے کیمرے کی آنکھ میں قید کیے ہر منظر میں ایک لڑکی کا چہرہ، کبھی اس کا ست رنگی آنچل، کبھی رنگ برنگی چوڑیاں، کبھی بہتے پانی میں اس کے گورے پاؤں میں چمکتی پائل، کبھی اس کے ہونٹوں سے کھلتی ہنسی بہت واضح۔ وہ لڑکی تہذیب و ثقافت کے اتنے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی کہ عمیر ہر رنگ کو دیکھ کر حیران تھا۔ یہ ہی حیرانی اسے لاہور کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے ہوئی تھی۔ وہ لڑکی بھی لاہور جیسی تھی۔ بہت اپنی اپنی سی۔ مخلص اور زندہ دل۔ ایسے ہی جیسے وہ لڑکی لاہور کا لازمی حصہ ہو!
''یہ جو لاہور سے محبت ہے

یہ کسی اور سے محبت ہے!
اس کی ہر طرز مجھ کو بھاتی ہے
اس کے ہر طور سے محبت ہے!!''

یہ وہ دن تھا جس نے ان دونوں کے احساسات کو بہت الگ الگ رنگ دے دیے مگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ انہیں چھپانے کی کوشش میں تھے۔

☆☆☆

اگلے دن کنول شام ڈھلے واپس گھر لوٹی تو تو اوپر والے پورشن سے آتی آوازوں نے مہمانوں کی آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ شام کی چائے پی جا رہی تھی۔ خالدہ آپا کو اس کی آمد کی خبر ہوئی تو اسے فوراً آواز دے کر بلا لیا۔ گرم گرم سموسے اور جلیبیوں سے انصاف کرتے ہوئے سب بہت خوش۔

''بس کچھ دن تک ہم واپس جا رہے ہیں۔''

چائے پیتے ہوئے خالدہ آپا نے کہا تو غزالہ کے ہاتھ سے سموسہ گر کر چٹنی میں جا گرا۔

''ابھی کیوں؟'' غزالہ نے پریشان نظروں سے پہلے ہما اور پھر عمیر کی طرف دیکھا تھا۔

''تین مہینے تو ہو گئے ہیں۔ اب بھی جلدی ہے کیا؟'' خالدہ آپا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مگر عمیر تو ابھی آیا ہے۔ اسے کچھ گھومنے پھرنے تو دیں۔'' غزالہ نے جلدی سے کہا۔

''آپ کے خلوص کا بہت شکریہ۔ مگر آنٹی وہاں کی زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ فرصت کے یہ چند لمحے نکالنا بھی غنیمت ہے۔''

عمیر نے نرمی سے کہا۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ اب باقی کے دن آپ ہمارے گھر رہیں گے۔ ہمیں بھی میزبانی کا شرف بخشیں۔'' غزالہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''نہیں غزالہ۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ جہاں اتنے دن گزاریں ہیں، وہاں چند دن اور سہی۔'' خالدہ آپا نے فوراً منع کر دیا۔

''کیا ایک دن بھی نہیں۔'' ہما نے آگے بڑھ کر نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا تو خالدہ آپا کا دل نرم پڑ گیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔''

خالدہ آپا کے کہتے ہی سب خوشی سے اچھل پڑے جبکہ کنول نے گہری سانس لی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ عمیر نے اس کا اٹھ کر جانا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

''کنول۔'' غزالہ اپنی فیملی کے ساتھ جب واپس جانے لگیں تو برآمدے میں کھڑے عمیر نے کنول کو پکارا جو کچن سے باہر نکل رہی تھی۔ عمیر کے پکارنے پر رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی جبکہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے غزالہ اور ہما رک گئیں۔

''میں نے اپنے ایک دوست شاہ زیب سے تمہارے ڈیزائن کے بارے میں بات کی ہے۔ اس کا ڈیفنس میں بوتیک ہے۔ کل چلنا تم میرے ساتھ۔''

عمیر کے کہنے پر کنول نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی جبکہ غزالہ اور ہما حسد کی آگ میں جلنے لگیں۔

''تم کیوں اس لڑکی کی حمایت کرتے پھر رہے ہو۔'' غزالہ نے آہستہ آواز میں کہا تو عمیر نے چونک کر دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' عمیر نے حیرت سے سوال کیا۔

''اس لڑکی کو تو عادت ہے مظلوم بن کر لڑکوں سے مدد لینا۔ کتنا عرصہ تو میرے حیدر کے پیچھے پڑی رہی ہے۔'' غزالہ نے کہا تو عمیر کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔

''سوری آنٹی! مگر یہ میرا مسئلہ ہرگز نہیں ہے کہ کنول اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتی ہے اور کیا نہیں؟ کنول نے میری ماں کی بہت خدمت کی ہے میں اسی وجہ سے اس کی مدد کرنا چاہ رہا ہوں۔''

عمیر نے سنجیدگی سے کہا تو غزالہ اور ہما

مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ عمیر نے گہری سانس لے کر دروازہ بند کیا اور جیسے ہی پلٹا اپنے پیچھے غصے سے بھری ہوئی کنول کو دیکھ کر چونک گیا۔

"آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ گاڈ فادر ہیں آپ! ہوتے کون ہیں میرے خلوص کی اس طرح قیمت لگانے والے۔" کنول نے غصے سے کہا۔

"کنول۔ تم بات کو غلط رخ پہ لے جا رہی ہو۔"

عمیر نے تحمل سے کہا مگر کنول غصے سے بولنے لگی۔ اسے اصل تکلیف غزالہ کے لفظوں نے پہنچائی تھی مگر غصہ وہ عمیر پر نکال رہی تھی۔ اس وقت اوپر سے سیڑھیاں اتر کر خالدہ بھی آ گئیں اور اندر والے کمرے سے عارفہ بھی نکل آئیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ دونوں چونکیں۔

"کیا ہوا کنول بیٹی؟" خالدہ نے پیار سے پوچھا۔

"اس کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔" عمیر نے ناگواری سے کہا اور پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ کنول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خالدہ آنٹی آپ ہی بتائیں کہ....." کنول روتے ہوئے بتانے لگی۔ خالدہ اسے چپ کروانے لگیں۔

"کنول۔ تم ہر بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہو۔ عمیر نے ویسے ہی کہا ہوگا۔" عارفہ نے نرمی سے سمجھایا۔

"ویسے ہی کیا امی! کیا ہم نے خالدہ آنٹی کی خدمت کسی لالچ یا صلے کے لیے کی تھی۔" کنول اپنی بات پر قائم تھی۔ عارفہ نے سر پکڑ لیا۔

"نہیں بیٹی۔ میں جانتی ہوں کہ تم دونوں کا خلوص انمول ہے۔" خالدہ نے اسے گلے سے لگایا تو وہ چپ ہو گئی۔

اوپر آ کر خالدہ نے عمیر کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔ جس پر عمیر کا موڈ بھی آف ہو گیا۔ وہ جو پہلے غزالہ کے گھر جانے پر راضی نہیں تھا۔ اسی رات حیدر کو فون کر کے بلا لیا۔ ان کے جانے کے بعد کنول مزید اداس ہو گئی اور اس کی یہ اداسی عارفہ کو بہت سی ان کہی کہانیاں سنا رہی تھی۔

☆☆☆

کنول کتنی دیر سے چھت کی منڈیر سے لگی نیچے جھانک رہی تھی۔ چائے کا خالی کپ پاس ہی رکھا ہوا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" عارفہ کی آواز پر کنول چونکی اور مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ جو تازہ بنی چائے کے سپ لے رہی تھیں۔

"کچھ نہیں امی!" کنول نے بے زاری سے کہا۔ آج کل اس کے مزاج پر عجیب سے بیزاریت چھائی ہوئی تھی۔

"جب سے خالدہ آپا گئی ہیں، تم ایسے ہی الجھی ہوئی اور بے زار سی رہنے لگی ہو۔" عارفہ نے سنجیدگی سے کہا تو کنول چونکی۔

"ان کی مرضی ہے امی۔ جہاں بھی رہیں مجھے کیا۔" کنول نے اپنے لہجے کو سرسری سا رکھا تھا۔

"یہ بات ہی تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کنول۔ کہ ہر شخص کی مرضی ہے۔ ہم کسی پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتے ہیں۔" عارفہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"امی! میں نے ایسی کوئی چاہ تو نہیں کی۔" کنول کا لہجہ مدھم اور نظریں جھکیں ہوئی تھیں۔

"کنول۔ میں نے ہمیشہ تمہیں سلیف میڈ بن کر زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا ہے۔ تمہارے باپ کے اچانک انتقال کی وجہ سے میں نے بہت مشکلات دیکھیں۔ دنیا کے سمندر میں اکیلے ہاتھ پاوں مارتے ہوئے مجھے ایک چیز کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو گیا تھا کہ سمندر میں رہنا ہماری قسمت ہے مگر بغیر ہاتھ پاوں مارے ڈوبنا ہماری قسمت نہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سکھایا۔ تمہیں وہ سب کام کرنے کی عادت ڈالی جو پہلے ہم تمہارے باپ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ایک مضبوط شخصیت بنو۔ اتنی مضبوط کہ کوئی تمہیں تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش ہرگز نہ کرے۔ جیسے کہ حیدر نے کی تھی......"

عارفہ نے نم آنکھوں سے کنول کی طرف دیکھا

جس کے چہرے پر ضبط کی سرخی تھی۔

"لوگ بھلے کچھ بھی کہیں کہ تم بولڈ ہو، دوٹوک بات کرتی ہو، کسی کا لحاظ نہیں رکھتی، تم میں مروت نہیں ہے یا کچھ بھی مگر میں جانتی ہوں کہ تم عام لڑکی کی سوچ اور عمل سے چند قدم آگے چل رہی ہو کیوں کہ وقت کے محاذ پر تم اکیلے جنگ لڑ رہی ہو۔" عارفہ دھیمے لہجے میں بول رہی تھیں۔

"میں تمہیں چاہے دنیا کے کتنے بھی سبق پڑھا دوں، نصیحت گھول کر پلا دوں مگر میں تمہیں خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتی۔ خواب جو نیندوں میں خواہش کے رنگوں سے بنتے ہیں۔ خواب کی پتنگیں جو امیدوں کے دھاگے سے بہت دور تک اڑتی ہیں۔ یہ سچ ہے کنول کہ ہم دل پر اختیار نہیں رکھتے ہیں۔"

عارفہ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔ کنول نے لب کاٹتے ہوئے ماں کے اداس چہرے کی طرف دیکھا۔

"امی۔ کیا وہ ہم سے بہتر ہیں اس لیے قسمت کے دھنی ہیں؟"

کنول نے ماں کا ہاتھ تھام کر معصومیت سے سوال کیا۔ عارفہ نے ایک نظر بیٹی کے سادہ چہرے پر ڈالی۔

"قسمت جس نے لکھی ہے اس کے فیصلوں پر اعتماد رکھنا سیکھو۔ مایوسی کے اندھیرے بہت خوف ناک ہوتے ہیں کنول!"

عارفہ نے نرمی سے سمجھایا تو کنول سمجھ کر سر ہلانے لگی۔ عارفہ پلٹ کر واپس چلی گئیں۔ کنول کچھ دیر تک سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر شام ڈھلتی دیکھ کر خاموشی سے پلٹی تو منڈیر کا وہ کونا دیکھ کر رک گئی جہاں اکثر عمیر کو کھڑا دیکھتی تھی۔ کنول کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے بھیگیں۔ کوئی شدت سے یاد آیا تھا۔

"تتلی کی طرح جو اڑ چکا ہو۔۔!

وہ لمحہ کہاں سے کھوج لاؤں!"

اس لمحے وہ شدت سے تسلیم کر رہی تھی کہ دل کی خواہش بھی بے لگام پتنگ کی طرح ہوتی ہے۔ یہاں سے وہاں ڈولتی ہوئی۔

☆☆☆

"اماں۔ واپس کب جانا ہے۔ ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔"

رات سونے کے لیے وہ دونوں اپنے کمرے میں آئے تو عمیر نے بیزاری سے کہا۔ خالدہ آپا نے ایک سنجیدہ نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور بیڈ پر بیٹھ کر پاؤں اوپر رکھ لیے۔ عمیر ماں کے قدموں میں بیٹھ کر نرمی سے دبانے لگا۔ اس کی یہ عادت بہت پرانی تھی۔

"اتنی جلدی اکتا گئے؟ میں بھی کہ ہما کے ساتھ تم بہت خوش ہو۔" خالدہ آپا نے اطمینان سے کہا۔

"اف اماں۔ آپ سے کس نے کہہ دیا؟" عمیر نے بے زاری سے کہا۔

"اتنے بے زار کیوں ہو۔" خالدہ آپا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"پتا نہیں اماں۔ یہ بات ہی تو سمجھ میں نہیں آرہی۔" عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا سب چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ تم دونوں لڑکیوں سے مل چکے ہو۔ اب جس کی طرف تمہارا دل مائل ہو۔ میں وہاں رشتہ ڈال دوں گی۔"

"ہما اچھی لڑکی ہے۔ باادب، پڑھی لکھی، دھیما لہجہ، سر پر اسکارف مگر......" عمیر کہتے کہتے چپ کر گیا۔ اسے لاہور کی شام جیسی لڑکی یاد آئی تھی مگر اس دن کنول کی بدگمانی اور بحث نے اس کا دل بہت خراب کیا تھا۔

"تمہارے اس مگر کی وجہ سے میں نے ابھی غزالہ سے بات نہیں کی ہے۔ اچھی طرح سوچ لو کیونکہ جب ایک بار فیصلہ لے لیا تو پیچھے ہٹنے نہیں دوں گی۔ بیٹیوں کے معاملے بہت نازک ہوتے ہیں۔" خالدہ آپا نے سختی سے کہا تو عمیر کی نگاہوں کے سامنے تنک مزاج، بے مروت سی لڑکی کا چہرہ گھوم گیا۔

"اس نے تو شکر کیا ہوگا کہ ہم سے جان چھوٹی۔" عمیر نے سر جھٹک کر سوچا۔

"میں نے دنیا دیکھی ہے عمیر۔ تم سے زیادہ کھرے کھوٹے کی پہچان ہے مجھے۔ میری نظر کہتی ہے کہ کنول جیسی بھی ہے وہ خالص ہے۔ اس میں

دکھاوا نہیں ہے۔ جیسی نظر آتی ہے، ویسی ہی ہے اور میرے نزدیک آج کے دور میں یہ خوبی بہت نایاب ہے۔'' خالدہ آپا نے سنجیدگی سے کہا تو عمیر کی نگاہوں کے سامنے ایسے کئی لمحے گھوم گئے جو ماں کی بات کی تصدیق کرتے تھے۔

''مجھے پتا ہے اماں مگر اس میں اکڑ بہت ہے۔'' عمیر نے منہ بنا کر کہا۔

''اکڑ نہیں۔ اصول پسند ہے وہ۔ خود دار۔ مت بھولو کہ وہ باپ کے بغیر بڑی ہوئی ہے۔ باہر کی دنیا کو مرد بن کر فیس کیا ہے اس نے۔ اسے یہ خودداری اور نخرہ جچتا ہے۔'' خالدہ نے ایمان داری سے تجزیہ پیش کیا تو عمیر سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

''حیدر ابھی آتا ہے تو آپ دونوں کو چھوڑ آئے گا۔'' غزالہ نے تیار بیٹھے ماں بیٹے سے کہا تو عمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خالدہ کا فون بجا تو وہ فون پر بات کرنے لگیں۔ ان کے منہ سے احمد نام سن کر غزالہ چونکی۔

''یہ خالدہ آپا کو وہی رشتے دار لڑکا ہے ناں جس کے پیچھے کنول پڑی ہوئی تھی۔'' غزالہ نے طنزیہ انداز میں کہا تو عمیر چونکا۔

''کیا مطلب؟'' عمیر نے حیرت سے سوال کیا۔

''تمہیں نہیں پتا۔ بھئی بہت آنا جانا تھا احمد کا وہاں۔ جب بھی جاؤ وہ دونوں ساتھ نظر آتے۔ تمہاری طرح وہ بھی کنول کو بوتیک پر کام دلوانا چاہتا تھا اور سنا ہے کہ اس بہانے دونوں بہت گھومتے پھرتے تھے اور......''

''کس سے سنا ہے؟'' اچانک خالدہ آپا کی سرد اور سنجیدہ آواز ابھری۔ غزالہ چونکیں۔ وہ فون بند کر کے سخت تیوروں سے انہیں گھور رہی تھیں۔

''وہ محلے داروں سے۔'' غزالہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بولیں۔

''چلو میرے ساتھ اور مجھے وہ محلے دار دکھاؤ۔ میں بھی پوچھوں کہ انھوں نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟''

خالدہ آپا کا انداز اور لہجہ غزالہ کو حیران اور پریشان کر رہا تھا۔

''چھوڑیں آپا۔ ہمیں کیا لینا دینا۔'' غزالہ نے گھبرا کر کہا۔

''یہ بات تو تمہیں سوچنی چاہیے غزالہ! کسی کی کردار کشی سے ہمیں کیا لینا دینا۔ مت بھولو کہ تمہاری بھی دو دو بیٹیاں ہیں۔ جس احمد پر تم الزام لگا رہی ہو۔ وہ فروا کا منگیتر ہے اور کنول کو سارا کام فروا کے ذریعے ہی ملا تھا۔'' خالدہ نے سنجیدگی سے کہا۔ غزالہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

ہما اور سیمی بھی حیرت سے خالدہ آپا کو دیکھ رہی تھیں۔ آج سے پہلے خالدہ نے کبھی اتنے سخت انداز اور لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

''آپ میری بیٹیوں کو اس سے ملا رہی ہیں؟'' غزالہ نے ناگواری سے کہا۔

''میں کسی کو کسی سے نہیں ملا رہی مگر غزالہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ وہ بچی یتیم ہے۔ اس سے شفقت اور نرمی کا رویہ رکھنے سے تمہیں کتنا ثواب ملے گا۔''

خالدہ آپا نے نرمی سے سمجھایا۔ غزالہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

عمیر کی آنکھوں کے سامنے سے بہت سے پردے چھٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ غزالہ اور اس کی فیملی کس سوچ اور طرز عمل کے مالک ہیں۔ عمیر نے کال کر کے ٹیکسی منگوالی۔ دونوں ماں بیٹا گاڑی میں بیٹھے تو عمیر نے سنجیدگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

''حیرت ہے اماں۔ آج تو آپ بہت غصے میں تھیں۔'' عمیر نے شرارت سے کہا۔

''عمیر۔ میں نے ساری زندگی سادگی میں گزاری۔ تم سب کو بھی یہ ہی سکھایا۔ میں نہ کسی کے خلاف غلط بات کرتی ہوں اور نہ اپنے سامنے غلط چیز ہوتی برداشت کر سکتی ہوں۔ ٹھیک ہے غزالہ کی اپنی دیورانی سے نہیں بنتی مگر کم از کم کسی بچی کی کردار کشی تو نہ کرے۔ اللہ معاف کرے کیا ہم نے خدا کو منہ نہیں

دکھانا جو ہر زیادتی پر چپ رہیں۔'' خالدہ آپا نے کہا تو عمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو کنول اور عارفہ نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ کنول تو خالدہ کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئی۔ خالدہ بھی اسے خود سے لگائے باتیں کرتی رہیں۔ عمیر محبت کے اس مظاہرے کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر سر جھٹک کر اوپر والے پورشن میں چلا گیا۔ کنول نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو؟'' کنول بڑبڑائی۔

''سمجھتی کیا ہے خود کو؟'' عمیر نے بھی منہ بنا کر سوچا اور پھر مسکرا دیا۔

☆☆☆

عمیر کمرے میں داخل ہوا تو کنول اور عارفہ کو خالدہ کے ساتھ پیکنگ کرواتے ہوئے دیکھا۔ خالدہ نے عارفہ اور کنول کے ساتھ مل کر پاکستان ملبوسات اور دوسری چیزوں کی شاپنگ کی تھی۔ جن میں سے زیادہ تر انکل میں دوست احباب کو تحائف کی صورت میں دینے تھے۔

''خالدہ آنٹی۔ اگر آپ مزید رک جائیں تو بہت مزے مزے کے تہوار دیکھ لیں گی۔ کنول نے بچوں کی طرح انہیں لالچ دیا تھا۔

''جیسے کہ......؟'' خالد نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ عمیر نے ماں کی آنکھوں میں جھانکتی شرارت دیکھ لی تھی۔

''جیسے کہ...... رمضان المبارک، عید الفطر، بڑی عید پھر چودہ اگست اور پھر......'' کنول انگلیوں پر گنوانے لگی۔ جب عمیر اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اسے گھورنے لگا۔

''کیوں کیا وہاں رمضان کا مہینہ نہیں آتا؟ چھوٹی یا بڑی عید نہیں ہوتی؟ یا باہر کے ممالک میں رہنے والے اپنے آزادی کے دن کو بھول جاتے ہیں یا پھر......'' عمیر نے اعتراضات کی ایک لمبی لسٹ گنوا دی تھی۔

''ہوتا ہوگا۔ مگر یہاں جیسا تو کچھ نہیں ہوتا ناں۔'' کنول نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں یہاں کی تو ہر چیز کی نرالی ہے جیسے کہ آپ......''

عمیر نے آخری لفظ منہ میں کہا مگر کنول نے سن لیا۔ عارفہ اور خالدہ ان دونوں کی نوک جھوک سن کر مسکرا رہی تھیں۔

''ویسے عمیر! کنول ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے بھی یہاں کی رونقیں بہت یاد آتی ہیں۔'' خالدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو اور کیا خالہ آنٹی! ہمارے یہاں کے سارے تہوار زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ آخری روزں میں بازاروں میں بڑھتا رش، شاپنگ پھر انتیسویں روزے کو چاند کو آسمان پر تلاش کرنا اور اگر چاند کا اعلان ہو جائے تو چاند رات منانے کی تیاری کرنا۔ کبھی بازاروں سے چوڑیاں، مہندی لے کر اور کبھی سب سہیلیوں کا مل کر مہندی لگانا۔ عید کی صبح کی تیاری کرنا۔ میٹھے پکوان بننا۔ بڑی عید پر قربانی کا جانور خریدنا، اس کے ناز نخرے اٹھانا، بچوں کی خوشی، محلے میں جانوروں کا شور، جشن آزادی پر گھر گھر لگی جھنڈیاں، چھتوں پر لگے جھنڈے، برقی روشنیاں، ہرے اور سفید رنگ کے کپڑے پہننا، آزادی کا اسپیشل بیج لگانا، ملی نغمے گانا، وغیرہ یہ سب بھلا وہاں کہاں ہوتا ہوگا۔''

کنول پر جوش انداز میں کہتے ہوئے بچوں کی طرح لگ رہی تھی جو اپنی چیز کو سب سے بہتر مانتے ہیں۔

''چلیں مان لیا، مگر پھر بھی ہمارے وہاں سارے چاند ستارے روشن نظر آتے ہیں۔'' عمیر نے شرارت سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' کنول نے حیرت سے سوال کیا۔

''وہاں فضائی آلودگی کم ہے ناں۔'' عمیر نے سنجیدگی سے کہا مگر اس کی آنکھوں میں واضح شرارت کی چمک تھی۔

''ویری فنی۔'' کنول نے منہ بنایا۔

''عمیر بس کرو۔ تم ہر وقت بچی سے بحث کرتے رہتے ہو۔'' خالدہ نے عمیر کو ٹوکا۔

”ہاں تو یہ بچی کب ہار مانتی ہے۔ ماشاء اللہ کئی گھنٹے لگاتار بحث کر سکتی ہے۔“ عمیر نے سراہا تو کنول سر جھٹک کر خالدہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
”میں چائے بنا کر لاتی ہوں اور ساتھ گرما گرم پکوڑے بھی۔“ کنول نے مسکرا کر کہا۔
”ساتھ وہ ہرے رنگ والی کیچپ بھی۔“ عمیر نے جلدی سے کہا۔
”وہ کیچپ نہیں چٹنی ہوتی ہے۔“ کنول نے تصحیح کی۔
”جو بھی ہوتی ہے سچ میں بہت مزے کی ہوتی ہے۔“ عمیر نے کہا تو کنول سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔
”میں اس کی مدد کرواتا ہوں۔ اتنا کچھ کیسے اٹھا کر اوپر لائے گی۔“ عمیر کہتے ہوئے نیچے چلا گیا۔
”سنو عارفہ۔“ خالدہ نے کپڑے تہ کرتی ہوئیں عارفہ کو پکارا۔
”جی خالدہ آپا۔“
”مجھے تمہاری بیٹی بہت پسند ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ وہ میرے عمیر کی دلہن بن جائے مگر میں عمیر کی مرضی کے بغیر ہاں نہیں کر سکتی۔“ خالدہ نے کہا تو عارفہ کا چہرہ خوشی سے سج گیا۔
”خالدہ آپا۔ آپ کی محبت اور خلوص نایاب ہے۔ باقی جو میری بیٹی کی قسمت مجھے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔“ عارفہ نے بردباری سے کہا تو خالدہ نے متاثر نظروں سے عارفہ کی طرف دیکھا تھا۔
”میں نے تم سے اس لیے ذکر کیا کہ تم کچھ عرصہ میرے فون کا انتظار ضرور کرنا۔ یہ نہ ہو کہ کنول کا رشتہ کہیں اور طے کر دو۔“ خالدہ نے کسی خدشے کے تحت کہا تو عارفہ مسکرا دی۔
”ضرور۔ میں انتظار کروں گی۔“ عارفہ نے دل سے اپنی بیٹی کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

☆☆☆

کنول کچن میں کام کر رہی تھی اور عمیر صحن میں اس جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں بیٹھ کر کنول اپنا زیادہ تر وقت گزارتی تھی۔ ساتھ ساتھ کچن میں کام کرتی ماں سے باتیں بھی کرتی رہتی۔ ابھی بھی عمیر سر اٹھا کر درخت پر پھدکتی چڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔
”کیا وہاں چڑیاں نہیں ہوتی ہیں؟“ کنول نے اس کی محویت کو دیکھ کر شرارت سے کہا۔ وہ کچن کی جالی سے اسے دیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے پکوڑے تل رہی تھی۔ عمیر نے گردن گھما کر جالی کی طرف دیکھا۔
”ہوتی ہیں مگر ایسے شور نہیں مچاتیں۔“ عمیر نے بھی شرارت سے جواب دیا۔
”پھر کیسی چڑیاں ہوئیں جو شور ہی نہ مچائیں۔“ کنول نے منہ بنا کر کہا۔
”شاید شور مچاتی بھی ہوں مگر ایسا نہیں ہوتا۔“ عمیر نے کچھ سوچ کر اپنی بات کی نفی کی۔
”مطلب؟“ کنول نے حیرت سے سوال کیا۔
”اس شور میں کسی کی آواز بھی شامل لگتی ہے۔ شاید یہ فرق ہے۔“ عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔
”کیوں کیا کوئی چڑیل دیکھ لی ہے؟“ کنول ٹرے اٹھا کر باہر نکلی۔
”ہاں ایک لڑکی ہے جو کبھی چڑیل لگتی ہے اور کبھی مہربان پری۔“ عمیر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ کنول نے اس کی نگاہوں کے پیغام کو سمجھا مگر نظر انداز کر دیا۔
”سنو!“ کنول اسے نظر انداز کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی جب عمیر نے پکارا۔ کنول رکی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔
”تم شاہ زیب سے ملنے گئی تھیں۔ وہ تمہارا کام دیکھ کر بہت خوش ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جلد تمہیں بہت بڑا آرڈر مل جائے گا۔“ عمیر نے کہا تو کنول نے گردن موڑ کر دیکھا۔
”بس؟“ کنول کا انداز سوالیہ تھا۔
”ہاں۔ تمہیں اس دن کے رویے پر سوری کہنا چاہیے تھا مگر خیر ہے تم نے منہ سے نہ سہی مگر اپنے عمل سے تو اعتراف کر لیا۔“ عمیر نے مسکرا کر کہا تو کنول کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بے ساختہ مسکرا دی۔

''سوری! میں نے آپ کے خلوص پر شک کیا تھا۔''
کنول نے اعتراف کیا۔ عمیر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا جو مسکراتے ہوئے پلٹ گئی۔
عمیر نے گھر سے جاتے ہوئے شاہ زیب کا ایڈریس اور نمبر عارفہ کو لکھ کر دے دیا تھا۔ جب کنول کا غصہ کم ہوا تو اسے احساس ہوا کہ وہ غزالہ کی باتوں کا غصہ عمیر پر نکال رہی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ عمیر اور خالدہ آنٹی اس کے ساتھ مخلص تھے۔ اسے بعد میں اپنے رویے پر ندامت ہوئی۔ وہ اگلے دن ہی عمیر کے بتائے پتے پر عارفہ کو لے کر پہنچ گئی تھی۔ جہاں اس کے کام کو بہت سراہا اور پسند کیا گیا تھا۔ کنول عمیر کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر ایک جھجک تھی۔ جو آج عمیر کے دوستانہ رویے سے دور ہو گئی۔
''عجیب لڑکی ہے۔ کسی بھی بات پر غصہ کرنے لگتی ہے اور پھر اسی بات پر سوری بھی کہہ دیتی ہے۔''
عمیر بڑبڑایا اور پھر پکوڑوں کا سوچ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔
''میرے پکوڑے۔'' عمیر نے دور سے آتے ہوئے آواز لگائی تو اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے وہ تینوں بے ساختہ ہنس پڑیں۔

☆☆☆

''آج کا دن ہم سب ایک ساتھ گزاریں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ پاکستان میں گزارا یہ آخری دن مجھے یاد رہے۔'' خالدہ آپا نے پیکنگ مکمل کرنے کے بعد اطمینان سے اعلان کیا اور صبح ہی فون کر کے غزالہ اور اس کی فیملی کو بھی بلا لیا۔ اس دن کی بحث کے بعد غزالہ بھی محتاط ہو گئی تھیں۔ وہ سب شام کی چائے پینے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جب بات کنول کے ڈیزائن کیے کپڑوں پر ہونے لگی۔
''ماشاء اللہ۔ کنول کے ہاتھ میں بہت نفاست ہے۔ اتنی خوب صورت قمیص ڈیزائن کی ہے۔ میرے سسرال میں تو بہت ڈیمانڈ ہے کنول کے کام کی۔''
خالدہ آپا کے سراہنے پر کنول انکساری سے مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ ہما کو جلانے کے لیے کافی تھی۔

''خالدہ آنٹی۔ دراصل کنول کو شروع سے پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے ایسے اوٹ پٹانگ کام کرنا پسند تھے۔ کبھی رنگوں سے کھیلتی رہتی اور کبھی مٹی سے چیزیں بناتی، کبھی گڑیا کے کپڑے بنانے لگ جاتی۔ تنگ آ کر چچی جان نے اسے سلائی کڑھائی سیکھنے میں لگا دیا مگر آج کل اتنا وقت کس کے پاس ہے۔ ہر برانڈ کی اچھی سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔ یہ دیکھیں خالدہ آنٹی یہ شرٹ پانچ ہزار کی ہے۔ اس پر کام کتنا نفیس ہے۔'' ہما نے فخریہ انداز میں کہا۔
''تو اور کیا خالدہ آپا! پچھلے مہینے میں نے شاپنگ کی۔ آپ جانتی ہیں کہ ہر چیز کی قیمت......''
غزالہ نے فخریہ انداز میں چیزوں کی قیمت گنوانا شروع کر دیں۔ دراصل غزالہ کی طرح اس کے تینوں بچے بھی یہ سوچتے تھے کہ مہنگی چیز ہی بہترین اور نایاب ہوتی ہے۔
عمیر جو بہت غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بے اختیار کنول اور ہما کا موازنہ کرنے لگا حالانکہ اس کا دل تو پہلے ہی کنول کی طرف مائل تھا مگر وہ جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہما بے تکان بول رہی تھی اور ذہن کی نمائندہ زبان اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ عمیر کے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ گفتگو نجانے کب تک چلتی۔ شکر ہے کہ سیمی کو وقت گزرنے کا احساس ہوا تو اس نے شور مچا دیا۔
''مما۔ رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔ کیا ڈنر پر نہیں جانا؟'' سیمی نے نزاکت سے کہا تو غزالہ نے بھی سر ہلایا۔
ہاں بھئی! آج کا ڈنر بہت خاص ہے۔'' غزالہ نے کہا
''میرے خیال سے تو گھر کا کھانا ہی بہتر رہتا۔ باہر کے کھانے مجھے اتنے پسند نہیں ہیں۔''
خالدہ آپا نے نرمی سے کہا مگر غزالہ کی ضد کے آگے ان کی نہیں چلی۔ کچھ دیر کے بعد وہ سب تیار ہو کر ڈنر کے لیے گھر سے نکل گئے۔
ریسٹورنٹ پہنچ کر سب خوش گپیوں میں

مصروف ہو گئے۔ کنول حسب معمول ماحول سے الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھی۔

عمیر ان سے باتیں کرتا ہوا ایک نظر اس پر بھی ڈال رہا تھا۔ ویٹر آیا تو غزالہ آرڈر بتانے لگی۔ غزالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہوٹل کی مہنگی سے مہنگی ڈش منگوا کر میز پر رکھ دیں۔ ہما، حیدر اور سیمی بھی ماں کو مشورہ دینے میں پیش پیش تھے۔

''خالدہ آپا۔ کچھ اور بھی منگوانا ہے تو بتا دیں۔'' غزالہ نے آرڈر فائنل کرنے سے پہلے پوچھا۔ خالدہ آپا نے ایک نظر عمیر کی طرف دیکھا اور پھر بولیں۔

''کیا یہاں کوئی دال یا سبزی مل جائے گی؟''

خالدہ آپا کے پوچھنے پر ویٹر نے حیرت سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر دال لکھ دیا۔ غزالہ اور تینوں بچے حیرت سے دیکھنے لگے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ کچھ دیر کے بعد کھانا سرو ہو گیا۔ عمیر نے ایک نظر کھانا کھاتی ہما پر ڈالی۔ جس کے سر سے اسکارف بہت پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ خوب صورت انداز میں کٹے بالوں کو بار بار جھٹکتے ہوئے وہ سیخ کباب کو سامنے رکھے اسے کانٹے اور چھری سے کھانے کی کوشش میں تھی۔ ایسی ہی کوشش غزالہ، سیمی اور حیدر بھی کرنے کی کوشش میں تھے۔ جبکہ عمیر نے انہیں اس سے پہلے گھر میں سیخ کباب بہت شوق سے نان کے ساتھ کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر بڑے ریسٹورنٹ میں آ کر وہ خود کو ہر طرح سے بہت ماڈرن ثابت کر رہے تھے۔ جوان کی شخصیت کی کمزوری کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ سب مختلف ڈرنکس منگوا کر بہت نزاکت سے سپ لے رہے تھے۔

عمیر نے دوسری نظر کونے میں بیٹھی ماں بیٹی پر ڈالی جو پورے اعتماد کے ساتھ عام اور سادہ طریقے سے کھانا کھا رہی تھیں۔ فرق صاف ظاہر تھا۔

سیمی نے اپنے لیے خاص طور پر مولٹن چاکلیٹ کیک منگوایا مگر اسے کھاتے ہوئے وہ عجیب عجیب سے منہ بنا رہی تھی۔ عمیر کچھ دیر دیکھتا رہا۔ وہ اب سمجھ گیا تھا کہ اس کی ماں نے کنول اور ہما میں کیا فرق دیکھا تھا۔ ہما میں بہت سی خوبیاں ہوں گی مگر دوسرے کو متاثر کرنے کی شدید خواہش میں اس کی خوبیاں اندھی تقلید کے پیچھے چھپ گئی تھی اور اس کی شخصیت کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

عمیر سے جب مزید ان سب کا ڈرامہ برداشت نہیں ہوا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ سب نے حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر اس کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''کیا ہوا عمیر بیٹا؟'' غزالہ نے حیرت سے سوال کیا تو عمیر نے معذرت کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بعض اوقات بہت چھوٹی چھوٹی باتیں، بہت بڑے بڑے فیصلوں کی وجہ بنتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے بہت چھوٹی چھوٹی باتوں سے کسی کے اندر (اصل) کا پتا چلتا ہے۔

☆☆☆

''کیا کر رہی ہیں اماں؟'' عمیر کام سے واپس آیا تو ماں کو موبائل فون ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر بے ساختہ پوچھنے لگا۔

''کنول سے بات کر رہی تھی۔'' خالدہ آپا نے اداسی سے جواب دیا اور شیشے سے نظر آتے باہر کے سبزے کے حسین منظر کو دیکھا۔

''ہاں تو اس میں اتنا اداس ہونے والی کیا بات ہے؟ کہیں روزہ تو نہیں لگ رہا؟'' عمیر نے شرارت سے ماں سے پوچھا تو خالدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا پھر ضرور کنول نے وہاں کے نئے پرانے سب تہوار یاد کروا دیے ہوں گے۔ بہت بولتی ہے یہ لڑکی۔'' عمیر نے اس کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ خالدہ بھی مسکرانے لگیں۔

''یہاں سب کچھ ہے عمیر مگر وہ اپنا پن، وہ چاہت نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو ساری عمر یہاں گزار کر اب میرا دل نہیں لگتا ہے۔ پاکستان کے اس چھوٹے سے گھر میں گزارے چند مہینے مجھے بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔'' خالدہ آپا نے نم لہجے میں کہا تو عمیر نے پاس بیٹھ کر ماں کے کندھے پر بازو پھیلا کر خود سے لگا لیا۔

''ہاں تو چلتے ہیں ناں پاکستان۔'' عمیر کے کہنے پر خالدہ آپا ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھیں۔
''کیا مطلب تم نے فیصلہ کرلیا؟'' خالدہ آپا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا تو عمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔
''کون...... ہما یا کنول......!'' خالدہ آپا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''وہ ہی جو گرمی جیسا مزاج رکھتی ہے مگر احساس کی ٹھنڈک سے سکون دینا جانتی ہے......کنول۔''
عمیر نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو خالدہ آپا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور انھوں نے بے اختیار عمیر کا ماتھا چوم لیا۔
''میں تمہارے فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ بہت زیادہ۔ مگر مجھے لگا کہ شاید تم ہما کو پسند کرتے ہو؟'' خالدہ آپا نے حیرت سے سوال کیا۔
''آپ کی خواہش تھی کہ میں اپنے لیے فوری طور پر لڑکی پسند کرلوں۔ تب پہلے پہل مجھے ہما بہتر لگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے تیز اور چمک دار رنگ فوراً توجہ کھینچ لیتے ہیں مگر جب تھوڑی توجہ سے دیکھا جائے تو اکثر ہلکے اور مدھم رنگ آنکھوں سے زیادہ روح کو سکون پہنچاتے ہیں۔ میں شاید فیصلہ لے لیتا مگر آپ کے سمجھانے پر جب غور کیا تو سامنے کی باتیں صاف نظر آنے لگیں۔ کنول اور عارفہ آنٹی مجھے یا آپ کو متاثر کرنے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ جبکہ غزالہ آنٹی اور ان کے بچوں کی یہ ہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح ہمیں متاثر کرنے کے لیے دوسروں کو لیٹ ڈاؤن کرسکیں۔ پھر غزالہ آنٹی اور ہما مجھے جس چیز سے متاثر کرنا چاہ رہی تھیں، اماں میں نے وہ سب کچھ یہاں بچپن سے دیکھا ہے۔ میرے لیے وہاں کے کلچر، روایت اور اپنے پن میں کشش ضرور تھی مگر مہنگے کپڑے، برانڈز چیزیں، فاسٹ فوڈ وغیرہ۔ یہ سب تو ہمارے لیے روٹین کی باتیں ہیں۔''
عمیر نے سنجیدگی سے کہا تو خالدہ آپا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس؟'' خالدہ نے سنجیدگی سے کہا تو عمیر اپنا بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔
''تھوڑا بہت محبت کا چکر بھی لگ رہا ہے۔'' عمیر نے بمشکل اعتراف کیا۔
''تھوڑا بہت......!'' خالدہ نے ڈپٹ کر پوچھا تو عمیر نے ہنستے ہوئے ماں کے گلے لگ گیا۔
''ہاں مان لیتا ہوں کہ دور دیس کی اس لڑکی سے محبت کر بیٹھا ہوں۔'' عمیر نے دل سے اعتراف کیا۔
''پھر اتنے بہانے کیوں کر رہے تھے؟'' خالدہ نے کہا۔
''بس خود کو وقت دے کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں یہ سب وقتی نہ ہو مگر پاکستان سے واپس آنے کے بعد شدت سے احساس ہوا کہ مجھے کنول سے محبت ہوگئی ہے۔'' عمیر نے سنجیدگی سے کہا تو خالدہ نے اس کا ماتھا چوم لیا۔
''تمہارا انتخاب بہترین ہے۔ کنول میرے دل کی خوشی بھی تھی مگر میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی۔'' خالدہ نے نرمی سے کہا۔
''اور غزالہ آنٹی کو کیا کہیں گی آپ!'' عمیر نے سوال کیا۔ تو خالدہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔
''غزالہ کی فطرت میں بہت خود غرضی ہے۔ جس کا مظاہرہ تم نے بھی وہاں کئی بار دیکھا ہوگا۔ غزالہ کا رویہ عارفہ اور اس کی یتیم بچی کے ساتھ بہت برا رہا ہے۔ خیر پہلے پہل تو غزالہ کا رویہ میرے ساتھ بھی بہت عجیب سا تھا اور تمہارے آنے کے بعد یکسر تبدیل۔ میں بہت حیران ہوئی پھر مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ یہ سب خاص مقصد کے تحت کر رہی ہے۔ میں غزالہ کا اصل پہلے سے جانتی تھی مگر مروت میں چپ تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے تم اپنا فیصلہ بدلو۔''
خالدہ آپا نے شروع سے لے کر عارفہ کو کی گئی فون کال کے بارے میں بتایا تو عمیر حیرت سے سنتا رہا۔
''اف اماں۔ آپ اتنا کچھ جانتی تھیں۔ مجھے بتانا چاہیے تھا۔'' عمیر نے افسوس سے کہا۔

"اب بتا دیا ہے ناں۔ کافی ہے۔" خالدہ آپا نے اطمینان سے مسکرا کر کہا۔ عمیر بھی ماں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☆☆☆

"کیا ہے کنول۔ کیوں شور کر رہی ہو؟"

عارفہ نے کافی دیر سے الماری کھول کر چیزیں یہاں سے وہاں رکھتے اور بڑبڑاتے ہوئے کنول کو دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر تنگ آکر کہہ ہی دیا۔

کنول نے سر گھما کر ماں کی طرف دیکھا۔

"میں کام کر رہی ہوں۔" کنول نے اطلاع پہنچائی اور دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"لگ تو نہیں رہا۔" عارفہ نے دھیمے لہجے کہا۔ جسے کنول نے ان سنی کر دیا۔ فون کی بیل بجی تو عارفہ نے جلدی سے اٹھایا۔

"خالدہ آپا۔ آج میں نے ماش کی دال بنائی تو آپ بہت یاد آئیں۔ آپ کو بہت پسند ہے ناں......"

"اچھا کب؟"

عارفہ پہلے چونکیں، پھر حیرت سے سننے لگیں۔ کنول کا پورا وجود کان بن گیا۔ وہ ساکت کھڑی تھی مگر اس نے پیچھے مڑ کر ماں کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"کنول آپ کی ہی بیٹی ہے۔" عارفہ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

"کنول سے بات کریں۔"

عارفہ نے کہتے ہوئے کنول کو پکارا جو بمشکل خود کو فون تک لائی تھی۔ فون کا ریسیور کان سے لگا کر وہ خاموش کھڑی رہی۔ دوسری طرف سے آتی آواز سنتی رہی، فون بند ہوگیا تو کنول نے ریسور کھ دیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بیٹی کے لیے اتنا اچھا رشتہ آیا ہے۔"

عارفہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے کنول کا ماتھا چوما۔ کنول کا چہرہ رنگوں سے سجا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟ اپنا کام تو مکمل کرو۔" عارفہ نے کنول کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"امی! مجھ سے الماری ٹھیک نہیں ہو رہی۔ آپ کر دیں پلیز!"

کنول کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر کھلے برآمدے میں آکر کھڑی ہوگئی اور گہری گہری سانس لینے لگی اس کی سماعت میں کچھ دیر پہلے اترے لفظوں نے جسم و جاں میں ست رنگی پھول کھلا دیے تھے۔ تا حد نظر پھول ہی پھول تھے اور سانسوں کو مہکاتی ان کی تیز خوشبو!

کنول کا دل تیز رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ کنول نے منڈیر پر ہاتھ رکھا۔ خوشی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دونوں ہاتھ فضا میں کھول کر گول گول گھومنے لگی۔ اس کے دوپٹے کے کنارے پر لگی چھوٹے چھوٹے موتیوں کی لیس ستاروں کی طرح چمک رہی تھی اور وہ خوشی سے چمکتا ہوا چاند لگ رہی تھی۔

کنول رکی اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد پاکستان آرہا ہے۔

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ پاکستان میں سب تہوار اور دن بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔" عمیر نے شرارت سے کہا۔

"ہاں تو......!" کنول نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"تو میری محبت کا چاند، پرانے محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں روشن ہے۔ اپنا چاند پانے کے لیے، مجھے بہت جلد اس کے دیس تو آنا ہوگا۔"

عمیر کے لفظوں نے کنول کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

وہ خوش تھی اور بہت خوش تھی کیونکہ اس نے محبت کے آسمانی صحیفے پر، دل کے سفید اوراق پر، نوخیز جذبوں کی انمٹ ست رنگی سیاہی سے عمیر کا نام لکھا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔

میں نے ہر دور میں بس اس سے محبت کی ہے
جرم سنگین ہے اب اس میں رعایت کیسی

☆☆

سمیعہ خالد

دکھ سہنا سیکھ

وہ اوندھے منہ بیڈ پر پڑی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا اور غصے سے جسم کانپ رہا تھا۔

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہاتھ میں ریموٹ پکڑے سرمد پلوشہ کو تاسف سے تکے جا رہا تھا۔

"اب بس بھی کرو دو رونا، تم تو ہر بات کو مسئلہ بنا لیتی ہو، ہر بات پر تمہیں اعتراض ہوتا ہے۔" ہلکی خفگی سے کہتے ہوئے سرمد نے ریموٹ کا رخ ایل ای ڈی کی طرف کیا۔

"مجھے...... مجھے ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے؟" وہ اسے غصے سے گھور رہی تھی۔ آنسوؤں کی نمی لیے چہرہ تمتما رہا تھا۔ کئی بال اس کے سفید چہرے سے لپٹے تھے۔

سرمد بے اختیار اسے دیکھے گیا اور شرارت سے کھینچ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"یقین کرو اس روپ میں بھی پیاری لگ رہی ہو۔" سرمد نے دھیرے سے اس کے چہرے پر چپکے بالوں کو نرمی سے ہٹایا۔

پلوشہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"مجھے اپنی جھوٹی تعریفوں کے لفظوں میں پھنسا کر موضوع نہ بدلیں۔ میں صاف کہے دے رہی ہوں سرمد۔ میری فرسٹ کزن کی شادی ہے۔ سب کزنز بھرپور تیاری کر رہی ہیں۔ میں ہرگز پرانے کپڑوں میں جوڑ توڑ کر کے سوٹ زیب تن نہیں کروں گی۔ مذاق بن کر رہ جاتا ہے میرا، اور نہ ہی میں اس بار اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی ہونے دوں گی۔ برانڈ کے کپڑے پہناؤں گی ان کو۔ غضب خدا کا۔ باپ سب کچھ افورڈ کر سکتا ہے اچھے سے اچھا پہنا سکتا ہے مگر گھر کے الٹے سیدھے کپڑے پہن کر بچوں کی شخصیت دب کر رہ جاتی ہے۔ لوگوں کی تمسخر بھری نگاہیں الگ برداشت کرنی پڑتی ہیں۔"

وہ بولے جا رہی تھی اور سرمد خاموشی سے اس کو سن رہا تھا۔ اس وقت اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ پلوشہ کے اس طرح بولنے سے کون سا اس کے مطالبات پورے ہونے تھے۔ ہونا تو وہی تھا جو اس کی ماں نے چاہنا تھا۔

☆☆☆

پلوشہ کی شادی کو پانچواں سال تھا۔ اس سے پہلے گھر میں دو بہوئیں موجود تھیں جو صبر و استقامت کی اعلا مثال تھیں۔ چند برس تو اس نے بھی بڑے صبر و تحمل سے گزارے تھے مگر اب ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس کے شوہر سمیت تینوں بھائی اچھے عہدوں پر جابز کر رہے تھے۔ بڑے بھائی تو بلکہ پچھلے تین سال سے کینیڈا میں مقیم تھے اور اچھا خاصا کما رہے تھے۔ مگر گھر میں بچت و کفایت شعاری ایسے کی جاتی گویا ذرا بھی ہاتھ کشادہ کیا تو نوبت فاقوں تک نہ آ جائے۔ اس کا دل جل جل کر خاک ہو جاتا۔

اس گھر کی کرتا دھرتا ان تینوں کی ساس تھیں پورے گھر کی راجدھانی کی ملکہ، ہر کام میں کفایت شعاری و سلیقہ مندی کی اعلا مثال۔ کون سا ایسا ہنر تھا جو انہوں نے اپنی ساس میں نہ دیکھا ہو۔

خاندان میں کہیں شادی ہوتی۔ لوگ جوش و خروش سے شادی کی تیاریاں کرتے اور وہ دل مسوس

کرساس کوسلائی مشین پر بیٹھے دیکھے جاتیں۔
دس دس سال پرانے سوٹ نکال کر ایک سوٹ کی لیس دوسری پر اور دوسرے کو کتر بیونت کر کے نیا شاہکار تخلیق کرلیا جاتا۔ پھر دکھا دکھا کر خود ہی بہوؤں سے داد وصول کرتیں۔
''یہ دیکھو کیسا پیارا ڈیزائن بنا ہے۔ پہنو گی تو سب کی نگاہیں تم پر ہی ہوں گی۔ سب سے منفرد نظر آؤ گی۔''
ثمینہ بھابھی کے سامنے انہوں نے سلا سوٹ بجھے دل سے مسکرادیں۔ زیبا بھی منہ نیچے کیے دھیرے سے مسکرا رہی تھی۔
''منفرد تو نظر آئیں گی ہی ہم ساری بہوئیں۔ ساس نے نوے کی دہائی کے جوڑے جو تیار کیے ہیں۔''
اس کی بات پر پلوشہ بھی آہستگی سے ہنس دی۔
''اس پر بس نہیں تھا۔ بہوئیں تو بہوئیں، پوتا



پوتی بھی ان کے سلیقے سے خوب چمک رہے ہوتے۔ باپ کی ویسٹ کوٹ کو کاٹ پیٹ کر چھوٹا کر کے بارہ سالہ ارسل کی ویسٹ کوٹ بنا دی جاتی جو نہ تو ویسٹ کوٹ لگتی نہ شیروانی۔

''واہ......واہ، ماشاءاللہ رضیہ بھابھی کی بہوئیں پورے فنکشن میں الگ ہی چھب دکھا رہی ہیں۔'' بھئی ساس ہو تو ایسی محبت والی۔ دیکھو ثمینہ نے یہ سوٹ پہلی بار میری مریم کی شادی پر پہنا تھا۔ ماشاءاللہ اس کی شادی کو اس دسمبر میں بارہ برس ہو جائیں گے۔ میری مریم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا مگر ثمینہ کے سوٹ کی کڑھائی کے لشکارے جوں کے توں ہیں۔ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی بارہ سال پرانا سوٹ ہے۔ بہت اچھا کیا رضیہ تم نے۔ جو اس سوٹ کی کلیاں سائیڈ سے ہٹا کر سیدھی قمیض بنا دی۔ بالکل آج کے فیشن کی لگ رہی ہے۔''

تائی ساس ریحانہ نے اپنے تمسخر اڑاتے جملوں کو ان کی تعریف میں لپیٹا اور ساس صاحبہ کا چہرہ اپنی تعریف سے کھل اٹھا۔

ہم تینوں دل ہی دل میں تاؤ کھا کر رہ گئیں۔

''اور داد دیں مجھے ریحانہ بھابھی۔ میں نے ان کلیوں کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا۔ زیبا کی بیٹی کی فراک پر دیکھیں۔ کیسی بہار دکھا رہی ہیں۔'' انہوں نے پاس سے گزرتی نو سالہ حور کو لپک کر تائی ریحانہ کے سامنے کیا تو ان کی آنکھیں حیرت سے ابلنے کی حد تک پھیل گئیں۔

''واہ بھئی واہ رضیہ! مان گئے تمہارے سلیقے وطریقے کو۔'' انہوں نے باقاعدہ تالی بجا کر خاندان کی کئی اور خواتین کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

بات صرف لباس پر ہی موقوف نہ تھی۔ محترمہ ساس صاحبہ ہر طرح کی جیولری بنانے میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ کسی سستے بازار سے کئی طرح کے موتی نگینے خرید کر لائے جاتے اور پھر ان پر اپنی کاریگری دکھائی جاتی۔ میلاد، قرآن خوانی اور شادیوں کے حساب سے جیولری تیار ہوتی اور سب بہوؤں کے ہاتھوں میں تھما دی جاتی کہ فلاں کی شادی کے فنکشن میں یہ جیولری پہن کر جانی ہے۔

ان چھوٹے موٹے دمکتے نگینوں کو دیکھ کر اس کا بچا کھچا خون بھی جل جاتا۔ گولڈ کی جیولری شہر کے حالات کے پیش نظر لاکر میں منہ چھپائے پڑی تھی اور ہم آج کل کے فیشن کی خوب صورت جیولری سے محروم اپنی مرمریں گردن میں ست رنگے ہار پہنے لوگوں کی مضحکہ خیز نظروں کا سامنا کرنے پر مجبور تھیں۔

پلوشہ نے تو شادی بیاہ میں خواتین کے درمیان میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ جس شادی میں جاتی اپنی ٹیبل سے ہی نہ اٹھتی اس سے لوگوں کی نظروں کا سامنا نہیں کیا جاتا تھا۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں؟

☆☆☆

یہ لارج سائز پیزے کا تیسرا ٹکڑا تھا جو حلق کے راستے اس کے پیٹ میں منتقل ہو رہا تھا۔

''پلوشہ تم تو پیزے کے بخیے ادھیڑنے میں لگی ہو۔ باقی چیزوں کی طرف بھی نظر کرم کر لو اور اب یہ باقی کے پیسز ہمارے لیے چھوڑ دو۔'' ریمل نے پزا اپنی طرف سرکایا تو پلوشہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''سوری یار! تمہارے حق پر ڈاکا ڈالا۔ پیزا ہے ہی اتنے مزے کا کہ ہاتھ ہی نہیں رک رہا۔'' اس نے پیزا منہ میں ٹھونستے ہوئے تعریف کی تو سب کی ہنسی نکل گئی۔

''بیک اینڈ بیک۔'' سے منگوایا ہے اگر اتنا پسند آ رہا ہے تو میں اور آرڈر کر دیتی ہوں۔'' تانیہ نے اسے دیکھا جس کے گھر میں وہ سب جمع تھیں۔

مہینے میں ایک بار کسی نہ کسی دوست کی طرف گیٹ ٹو گیدر ہوتا اور وہ خوب انجوائے کرتیں۔ کچھ گھر کی ڈشز ہوتیں اور کچھ مارکیٹ سے منگوائی جاتیں۔

اس کے گھر جب بھی گیدرنگ ہوئی ہمیشہ ساسو ماں کے ہاتھ کی بنی ڈشز ہی سب نے کھائیں۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ کبھی پیزا ہٹ کا لزانیہ منگوائے یا

پھر مشہور بیکرز کے مشہور فاسٹ فوڈ آئٹمز۔ مگر یہ اس کی ہمیشہ خواہش ہی رہی۔ جب بھی اس کی دوستوں نے آنا ہوتا۔ ساسو ماں بڑے اشتیاق سے مینو لسٹ تیار کرتیں۔ جس میں تین چار طرح کی چٹنیاں ہوتیں۔ تل کی چٹنی، لہسن کی چٹنی تو کبھی ٹماٹر کی بھنی چٹنی۔

ان بہوؤں کو تو اب ڈر لگنے لگا تھا کہ اگر ساسو ماں نے اپنے بارے میں بہوؤں کے جذبات جانچ لیے تو ایک اور مشہور چٹنی سے لوگ جانکاری پائیں گے اور وہ ہوگی۔ ''انسانی چٹنی''

کبھی حیدر آبادی قیمہ سے میز سجائی جاتی تو کبھی نورتن پلاؤ۔ دو چار بار تو اس کی دوستوں نے کھا کر خوب تعریف کی مگر ہر بار ایک ہی طرح کا مینو اسے شرمندہ کر دیتا۔

گھر کا کھانا اسے پسند تھا مگر یہ کیا کہ اپنی ہی ریسیپیز دہرائی جائیں۔ کسی بھی بہو کو چولہا سنبھالنے کی اجازت نہ تھی۔ بس سبزیوں اور فروٹ کی کاٹ پیٹ کر کے دو۔ بنائیں گی خود۔ جو نہ دیکھنے میں اسے کبھی خوش شکل لگیں نہ ذائقے میں۔ اوپر سے ستم یہ کہ کراکری بھی اپنے جہیز کی استعمال کرتیں۔ ثمینہ بھابھی سے لے کر اس کے جہیز کی کراکری تک برتنوں کی الماری اور ڈبوں میں منہ چھپائے اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ جو ہر طرح کے ذائقے سے بے نیاز محو استراحت تھیں۔

شہر میں کتنے ہی مشہور کھانے کے ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ کارنر کھل چکے تھے مگر گھر میں لانے اور وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بچوں کو جلے سوکھے فرنچ فرائز اور زنگر برگر ہر چیز ''رضیہ ہٹ'' سے ملتی۔

''پلوشہ نے تو جل کر کچن کا نام ہی ''رضیہ ہٹ'' رکھ دیا تھا۔''

سردیوں میں گاجر کے حلوے، انڈوں کے حلوے سمیت ہر حلوہ ملغوبے کی شکل میں ٹیبل پر جلوہ گر ہوتا اور پھر اسی پر بس نہ ہوتا۔ کھانے کے آئٹمز کی تیاری کے تمام مراحل کی تمام تصاویر اپنی مخروطی انگلیوں سمیت فیس بک پر اپ لوڈ کی جاتیں۔

شروع میں تو بڑے شوق سے پلوشہ نے ان کو اپنی فرینڈ لسٹ میں ایڈ کیا تھا۔ بہوؤں کی دوستوں کو انہوں نے خود ہی فرینڈ ریکویسٹ بھیج کر فرینڈ لسٹ میں شامل کر لیا تھا۔

چار کباب، چند فرنچ فرائز، ٹماٹروں کا سالن، ترچھی روٹیوں اور موٹی موٹی کٹی پیاز سے سجی نوے کی دہائی کی چینی یا کانچ کی پلیٹوں میں جب تصویریں اپلوڈ ہوتیں تو وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتی۔

لوگوں کے کمنٹس ان کے شوق کو مزید ہوا دے دیتے۔ اگلے دن صبح ناشتا میں بنے آلو کے بے تکے پراٹھے اور چائے کے کپ کی تصویر اپلوڈ ہو کر سب کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہوتی۔ بظاہر سب کے واؤ، زبردست، یم کے کمنٹس ہوتے مگر سب ہی جانتے تھے کہ ان کا ہر وقت یہ فضول سی تصویریں اپلوڈ کرنا کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

''افف......مجبور ہیں اف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔''

☆☆☆

''کچھ تو سوچیں ثمینہ بھابھی۔ کوئی تو حل ہوگا آپ کے پاس اس مسئلے کا۔ آخر کو پندرہ سال ہو گئے ہیں آپ کو آنٹی کے ساتھ رہتے۔ کوئی تو ان کی کمزوری ہوگی جو اس ''رضیہ ہٹ'' ''رضیہ بوتیک'' اور ''رضیہ جیولرز'' سے خلاصی ہو۔'' پلوشہ نے بہت برا منہ بنا کر ثمینہ بھابھی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ تینوں ثمینہ بھابھی کے کمرے میں جمع تھیں اور سر جوڑ کے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی فکر میں غلطاں تھیں۔

''کیا کروں سچی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پندرہ سال ہو گئے اس سلیقے و طریقے کو برداشت کرتے۔ کتنی ہی مرتبہ جی چاہتا ہے کہ کچن میں جا کر کوئی اچھی سی ریسیپی ٹرائی کروں۔ شادی سے پہلے کوکنگ کورس میں نے بھی کیے تھے۔ دیسی، کانٹینٹل کھانے مجھے بھی آتے تھے۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے مگر جب بھی میں نے کچن میں قدم رکھا آنٹی نے یہ کہہ کر

فوراً وہاں سے نکال دیا کہ ''ارے تم کہاں تھکو گی کچن میں۔ بتاؤ کیا کھانا ہے میں بنا دیتی ہوں۔''
شروع میں تو میں اسے ان کی محبت خیال کرتی تھی مگر بعد میں مجھ پر کھلا کہ یہ ان کی خود پسندی و خود ستائشی ہے کہ وہ سب کو دکھائیں کہ وہ ہر کام میں ماہر ہیں، ایکٹو ہیں۔ لوگ ان کی تعریف کریں۔ انہیں سراہیں۔''
''خود ستائشی کے علاوہ بچت کا پہلو بھی کارفرما ہے ثمینہ بھابھی۔'' زیبا نے ٹکڑا لگایا۔
''ہاں یہ بھی ہے۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔
''سچی میں تو پیسے خرچ کرنے کو ترس گئی ہوں کتنا دل چاہتا ہے ناں اچھی سی شاپنگ کرنے کو۔ شادی سے پہلے جیولری، سوٹ، پرس ہر چیز کی بھرمار ہوتی تھی اور وہ بھی برانڈ کی۔ یہاں تو سیزن کے کپڑے بھی کسی سستے بازار سے لیے جاتے ہیں۔'' پلوشہ بری طرح رضیہ آنٹی سے خائف ہو چکی تھی۔
''سچی کوئی تو شعبہ چھوڑ دیں یہ اپنی ہنر آزمائی سے۔ لاؤنج میں جو کارنر ٹیبل پر واز رکھا ہے۔ بدرنگے پینٹس اور گھٹیا پھولوں سے سجا۔ کتنی ہنسی آئی تھی مجھے جب میری کزن نے اسے اٹھا کر بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ زیبا بچوں کو پینٹ کرنا سکھاؤ ضرور مگر ان کے لیے ان کے کمرے میں الگ سے کارنر بناؤ اور وہاں ان کی چیزوں کی دل کھول کر تعریف کرو۔ یوں لاؤنج میں رکھا یہ واز کتنا بدنما لگ رہا ہے۔ اگر کسی نے بچوں کے سامنے انجانے میں یہ کہہ دیا کہ یہ واز کس نے اتنا برا پینٹ کیا ہے تو بچوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔'' اس کی کہی بات پر جہاں میں دل میں بری طرح ہنسی تھی وہیں دزدیدہ نظروں سے رضیہ آنٹی کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا، جو اپنی اس کھلی تعریف کو سن کر بھی نظر انداز کر گئی تھیں۔''
زیبا کی بات پر وہ تینوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔
حقیقت یہی تھی چاہے وہ کام کرنا آئے یا نہ آئے، آزمانا ضرور ہے اور آزما کے دکھا دکھا کے تعریف بھی وصول کرنی ہے۔ وہ تینوں حیران ہوتی تھیں کہ ماشاء اللہ اس عمر میں بھی وہ کتنی ایکٹو تھیں۔ سارا دن اپنی کاریگری میں لگی رہتیں۔ کبھی تھکاوٹ کا ذکر تک نہ کرتیں۔ ذکر کرتیں بھی تو کیسے؟ تھکتے تو بوڑھے بندے ہیں اور وہ تو اپنے آپ کو ابھی تک جوان سمجھتی تھیں۔ بہوؤں سے ذرا ہی تو بڑی تھیں وہ قد میں۔ ہاہاہا۔ کتنی خوشی سے وہ اظہار کرتی تھیں کہ فلاں خاتون کہہ رہی تھیں۔
''اچھا...... یہ آپ کی بہوئیں ہیں ہم تو آپ کو دیورانی جٹھانی سمجھ رہی تھیں۔''
اور وہ اندازہ لگا سکتی تھیں کہ وہ ثمینہ بھابھی کو اپنی جٹھانی تصور کر کے خود دیورانی بنی ہوں گی۔
''اچھا بھئی ان باتوں کو چھوڑو۔ مسئلے کے حل کی طرف آؤ۔'' پلوشہ نے بیڈ پر پھیلی ٹانگیں سکیڑیں۔
''تینوں بیٹے اور شوہر فرماں برداری کی اعلا مثال ہیں ان کے آگے اپنے رونے سے تو لڑائی جھگڑوں کو ہوا دینے والی بات ہے۔ ہمیں ہی اس مسئلے کا حل سوچنا ہوگا۔ وہ بھی اس طرح کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''
''کیا مطلب......؟'' زیبا نے آنکھیں پٹپٹائیں۔
''مطلب یہ کہ گھر میں بدمزگی بھی نہ ہو اور ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔'' ثمینہ بھابھی نے رسان سے سمجھایا تو وہ دونوں بھی ان کی بات کی قائل نظر آئیں۔ تینوں اپنے دماغوں پر زور ڈالتی سوچوں میں مستغرق ہو گئیں۔

☆☆☆

''رضیہ ہٹ پلس بوتیک سنٹر۔''
یہاں پر بچیوں کو سلائی کڑھائی، کوکنگ کورس اور ہر طرح کا ہنر مناسب فیس میں سکھایا جاتا ہے۔ اپنی بچیوں کو ہنر سکھائیں اور مستقبل میں پریشانی سے بچائیں۔''
''یہ دسواں ایڈمیشن ہوا ہے۔ یکم سے پہلی کلاس اسٹارٹ ہو گی کوکنگ کی۔'' وہ بڑے شوق سے ان تینوں کو بتا رہی تھیں ساتھ ہی ایڈمیشن کی مد میں ملنے والی رقم بھی انہیں دکھائی تو انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔
''تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے یہ سینٹر بنا دیا ایک تو میرا ہنر دوسروں میں منتقل ہو کر گھروں کو سنوارے گا

اور میرا نام روشن ہوگا۔ دوسرا اس مہنگائی کے دور میں اچھی خاصی رقم بھی ہاتھ آجائے گی۔'' رضیہ آنٹی نے کہتے ہوئے احتیاط سے پیسے اپنے تیار کردہ پرس میں رکھے۔ تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیں۔

یہی تو وہ کمزوری ان کے ہاتھ لگی تھی کہ رضیہ آنٹی پیسہ اکٹھا کرنے اور اپنی تعریف کروانے کی شوقین ہیں۔ یہی سوچ کر انہوں نے اوپر والے پورشن کو رضیہ آنٹی کو اپنا ہنر آزمانے کے لیے سیٹ کر دیا تھا اور وہ تو خوشی خوشی مان بھی گئی تھیں۔ انہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ وہ اپنے ہنر میں لگی رہیں گی اور وہ بھی ان کی غیر موجودگی میں اپنی مرضی کرسکیں گی۔

''آنٹی، بس ہم تو چاہتی ہیں کہ آپ کا ہنر نسل درنسل منتقل ہوتا رہے۔ کتنی ہی بچیاں آپ کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کریں گی تو سوچیں کتنی نیکیاں ملیں گی آپ کو۔''

پلوشہ نے ان پر نفسیاتی وار کیا۔

''بالکل...... بالکل میں تو پہلے ہی دنیا سے کہتی تھی۔ میری بہوئیں کوئی عام بہوؤں جیسی تھوڑی ہیں۔ پوری طرح میری صلاحیتوں کی معترف ہیں۔ دل کھول کر تعریف کرتی ہیں وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔''

☆☆☆

یکم سے گھر کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ ثمینہ بھابھی اپنے پرانے سارے کپڑوں کو ساتھ والی ماسی کو دے آئی تھیں۔ زیبا برتنوں کی الماری میں اپنی کراکری سیٹ کررہی تھی اور وہ خود کچن میں بڑی شان سے گھسی تھی۔ گھر کی فضا میں ایک دم سے آکسیجن بڑھ گئی تھی جس میں وہ سب کھل کر سانس لے رہی تھیں۔

پورے ہفتے کا تینوں نے پلان ترتیب دے لیا تھا کون کون سی ڈشز بنتی ہیں۔ کہاں کہاں سے شاپنگ کرنی ہے۔ تینوں بہت ہی پرجوش ہو رہی تھیں۔

پلوشہ کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے کچن پاکٹ رول کا آمیزہ وہ بڑی مشاقی سے میدے کی بنی پاکٹس میں بھر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر دھیمی مسکان کھیل رہی تھی۔ تصور میں وہ سب کی داد و تحسین سمیٹ رہی تھی۔

میں نے کچن کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔ ثمینہ بھابھی بڑی مسرور سی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جہاں ساجد بھائی ہارن پر ہارن دے رہے تھے۔ مگر ان کے بڑھتے قدموں کو اچانک ہی میں نے بریک لگتے دیکھا۔ شیف رضیہ ایک دم ہی اپنے سنٹر سے نمودار ہوئی تھیں۔

''ارے کہاں جارہی ہو تم؟''

''میں ساجد کے ساتھ گروسری خریدنے جا رہی ہوں آنٹی۔'' ثمینہ بھابھی کو بروقت یہی بہانہ سوجھا تھا۔

''ارے چھوڑو گروسری۔ تمہیں اس دردسری کی کیا ضرورت ہے ابھی تمہاری ساس حیات ہے۔ یہ دیکھو! بچیوں نے کیا زبردست کوکنگ کی ہے۔ چکن کڑاہی، نگٹس فرائی اور یہ دیکھو ساتھ میں گارلک بریڈ بھی ہے۔ اب گھر میں پکانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ تم سب کی فرمائشیں روز پوری ہوا کریں گی اور خرچا بھی نہیں ہوگا۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ڈشز ثمینہ بھابھی کے ہاتھ میں منتقل کیں۔

''کپڑوں کی سلائی کڑھائی ڈیکوریشن پیسز کسی بھی معاملے میں تمہیں چنداں فکر کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ سب کچھ تم لوگوں کو بنا بنایا مل جائے گا۔ بس گھر کی صفائی ستھرائی تم تینوں مل جل کر کرلیا کرو۔''

پلوشہ کے ہاتھ سے رول چھوٹ کر گرا تھا۔ بھابھی کے چہرے پر چھائی مردنی اس نے صاف اپنی پھٹی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ شوکیس میں اپنے جہیز کے برتن سجاتی زیبا بھابھی کے ہاتھوں سے یقیناً کانچ کی کوئی چیز ٹوٹ کر بکھری تھی۔ جس کے چھناکے سے شیف رضیہ ایک دم ہی اندر کی طرف دوڑی تھیں۔

پلوشہ اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ کر وہیں سلیب پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ اس کے دکھی دل سے ایک دم ہی دعا نکلی کہ ایسی خود ساختہ ہنر مند و سلیقہ شعار ساس بھی نہیں ملنی چاہیے کہ جس کے ہاتھوں کا ہنر گلے کا ہار اور تن کا سنگار بن جائے۔ یہ اس کا ذاتی خیال ہے کسی کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆☆

بینش مجید ملک

ناولٹ

ہوئے جو تم مہرباں

"اشعر یار! تم یہاں ایسے اداس سے منہ لٹکا کر بیٹھے ہو؟ اور میں کب سے تمہیں باہر ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ کب سے کینٹین میں اپنی ہی سوچوں میں غرق سا بیٹھا تھا، جب سعد اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا اور اس کو اداس بیٹھے دیکھ بولا۔

"ہوں! تم اچھی طرح سے جانتے ہو میری اداسی کی وجہ۔" اشعر نے اس کی طرف زخمی نگاہوں سے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ایمان نہیں آئی؟" وہ جانتا تھا کہ اشعر بس صرف اس ایک وجہ سے ہی اداس ہوتا تھا۔

"ہاں یار! وہ آج پھر نہیں آئی۔ پتا نہیں وہ اتنی چھٹیاں کیوں کرتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کے آثار بہت واضح نظر آرہے تھے۔

"اوہ یار! تم کیوں اتنے پریشان ہوتے ہو، اس کو کوئی کام ہوگا یا شاید اس کی طبیعت خراب ہوگی موسم بھی تو بدل رہا ہے۔ اور ویسے بھی وہ ایسے بلاوجہ چھٹی نہیں کرتی۔" وہ اس کے احساسات وجذبات کو اچھی طرح سے جانتا تھا، اس لیے اب وہ اس کو بڑے رسان سے سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہوں! جانتا ہوں لیکن یار وہ مجھ سے بات بھی تو نہیں کرتی ناں۔" اس نے پھر بے چارگی سے بچوں کی طرح منہ لٹکا کر اس کے بات نہ کرنے کا شکوہ کیا۔ وہ کب سے خود پر ضبط کرکے بیٹھا تھا۔ لیکن اب سعد کے آتے ہی وہ ضبط ختم ہوگیا تھا، اور وہ اپنا دکھ بیان کرنے لگا۔ وہ سعد سے ہر بات بلاجھجک کرتا تھا۔

"بات تو وہ یونی میں کسی سے بھی نہیں کرتی۔ یہ بات تو تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو۔" سعد نے اس کی طرف دیکھ آہستہ سے کہا۔

"لیکن یار! اس کو مجھ سے تو بات کرنی چاہیے، تم جانتے ہو ناں میں اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوں، کتنا پیار کرتا ہوں میں اس سے۔" اس نے ٹوٹے سے لہجے میں کہا۔

"اشعر یہ بات میں جانتا ہوں، تم جانتے ہو لیکن ایمان نہیں جانتی اور جب تک تم اس کو بتاؤ گے نہیں وہ کیسے سمجھے گی۔" سعد نے بھی بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تو کیا اس کو بتانا ضروری ہے؟ وہ ایسے نہیں سمجھ سکتی میری فیلنگز کو؟ جبکہ سب جانتے ہیں کہ میں یعنی اشعر یزدانی اس کے پیار میں پاگل ہو چکا ہوں۔" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں یار! بتانا ضروری ہے کیونکہ محبت جس سے بھی ہو وہ اظہار چاہتی ہے۔ اور تم بھی اس سے اظہار کردو، پھر جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ نہ ہو کہ دیر ہوجائے۔"

"ہمم...... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ایمان سے ضرور بات کروں گا۔" اس نے پختہ فیصلہ کرکے اٹل انداز میں کہا۔

"گڈ! اب تم اپنا موڈ ٹھیک کرو اور چلو کلاس میں چلتے ہیں۔"

اشعر اور سعد دونوں بہت گہرے دوست تھے، اور ایم بی اے فائنل سمسٹر کے اسٹوڈنٹ تھے، اشعر عباد یزدانی اونچا لمبا، خوبرو، مگر بہت ضدی، ہٹ

دھرم، اور نہایت ہی غصیل نوجوان تھا، وہ اک بار جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تو کر کے دکھاتا۔ یونیورسٹی میں وہ بہت مشہور تھا، یونی میں اور اس کی فیملی میں بہت سی لڑکیاں تھیں جو اس کی شاندار پرسینلٹی پر مرتی تھیں لیکن وہ اپنی تعلیم اور دوستوں کی دنیا میں ہی مگن سا رہتا تھا۔ اس کے برعکس سعد سمان ہنس مکھ اور تھوڑا سا دھیمے مزاج کا نوجوان تھا، لیکن پھر بھی ان دونوں کی بہت بنتی تھی اور ہر کام میں وہ اشعر یزدانی کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ دو سال پہلے اشعر میں بہت زیادہ تبدیلیاں آئی تھیں اور وہ سب ایمان رحیم کی وجہ سے تھیں۔

ایمان رحیم ایم۔ اے اردو تھرڈ سمسٹر کی اسٹوڈنٹ تھی، جو بہت ہی سنجیدہ، کم گو اور ذہین تھی۔ جب وہ یونی میں آئی تھی تو وہ واحد لڑکی تھی جس نے اشعر عباد یزدانی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا، سادہ سے بلیک سوٹ میں ملبوس، بلیک اسکارف کا حجاب کیے،



بغیر میک اپ کے وہ اسے عام لڑکیوں سے بہت زیادہ مختلف اور خاص لگی تھی۔ اور تب سے اشعر یزدانی اس کے سحر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔

وہ اشعر یزدانی جو کبھی کسی لڑکی کو گھاس تک نہ ڈالتا تھا، اب وہ اس کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ لیکن ایمان رحیم ابھی بھی اس بات سے بے خبر تھی یا شاید وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی۔ ان کے پورے ڈیپارٹمنٹ کو، بلکہ یونی میں بھی سب کو پتا لگ چکا تھا کہ اشعر یزدانی، ایمان رحیم سے محبت کرتا ہے، اور اس کے لیے دیوانہ ہے۔ لیکن ایمان پر ابھی تک اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

آج وہ پھر یونیورسٹی نہیں آئی تھی وہ بہت چھٹیاں کرتی تھی اور یہ بات اشعر یزدانی کو بہت زیادہ پریشانی میں مبتلا کرتی تھی۔ وہ جس دن اس کو نہ دیکھتا اس کا دن نہیں گزرتا تھا، وہ بہت باہمت تھا کسی سے ڈرتا نہیں تھا لیکن پھر بھی جب وہ ہمت کر کے ایمان رحیم کو اپنی فیلنگز بتانے کی کوشش کرتا تب ہی اس کا سنجیدہ اور بے تاثر سا چہرہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیتا تھا اور وہ پھر سے پیچھے ہٹ جاتا لیکن آج اس نے پکا عہد کرلیا تھا کہ جب ایمان رحیم کل آئے گی تو وہ ہر حال میں اس سے اپنے دل کی بات کر کے ہی رہے گا۔

☆☆☆

وہ آج پھر یونیورسٹی نہیں جاسکی تھی۔

اس کا اہم لیکچر تھا اور ایچ او ڈی نے اس کو پہلے دن ہی وارن کردیا تھا کہ وہ چھٹیاں نہیں کرے گی اس بار۔ اور اس نے بھی وعدہ کرلیا تھا کہ وہ بغیر وجہ کے کوئی چھٹی نہیں کرے گی۔ لیکن جب وہ صبح یونی جانے کے لیے تیار ہوچکی تھی، تب اچانک ہی ڈرائنگ روم سے بچوں کے رونے کی، اور پھر ان کو غصے سے اونچی آواز میں چپ کروانی پروین آپا کی آواز اس کو اپنے کمرے میں سنائی دی۔ گویا پروین عرف پینا آپا اپنے دو عدد بڑے ہی شرارتی سے بچوں کے ساتھ تشریف لا چکی تھیں اور ان کے ساتھ ہی چھوٹی آپا شہرین عرف شیری بھی آچکی تھیں۔ ان دونوں کی شادی پھپھو کے گھر میں ہوئی تھی اس لیے وہ دونوں میکے میں بھی ساتھ ہی آتی تھیں۔ اور اگر آج وہ یونی چلی جاتی تو انہوں نے اس کو ہزار باتیں سنانی تھیں اس لیے اس نے اپنا یونی جانے کا ارادہ کینسل کیا کردیا اور اپنا سب کچھ سمیٹ کر ان سے ملنے کے لیے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ وہ دونوں جب بھی آتیں تو ان کے پاس ایک ہی موضوع ہوتا تھا، اور وہ تھا ایمان کی شادی۔

وہ ان دونوں سے مل کر دوپہر کا کھانا بنانے کے لیے کچن میں گھس گئی۔ بچوں نے الگ دھما چوکڑی مچائی ہوئی تھی۔ انہوں نے صحن اور ڈرائنگ روم کا حال برا کردیا تھا۔ کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی۔ وہ ان کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر کہتی تو ابھی آپا کی توپوں کا رخ اس کی طرف ہوجاتا اور بہت بڑا فساد کھڑا ہوجانا تھا جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ چپ سادھے اپنے کام میں لگی رہی۔ کچن میں کھڑی وہ بریانی کو دم لگا رہی تھی جب اس کو پینا آپا کی مخصوص تیز اور اونچی آواز جھنجلانے کے باوجود سنائی دی۔

''اماں! یہ مانو کب تک ایسے ہی پڑھتی رہے گی۔ اب اس کی شادی کردو۔ اس نے کون سا نوکری کرنی ہے۔ اور احمد علی کا رشتہ بہت اچھا ہے۔ کیا ہوا وہ اس سے تھوڑا بڑا ہے۔'' وہ اک دم سے ٹھٹک گئی۔

''تو اس بار آپا اس کے لیے اُس گنجے دو بچوں کے باپ احمد علی کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''پر پینا! وہ تو شادی شدہ ہے۔ اور دو بچوں کا باپ بھی ہے، یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے بھلا، مجھے تو تیری سمجھ نہیں آرہی۔'' صدیقہ نے بڑی بیٹی کی بات سن کر بڑی پریشانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تو کیا ہوگیا اماں! ایمان کون سا کنواری ہے۔ آپ شاید بھول رہی ہیں اس پر بھی تو داغ لگ چکا ہے جو اب کبھی نہیں دھل سکتا۔ یہ تو شکر کریں احمد

علی اپنی مانو سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا ہے اور بچوں کی تو خیر ہے کچھ نہیں ہوتا، ایمان عیش کرے گی اس گھر میں۔'' پینا آپا کے بولنے سے پہلے ہی شیری آپا جلدی سے بول پڑیں اور صدیقہ کو ایسے سمجھانے لگیں جیسے کہ وہ چھوٹی سی نا سمجھ بچی ہو۔ وہ دونوں آئی ہی شاید اسی مقصد کے لیے تھیں۔ بڑی بہنوں کے ایسے رویے کو دیکھ کر ایمان کو بہت زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی گہرا دکھ پھر سے جاگا تھا۔

''تمہارے بابا آجائیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔ لیکن مانو اس رشتے کے لیے کبھی بھی نہیں مانے گی۔ کیونکہ وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔'' اب کے انہوں نے تھوڑی رضامندی سے کہا، شاید وہ بھی ان دونوں کی بات مان چکی تھیں۔

وہ تو پہلے سے ہی ایمان کی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ لوگ ایمان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، جن کو پہلے تو صدیقہ بڑی خاموشی سے سن لیتی تھیں، پر اب وہ بھی لوگوں کی طنز سے بھری باتیں سن سن کر تھک چکی تھیں۔

''ارے اماں! آپ مانو کو چھوڑیں۔ وہ خود ہی مان جائے گی بس آپ بابا کو منائیں۔ اور ویسے بھی کون کرے گا اب اس سے شادی۔ وہ طلاق یافتہ ہے اور یہ بات ہماری برادری میں سب جانتے ہیں۔ اور برادری سے باہر رشتہ ہم نے کبھی کرنا نہیں۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اور ایمان بھی۔'' پینا آپا نے تیزی سے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں صدیقہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ان کی باتیں سن کر ایمان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

''پینا آپا! آپ لوگوں کو میری فکر کرنے کی یا میرے بارے میں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کمینے سے کبھی شادی نہیں کروں گی اور نہ ہی کسی اور سے کروں گی۔ پلیز، آپ یوں دوسروں کے سامنے میری بے قدری کرنا بند کر دیں۔ ایسے بے مول نہ کریں مجھے سب کے سامنے۔ میں اب آپ لوگوں کی باتیں سن سن کر تھک گئی ہوں۔ میں اس داغ کے ساتھ ہی اپنی ساری زندگی گزار لوں گی، لیکن آپ لوگوں کی باتیں اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔'' اس نے دھواں دھار روتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر اپنی دونوں بڑی بہنوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ایمان! تمہیں میرے سامنے ایسے ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں۔ ایسے رو کر اماں اور بابا کو تو تم اپنے جال میں پھنسا سکتی ہو لیکن مجھے کبھی نہیں۔ اور ہاں۔ اگر تم سے ہماری باتیں برداشت نہیں ہوتیں تو ہم سے بھی نہیں ہوتیں لوگوں کی طنز بھری فضول باتیں برداشت۔ اگر تم اتنی ہی اچھی ہوتیں تو بس کر دکھاتیں سب کو سگی خالہ کے گھر۔ یوں طلاق کا دھبا نہ لگواتیں اپنے ماتھے پر اور نہ ہی ہم سب کو اور بابا کو یوں ذلیل کرواتیں سب کے سامنے۔'' پینا آپا نے انتہائی غصے میں اپنی تیز پاٹ دار آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر جو بولنا شروع کیا تو پھر بولتی ہی چلی گئیں۔

ایمان ان کی باتیں سن کر جہاں کھڑی تھی وہیں ڈھے گئی یہ اس کی سگی بڑی بہن تھیں، لیکن اس کی ذات کے پرخچے وہ غیروں کی طرح اڑا رہی تھیں۔ اس کی روح پر لگے زخم کو کرید رہی تھیں اور اک بار پھر سے اس کے زخم ادھڑ گئے تھے۔ بہت مشکل سے اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی اور اپنے بے جان ہوتے وجود کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

رات کو کھانا کھانے کے لیے بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ شیری آپا اس کے کمرے میں اس کو کھانا دینے گئیں تو وہ بہت برے حال میں تھی۔ اس کو دیکھ کر شیری کے دل کو کچھ ہوا تو وہ بھی بہت دکھی ہو گئیں انہوں نے ایمان کو گلے لگا کر پیار سے تسلی دی اور سمجھا بجھا کر کھانا کھلایا۔ وہ بولتی بے شک بہت زیادہ تھیں لیکن دل کی بہت اچھی تھیں۔

[illegible] ایمان [illegible] پاس [illegible] باتیں کرتی، ایمان وہ خاموش سی پتھر کا بت بن کر سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی ساری ہمت جواب دے گئی تھی۔

رحیم احمد اک سرکاری اسکول میں کلرک تھے، وہ بہت سنجیدہ، کم گو، غصیلے اور بد دماغ انسان تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی غصہ ہو جانا ان کی پرانی عادت تھی۔ وہ جو بھی بات کر دیتے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں ان کی بہت چلتی تھی سارے فیصلے وہ ہی کرتے تھے، ان کے خاندان میں رواج تھا کہ وہ برادری سے باہر شادی نہیں کرتے تھے چاہے ان کی بیٹیاں گھر میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اور وہ آج بھی اپنے پرانے اور روایتی قسم کے رسم ورواج میں جکڑے ہوئے تھے۔ جن سے انحراف انہیں پسند نہیں تھا۔ گاؤں میں ان کی زمین بھی تھی جس سے ان کا گزر بسر بہت اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ وہ لوگ دو بہن بھائی تھے، بہن ان سے بڑی تھی اس کے ساتھ ان کی دونوں بڑی بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کے اپنے چار بچے تھے تین بیٹیاں پروین، شہرین اور ایمان اور ایک بیٹا آذر تھا جو صرف چند دن کا ہی تھا جب اس کا انتقال ہو گیا جس کا ان کو بہت زیادہ دکھ تھا، اور وہ اپنی بیوی صدیقہ سے بھی اسی وجہ سے کھنچے کھنچے رہتے تھے کہ وہ ان کو اولاد نرینہ نہیں دے پائی تھیں جس کی ان کو شدید خواہش تھی۔

ان کی بیوی صدیقہ بہت سگھڑ، سلیقہ شعار، صلوۃ وصوم کی پابند اور بڑی صابر خاتون تھیں۔ صدیقہ کی اک بہن اور بھائی اس سے بڑے تھے جو گاؤں میں رہتے تھے، لیکن وہ لوگ گاؤں میں کم ہی جاتے تھے، رحیم احمد کی دونوں بڑی بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش حال زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ایمان تھی جو بالکل اپنی ماں پر گئی تھی بہت ہی نیک دل، صلوۃ وصوم کی پابند اور خوب صورت، لیکن اس کا نصیب اس جیسا نہیں تھا، بہت دکھ دیکھ چکی تھی وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں۔ اس بات کا صدیقہ کو بہت دکھ تھا۔

☆☆☆

وہ صبح سے ہی اپنے ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا......!

لیکن ایمان ابھی تک نہیں آئی تھی، اس کی بے تاب نظریں اردو ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کی طرف جمی ہوئی تھیں جب اچانک ہی وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نظر آئی، اپنے چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور معصومیت سجائے وہ اپنی مخصوص چال چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کو نظر آئی وہ سب کچھ نظر انداز کرتا تیزی سے اس کی طرف بڑھا...... اور پھر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جو اپنے ہی دھیان میں چل رہی تھی اس کو اپنے سامنے ایستادہ دیکھ کر چونک کر سیدھی ہوئی۔

''کیسی ہیں آپ؟ آپ نے چھٹی کیوں کی؟ بتایا بھی نہیں؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے بڑی بے تابی سے اس کے کندھوں کو تھام کر اس کے چہرے کو والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے تابڑ توڑ سوال کر دیے۔ وہ راستے میں کھڑے تھے اس لیے وہاں سے گزرتے ہوئے اسٹوڈنٹ بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایمان نے اک ناگوار سی نظر اس پر ڈالی اور پھر ادھر اُدھر دیکھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے مسٹر اشعر؟ آپ کو شرم آنی چاہیے اک غیر لڑکی کو یوں بیچ راستے میں روک کر ایسا کرتے ہوئے اور آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے ایسے سوال کرنے والے۔ مجھے چھونے کی آپ کو ہمت کیسے ہوئی؟'' اس کو غصے میں اوور ری ایکٹ کرتے دیکھ کر اشعر کو بھی اپنی غلطی کا فوراً احساس ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''اور ہاں مسٹر اشعر یزدانی! آپ کو شاید اپنی عزت کا خیال نہیں لیکن مجھے اپنی عزت بہت زیادہ عزیز ہے جو آپ کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ نیکسٹ ٹائم آپ میرے پاس آنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اور میں

آپ کی شکایت اپنے ایچ او ڈی سے کروں گی۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں وہ اس معاملے میں کتنے اسٹرک ہیں۔'' ایمان نے بغیر اس کی طرف دیکھے بڑے ہی غصے میں تنبیہہ کی اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

وہ ابھی تک رات والا غم ہی نہیں بھولی تھی کہ اس کو اک نیا دکھ مل گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اشعر یزدانی ایسا کرے گا، لیکن آج اس کی یہ سوچ بھی غلط ثابت ہوگئی، سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں اور یہ بات اب اس کے دل و دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔

اشعر ابھی بھی اُدھر ہی ساکت سا کھڑا تھا، اس کو خود پر بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا، وہ ایمان کے لیے بہت پریشان تھا اس لیے جب وہ اس کے سامنے آئی تو وہ بہت زیادہ بے قراری اور بے چینی سے اس کی طرف بڑھا، اور اسی بے تابی میں ہی اس نے بیچ راستے میں ایمان کو روک لیا۔ ورنہ عام حالات میں وہ ایمان کو یوں بیچ راستے میں روکنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سچ کہتے تھے لوگ جذبات میں کیے گئے فیصلے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ بات اس کو آج پتا لگ چکی تھی۔

''ایمان کو میری یہ حرکت بہت بری لگی میں اس سے سوری کروں گا۔ میں نے غلطی کی ہے میں ہی اس کو سدھاروں گا۔'' اس نے بھی وہیں کھڑے کھڑے سوچا اور ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ کلاس روم میں جانے کے بجائے، لائبریری میں آ گئی۔ وہاں رش بہت کم تھا، وہ کونے والی میز پر الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اشعر یزدانی کی آج والی حرکت پر اسے بہت زیادہ دکھ ہو رہا تھا وہ اتنے لوگوں کی شک بھری نگاہوں کو اپنی طرف اٹھا دیکھ کر بہت زیادہ گلٹی فیل کر رہی تھی۔ اس نے باہر بہت ضبط کر کے اپنے آنسو روک رکھے تھے لیکن اندر تنہائی ملتے ہی اس کے رکے ہوئے آنسو چھلک پڑے، اور پھر آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے جاری ہو گیا، اس نے روتے روتے اپنا سر میز سے ٹکا دیا، یہ زندگی اس کے لیے بہت کٹھن اور تلخ ہو گئی تھی جو اس کو اک ایسے موڑ پر لے آ گئی تھی، جہاں پر کھڑے ہو کر اگر وہ آگے کی طرف دیکھتی تو اس کو دور دور تک صرف اندھیرا ہی اندھیرا سا دکھائی دیتا تھا، اور اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو وہاں درد ہی درد، روح و جسم پر لگے گہرے گھاؤ اور تکالیف کا اک سمندر تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس تلخ ماضی سے پیچھا نہیں چھڑوا پا رہی تھی۔

روتے روتے اچانک ہی اس کو اپنے پاس کسی کے بیٹھنے کا احساس ہوا، تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اشعر یزدانی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا، بہت غور سے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو ایمان نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔

''ایم سو سوری ایمان! میں نے جو بھی کیا بہت غلط کیا، مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنے کیے پر بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔'' اشعر نے رخ پھیر کر بیٹھی ایمان کی طرف دیکھا پھر آہستگی اور شرمندگی سے اس نے معذرت کی۔

''آپ کو سوری کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا اور یہ سب آپ کو وہ حرکت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، انسان کو ہمیشہ وہ کام کرنے چاہئیں جن کو کرنے سے اس کو کبھی شرمندگی نہ ہو، اور جس کام کو کر کے انسان کو شرمندہ ہونا پڑے، اور لوگوں سے معافی مانگنی پڑے وہ کام اس کو کبھی نہیں کرنے چاہئیں۔'' ایمان نے اپنے آنسو صاف کر کے نم آلود آواز میں بڑی تلخی سے کہا۔

''ایکسٹریملی سوری! اگین ایسا کچھ نہیں ہوگا آئی پرامس۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ کیوں کر رہے ہیں یہ سب؟ مجھے بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

ایمان کو اب اس کے رویے سے پریشانی

ہونے لگی تھی، کیونکہ وہ بہت بدل گیا تھا جب وہ یونی آئی تھی وہ ایسا نہیں تھا وہ تو بڑا ضدی، اکڑو اور مغرور قسم کا تھا اور اب اس کے سامنے بیٹھا اشعر تو کوئی اور ہی تھا جیسے۔ اس لیے اس نے تعجب سے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''کیونکہ میں پیار کرتا ہوں آپ سے اور آپ کو ہرٹ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں پر اتار چڑھاؤ واضح نظر آرہا تھا۔

''ہونہہ پیار......؟'' اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر بڑی تلخی سے کہا۔ اس کے چہرے پر درد کی لہر دوڑ گئی تھی جو اشعر سے چھپی نہیں رہ سکی۔

''جی ہاں پیار۔'' اس نے پھر سنجیدگی سے کہا۔ اور اس کے چہرے کی طرف بہت پیار سے دیکھا۔ جو آنسوؤں سے تر، لیکن ابھی بھی بے تاثر تھا۔

''کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟ اور کیوں کرتے ہیں آپ مجھ سے پیار۔؟'' اس نے بڑی تلخی سے پوچھا۔

''میں آپ کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ میری یونی فیلو ہیں، اور اس سے زیادہ آپ کے بارے میں جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں، لیکن میں اپنے بارے میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں آپ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور محبت کرتے کرتے اب میں اتنا زیادہ آگے بڑھ چکا ہوں، اب اگر میں یہاں سے پیچھے ہٹنے کا سوچوں بھی تو مجھے اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے میرا، اور مجھے اپنی جان نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس موڑ پر کھڑا ہوں کہ اب اگر کوئی چاہے بھی تو مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کرسکتا، آپ بھی نہیں......'' اس نے بڑے جذبے سے، دھیمے لہجے میں سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

خاموشی سے اس کی طرف دیکھ کر سر جھکا گئی۔

اسے اشعر کے ایک ایک لفظ میں سچائی نظر آرہی تھی ساری باتیں سننے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے اٹھی اور بغیر اس کی طرف دیکھے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لائبریری سے باہر نکل گئی۔ لیکن اشعر کی حیران نظروں نے دور تک ایمان کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

''کیا سوچ رہے ہو یار؟'' وہ لان میں بیٹھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا جب ڈاکٹر عباد یزدانی نے لان میں آکر اس کی سوچوں کا تسلسل توڑا اور بڑے دھیمے سے لہجے میں اشعر سے استفسار کیا۔

ان دونوں باپ بیٹے میں بہت دوستی تھی وہ ہر بات بلا جھجک اپنے باپ سے کہتا۔ اور اس نے ایمان کے بارے میں بھی ہر ہر بات ان کو بتائی ہوئی تھی۔

''پاپا آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں میں کس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' اس نے اضطراب سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئے اور بڑے غور سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھنے لگے، جو ایسا روگ لگا چکا تھا جس کا علاج وہ بہت بڑے ہارٹ سرجن ہو کر بھی نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اس کا علاج کسی اور کے پاس تھا۔

''ہمم......! جانتا ہوں تم نے بات کی کہ نہیں ایمان سے؟'' انہوں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پر سوچ انداز میں پوچھا۔

''جی پاپا! کی تھی بات، لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' اس نے پریشانی سے کہا اور آج والی ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

''اشعر! یہ بہت غلط حرکت کی ہے۔ بیٹا لڑکی کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہی ہوتی ہے جس پر وہ فخر کرسکتی ہے اور اس کو وہ بہت سنبھال کر رکھتی ہے۔'' انہوں نے ساری بات سن کر بڑے تاسف سے کہا۔ اشعر نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''سوری پاپا! میں نے ایمان سے بھی سوری کی

ہے۔آئندہ ایسا نہیں ہوگا پاپا...... پلیز، آپ تو غصہ نہ ہوں۔'' وہ ڈاکٹر عباد کے دونوں ہاتھ پکڑ کر منت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں ناراض نہیں ہوں میری جان، تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور ویسے بھی انسان غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے۔''

''جی پاپا......'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''اگر تم کہو تو میں بات کر کے دیکھوں ایمان سے۔شاید وہ میری بات سمجھ جائے۔'' انہوں نے بیٹے کے پریشان چہرے کو دیکھ کر پیار سے پوچھا۔وہ اس کو دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''نہیں پاپا۔ یہ میرا کام ہے اور اس کو میں ہی کروں گا۔ آپ بس دعا کریں۔'' اس نے اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

''میری جان! پریشان نہ ہونا میں تمہارے ساتھ ہوں، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ جہاں بھی تمہیں میری ضرورت پڑے مجھے فوراً بلا لینا۔'' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اشعر کو اپنے ساتھ لگالیا۔وہ بھی ان کے گلے لگ گیا۔

وہ بہت خوش قسمت تھا جو اس کو ڈاکٹر عباد یزدانی جیسا باپ ملا تھا جو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ زہرہ بیگم کی وفات کے بعد وہ دونوں ہی تھے جنہوں نے اک دوسرے کا ہر غم بانٹا اور پھر دونوں ہی زندگی کی طرف بڑھے تھے۔

''جی ٹھیک ہے! میں کل ہی ایمان سے بات کروں گا۔''

☆☆☆

وہ ساڑھے تین بجے لیکچر لے کر کلاس سے باہر نکل آئی، آج تھرڈ لیکچر نہیں ہوا تھا۔ اب تھرڈ سمسٹر سٹارٹ ہوا تھا تو کلاس ٹائمنگ بھی چینج ہو گئی تھی، آج جب وہ آئی تھی تو اشعر کہیں بھی نہیں تھا، وہ یہ دیکھ کر بہت مطمئن تھی، لیکن جیسے ہی وہ کلاس سے باہر آئی اس کو کلاس روم سے باہر کوریڈور میں ٹہلتے دیکھ کر وہ پھر سے پریشان ہو گئی اور اس کا تھوڑی دیر پہلے والا اطمینان غائب ہو گیا۔ وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر کوریڈور میں سے اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اشعر نے آہستہ سے اس کو پکارا۔

''ایمان! میں آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز، اک بار میری بات سن لیں۔''

اشعر کی بات سن کر اس کے قدم ٹھٹکے لیکن وہ رکی نہیں اور نہ ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بس ''اوکے'' کہہ کر اس نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ اور اردو گراؤنڈ میں ایک سائڈ پر بنے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہاں رش بہت کم تھا۔ وہ آخری بار اس سے بات کر کے اس کو سمجھانا چاہتی تھی اس لیے اس نے بھی بات کرنے کی ہامی بھر لی۔

اشعر یزدانی بھی اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔

''آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں وہ بتا دیں؟''

''میں آپ سے آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، ایسا کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ جو آپ ایسی ہو گئی ہیں۔ آپ کی ویران آنکھوں، سنجیدہ اور بے تاثر چہرے کے پیچھے ایسا کون سا راز دفن ہے، جو آپ کو کسی سے گھلنے ملنے نہیں دیتا۔ پلیز، بتائیں مجھے۔''

وہ جو بڑی بے دردی سے اپنے ہاتھوں کو مسل رہی تھی اس کی بات سن کر اک دم سے اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر سختی در آئی۔

''کیوں؟ آپ کیوں پوچھنا چاہتے یہ سب؟ اور آپ کیوں کر رہے ہیں ایسے...... کیوں بڑھا رہے ہیں آپ میرے لیے مشکلیں...... آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہو سکتا، پھر بھی آپ کیوں آ جاتے ہیں بار بار میرے راستے میں؟'' اس نے غصے سے تیوری چڑھا کر کہا اور کھڑی ہو گئی۔

اشعر جو اس کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا وہ اس کو کھڑے ہوتے دیکھ کر اس کی طرف بڑھا اور

بہت ہی نارمل انداز میں بولا۔
''میں آپ کی مشکلیں نہیں بڑھا رہا۔ میں تو آپ کے بارے میں جان کر آپ کے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی زندگی خوشیوں سے بھر کر، آپ کے اس بے تاثر سے چہرے پر مسکراہٹ لانا چاہتا ہوں، اور آپ کی ان بے رونق سی آنکھوں کی رونق دوبارہ سے لوٹانا چاہتا ہوں۔ پلیز، مجھے بتائیں کریں اپنے بارے میں۔
''ایمان دم بخود سی کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر بپھر گئی۔
''میں اپنے بارے میں کسی سے بھی کچھ بھی ڈسکس نہیں کرتی۔ اور ہاں...... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ آپ کو میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنا کام کریں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ دیر ہو رہی ہے مجھے، میں نے گھر جانا ہے۔'' اس نے انتہائی درشتی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ لیکن اشعر پھر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔
''لیکن میں پھر بھی آپ سے پوچھ کر ہی رہوں گا اور آپ کو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔'' وہ اب پھر سے پہلے دن والا ضدی سا اشعر بن گیا تھا۔ جس کو ایمان نے پہلے دن یونی میں دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے تنا کھڑا تھا۔ اس نے اک نظر اشعر کو گھور کر دیکھا اور دوبارہ جا کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ اب وقت آ گیا تھا۔ اشعر یزدانی کو سب کچھ بتانے کا اگر وہ اس کو کچھ نہیں بتاتی تو بھی اس نے بار بار ضد کر اس کو بیچ راستے میں روکتے ہی رہنا تھا اور اب وہ خود کو اور زیادہ تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔
''آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں مجھ سے...... ہے ناں؟'' اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے بہت عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔
''ہاں۔'' اشعر نے مختصر سا جواب دیا اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگ گیا۔
''تو کیا آپ ایک ایسی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں جو طلاق یافتہ ہے، جس کے ماتھے پر طلاق کا بدنما داغ لگا ہوا ہے۔ اک ایسی لڑکی جس کو اس کے شوہر نے ہی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہو، جس کی روح پر زخموں کے ساتھ ساتھ، اس کے جسم پر بھی ہزاروں زخم ہیں، کیا آپ ایسی لڑکی سے شادی کریں گے؟''
اس نے وہیں بینچ پر سر جھکا کر بیٹھے ہوئے درد و کرب سے کہا۔ اس کی باتیں سن کر وہ ششدر رہ گیا، اس کو بہت بڑا جھٹکا لگا تھا اتنے بڑے انکشاف پر۔ اس کو اپنا سر اک دم سے چکراتا محسوس ہوا، کچھ دیر تو وہ یوں ہی شاکڈ سا کھڑا خلا میں گھورتا رہا۔
''جواب دیں! اب کیا ہوا آپ کو...... کہاں گئی آپ کی سو کالڈ محبت؟ لگا نہ بہت بڑا جھٹکا آپ کو؟''
اس نے ایسے ہی روتے ہوئے سر اٹھایا اور اپنے آنسوؤں کو بڑی بے دردی سے صاف کر کے اس کو شاکڈ کھڑے دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔
اشعر اس کی طنز میں ڈوبی باتیں سن کر صدمے سے باہر نکلا اور پھر ایسے ہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔
''ایمان۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ میں بیچ راستے میں چھوڑ کر بھاگ جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور نہ ہی میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے ہوں۔ میں نے جو اک بار کہہ دیا وہ پتھر پر لکیر ہے۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ لیکن ایمان سر جھکائے آنسوؤں کو اپنے اندر اتارنے کی ناکام کوشش کرتی رہی بولی کچھ نہیں۔
''ایمان میں آپ سے سب کچھ تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔ پلیز، یقین کرو میرا میں کبھی بھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو پلیز بتائیں۔'' وہ ایمان کی خاموشی دیکھ کر منت بھرے لہجے میں اس سے گویا ہوا۔
''میں اپنے زخم اور درد کسی کو نہیں بتاتی اشعر۔

پلیز، آپ سمجھیں اور مجبور مت کریں۔'' اس نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے اشعر کو دیکھ کر منت بھرے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں آپ کے ہر درد کو لیکن ایسے کیوں ہوا؟ کیا وجہ تھی اس سب کی؟ میں وہ سب جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے ایمان کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر ری سے پوچھا۔

''جو بھی ہوا میرے ساتھ شاید وہ ہی میری قسمت میں تھا۔ میں دو سال سے اس درد کو اپنے دل میں چھپا کر پھر رہی ہوں۔ کبھی کسی کو نہیں بتایا، بہت تکلیف ہوتی ہے مجھے جب لوگ مجھ پر جملے کستے ہیں۔ دل پھٹتا ہے میرا جب میری سگی بہنیں میرے کردار پر انگلی اٹھاتی ہیں۔ مجھے برا بھلا کہتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے میں ختم کرلوں خود کو یا پھر یہ چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔'' وہ بڑے کرب سے بول رہی تھی اس کے اک اک لفظ میں درد تھا جو اشعر کو اپنے دل میں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''سادہ مزاج میں ہمیشہ سے تھی۔ دو سال پہلے بھی میں ایسی ہی تھی۔ نہ میں کسی قسم کے فیشن کرتی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی سیل یوز کیا تھا، نہ ہی میرے پاس ان سب کاموں کے لیے اتنا وقت ہوتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا تو اس لیے میرے پاس کتابوں کا ڈھیر تھا۔

میں نے بی۔ اے کیا، ابھی میں نے ایم۔ اے میں داخلہ لینا ہی تھا کہ اچانک ہی میری بڑی اکلوتی خالہ میرے ماموں کو ساتھ لے کر میرے رشتے کے لیے پہنچ گئیں، انہوں نے بہت منتیں ترلے کیے اور پھر میرے امی ابو میرے بڑے ماموں کے سامنے زیادہ دیر تک اپنی ضد پر قائم نہ رہ سکے اور رشتے کے لیے مان گئے۔ مجھ سے کسی نے بھی نہ پوچھا لیکن پھر بھی مجھے اس بات کا دکھ نہیں تھا میں تو بس آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اور میری خالہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے آگے پڑھا دیں گی۔ بس اسی وجہ سے میں بھی خوش ہوگئی۔ اک ماہ کے اندر اندر ہی میرا رشتہ طے ہوگیا اور شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہوگئی اور تیاریاں شروع ہوگئیں۔ لیکن میرا معمول پہلے والا ہی تھا، نہ مجھے شادی سے دلچسپی تھی اور نہ ہی مجھے ان باتوں کی کچھ سمجھ بوجھ تھی۔

ایک دن ہمارے گھر میرا کزن (منگیتر) آیا، میں نے اس کو نہیں دیکھا ہوا تھا (کیونکہ ہم گاؤں نہیں جاتے تھے) تب اچانک ہی میری نظر اس پر پڑی تو میں دنگ رہ گئی۔ وہ بہت عجیب سا تھا اس کے لمبے بال، گلے اور ہاتھوں میں چین کے علاوہ لال و ہری ڈوریاں پہنے ہوئے وہ بہت آوارہ قسم کا لگ رہا تھا اور بڑی عجیب سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا میں تو ڈر کر کمرے میں چھپ گئی، میری آپی نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں دیکھنے آیا ہے لیکن میں نے اس کے سامنے جانے سے انکار کردیا۔ میری آپی نے اس کو بتایا اور یہی بات اس کو بہت بری لگی، وہ وہاں سے چلا گیا۔

پھر اس نے مجھ سے بدلا لینے کے لیے خود کو بالکل بدل لیا، اس نے بال کٹوا دیے، ہاتھوں اور گلے کی چین اور ڈوریاں بھی اتار دیں۔ پانچ وقت کا نمازی بن گیا۔ جیسی میں تھی وہ ویسا ہی بن گیا۔ مجھے اسلامی کتابیں پسند تھیں تو وہ بھی پڑھنے لگ گیا وہ مجھے بھی وہی کتابیں تحفے میں بھیجتا اور میں اس کو اتنا بدلا ہوا دیکھ کر حیران ہوگئی۔

شادی کا دن قریب آگیا میرے والدین نے میری خالہ سے کچھ بھی نہیں لیا تھا سب کچھ خود دیا۔ جب رخصتی کے بعد میں گاؤں پہنچی تو حیران رہ گئی، وہاں تو کوئی شادی کا ماحول ہی نہیں لگ رہا تھا۔ میری خالہ کی نند کی بیٹیاں مجھے اک بڑے سے کمرے میں اکیلی کو بٹھا کر چلی گئیں۔ ڈر کے مارے میرا برا حال تھا۔ نہ کوئی اسٹیج بنایا گیا اور نہ ہی اچھے طریقے سے میرا استقبال کیا گیا۔

چند ایک رسموں کے بعد مجھے میرے کمرے میں بھیج دیا گیا، میں کمرے میں بیٹھی شعیب کا انتظار

کر رہی تھی جب اچانک ہی زوردار آواز سے دروازہ کھلا اور وہ اندر آیا، وہ پھر سے اپنے پہلے والے حلیے میں آچکا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت اور جنون سوار تھا، کمرے میں آتے ہی وہ زور زور سے چلانے لگا اس نے مجھے بتایا کہ کیسے اس نے مجھے اچھا بن کر دکھایا اور کیسے اب وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گا مجھ سے۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچ کر بیڈ سے اٹھایا تو میری چیخیں نکل گئی، وہ مجھے مار رہا تھا اور جیسے جیسے وہ مجھے مارتا ویسے ہی زور زور سے ہنس بھی رہا تھا۔ پاگل ہوگیا تھا وہ۔ اور ہر طرح سے مجھے ٹارچر کر رہا تھا میں نے بہت کوشش کی خود کو چھڑوا کر کمرے سے باہر نکلنے کی لیکن بے سود۔ اس نے پوری رات مجھے اپنی وحشت اور عتاب کا نشانہ بنایا اور پھر سو گیا لیکن میں سو نہیں پائی تھی۔ رو رو کر میں ہلکان ہوگئی میرا دل چاہتا تھا میں وہاں سے بھاگ جاؤں ڈر لگنے لگا تھا مجھے اس سے، اس کو پاگل پن کا دورا پڑتا تھا یہ بات ہمیں بعد میں پتا لگی تھی۔

میں وہاں صرف اک ماہ رہی اور اک ماہ میں نے وہاں کس تکلیف اور اذیت میں گزارا یہ صرف میں ہی جانتی ہوں، وہ ہر رات ایسے ہی کرتا تھا اور پھر بے ہوشی کا ناٹک کرتا، اسے پیروں فقیروں کے پاس لے جایا جاتا اور پھر دم کروائے جاتے۔ میں وہ سب سہہ سہہ کر ڈپریشن اور ٹینشن کا شکار ہوگئی۔ بی پی لو رہنے لگا تھا۔

پھر اک ماہ کے بعد میں اپنے گھر واپس آگئی، مجھے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے، میری ایک ہی رٹ تھی کہ میں نے اب اس گھر میں واپس جانا ہی نہیں۔ میرے والدین بھی میرے لیے بہت زیادہ پریشان تھے۔ میری خالہ نے ہمیں شعیب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے انہوں نے ہی ہمیں دھوکے میں رکھا تھا۔ دو ماہ ذہنی اور جسمانی اذیت سہنے کے بعد میری طلاق ہوگئی۔ پوری برادری نے مجھے برا بھلا کہا۔ لیکن میں نے خاموشی سادھ لی۔

دو سال ہوگئے ہیں لیکن وہ اذیت نہیں بھولی میں۔ میری آنکھوں کی ویرانی، اور میرے چہرے کی سنجیدگی اسی وجہ سے ہے۔ میں ڈپریشن کا شکار ہوں ہر وقت بیمار سی رہتی ہوں۔

''اس نے دھواں دھار روتے ہوئے خود پر بیتی تکلیفوں اور اذیتوں کے بارے میں سب کچھ بیان کردیا۔''

اشعر وہ سب کچھ سن کر سکتے میں آگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایمان نے اتنا کچھ برداشت کیا، وہ اتنا زیادہ درد اپنے اندر چھپا کر پھر رہی تھی کسی کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ایمان آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گود میں دھرے اس کے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے، لیکن پھر بھی وہ خاموش سا بیٹھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا کہ ایمان بہت اذیت سے گزر رہی تھی اس کو سب کچھ بتا کر۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور ایمان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ مگر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''ایمان! تمہارے ساتھ جو بھی ہوا مجھے اس کا بہت افسوس ہے، یہ جو بھی ہوا سب اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش تھی جس پر تم پوری اتری ہو، اللہ نے تمہیں آزمانے کے بعد اب اس دکھ سے نکالنے کا راستہ بھی دکھایا۔ تم اس راستے کو چن لو پلیز۔''

ایمان جو سر جھکائے رونے میں مصروف تھی، وہ اس کی بات سن کر چونکی اور پھر اس نے نا سمجھی والے انداز اس کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے نیچے گھاس پر دو زانو بیٹھا، اپنی آنکھوں میں محبت کا اک جہاں آباد کیے اس کو ہی تک رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں کچھ۔'' وہ بڑی مشکل سے نم آواز میں بولی۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' اس نے ایمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو پرپوز کیا۔ تو وہ حیرانی سے اس کو دیکھ کر بڑی تلخی سے بولی۔

''اب بھی......؟''

’’ہاں اب بھی......‘‘ اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

’’لیکن ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ نہ میرے گھر والے مانیں گے اور نہ ہی اب میں شادی کرنا چاہتی ہوں اور آپ بھی اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دیں۔ مجھے گھر جانا ہے بہت ٹائم ہوگیا۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں کہا اور بغیر اس کی طرف دیکھے وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

’’لیکن میں منا کر ہی رہوں گا آپ کے گھر والوں کو یہ میرا وعدہ ہے آپ سے، اب میری آپ سے تب ہی بات ہوگی جب آپ میری بن کر میرے گھر آئیں گی۔‘‘ وہ بھاگ کر اس کے سامنے آیا اور اپنی بات پوری کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا۔ وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا اس نے بھی اب کر کے دکھانا تھا جو وہ کہہ کر گیا تھا۔

☆☆☆

’’پاپا! میں ایمان کو ایسے حال میں نہیں دیکھ سکتا، وہ بہت زیادہ پریشان ہے، اور میں اس کی ہر پریشانی کا درماں بننا چاہتا ہوں۔ پلیز آپ منائیں اس کے گھر والوں کو۔‘‘ اس نے عباد یزدانی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ وہ ان کو ساری بات بتا چکا تھا جس کو سن کر وہ بھی بھی بہت دکھی ہوگئے تھے۔

’’ٹھیک ہے! میں کل جاؤں گا اس کے گھر۔‘‘ انہوں نے اس کے چہرے کو تھپتھپا کر کہا تو وہ خوشی سے ان کے گلے لگ گیا۔

’’پاپا! یو آر سو گریٹ، لو یو سو مچ پاپا۔‘‘ اس نے بڑے پیار سے ان کو بانہوں میں بھر کر کہا تو وہ بھی اس کی بچکانا حرکت پر مسکرا کر بولے۔

’’لو یو ٹو میری جان۔‘‘ پھر انہوں نے سیل اٹھا کر کسی کو کال ملائی، پہلی بیل پر ہی کال پک ہوگئی۔

’’عاصم! مجھے رحیم احمد کے بارے میں پوری تفصیل چاہیے۔ وہ گورنمنٹ اسکول کے کلرک ہیں اور ہاں یہ کام کل صبح تک ہوجانا چاہیے۔‘‘

پھر انہوں نے اپنے پاس بیٹھے غور سے باتیں سنتے اشعر سے اپنے کمرے میں جانے کو کہا تو وہ بھی بغیر بحث کیے وہاں سے اٹھ گیا۔

’’اوکے پاپا گڈ نائٹ......‘‘ اس نے آہستہ سے کہا اور ڈاکٹر عباد کے کمرے سے نکل گیا۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا اور اس کے دماغ میں ایمان کی باتیں چل رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے بیڈ سے ٹیک لگا کر نیچے کارپٹ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

آج اس نے اشعر کو سب کچھ بتا دیا تھا گو یا وہ سب بتانا اتنا آسان نہ تھا لیکن پھر بھی اس نے اشعر کے سامنے مجبور ہو کر اس کو بتا دیا۔ وہ حیران تھی کہ اب وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی لیکن اس کو ڈر بہت لگا تھا اشعر کی دیوانگی سے۔

وہ جب پہلے دن یونی گئی تھی تو اس کی نظر بلاارادہ ہی اشعر پر گئی وہ سامنے ہی انٹرنس پر کھڑا اپنے کسی دوست کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، کچھ دیر کے بعد چند لڑکیوں کا ٹولا اس کے پاس گیا تو اس کی ہنسی کو اک دم سے بریک لگ گیا اور پھر وہ غصے میں آگیا، وہ کیوں غصہ ہوا تھا وہ نہیں جانتی تھی اس کی کلاس کا وقت تھا اس لیے وہ وہاں سے چلی گئی، لیکن بعد میں اس کو پتا لگا کہ وہ شہر کے مشہور و معروف ہارٹ سرجن عباد یزدانی کا اکلوتا ہونہار سپوت اشعر یزدانی ہے جو بہت ضدی، اکڑو اور مغرور ہے۔ اس نے بہت سی لڑکیوں کو اس کے بارے میں باتیں کرتے اور اس کے لیے آہیں بھرتے دیکھا تھا لیکن وہ ان سب سے انجان اپنے آپ میں اور دوستوں میں مگن ہوتا تھا۔

ایک ہفتے بعد اس کی بھی اشعر سے باقاعدہ طور پر ملاقات ہوئی، وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی تو سیڑھیوں کے پاس کھڑے اشعر نے بھاگ کر اس کو تھام لیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک وہ اس

کے پیچھے ہی تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی مرد کے بارے میں نہیں سوچا تھا سوائے شعیب کے (وہ بھی شادی کے بعد)، لیکن پتا نہیں کیوں اشعر کا خیال ہر بار اس کے دل میں آجاتا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی آج وہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز بتا آئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی سچ سننے کے بعد وہ پیچھے ہٹ جائے گا لیکن وہ غلط تھی، وہ تو بہت آگے تک سوچ چکا تھا۔

اشعر اس سے پیار کرتا ہے وہ اچھی طرح سے جانتی تھی اس کی بے تابیاں اور بے چینی وہ دیکھتی تھی، لیکن سب جاننے کے باوجود بھی انجان بنی رہی کیونکہ وہ اشعر کو کوئی امید نہیں دلانا چاہتی تھی۔ برادری سے باہر رشتہ کرنے کا ان کا رواج نہیں تھا اور وہ اپنے گھر والوں کی ضد کو بھی اچھی طرح سے جانتی تھی، اگر ان کو پتا لگ گیا تو وہ کیا کریں گے اس کے ساتھ یہ سوچ کر وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی تھی، کتنی مشکل سے اس نے پڑھنے کی اجازت لی تھی یہ وہ ہی جانتی تھی۔

سوچ سوچ کر پھر سے اس کا سر گھومنے لگ گیا، وہ اٹھی اور وضو کر کے ہمیشہ کی طرح اپنے رب کے آگے جھک گئی اس کو اپنے رب کی چوکھٹ پر ہی سکون میسر آتا تھا۔

☆☆☆

عاصم سے رحیم احمد کے بارے میں ساری تفصیل جاننے کے بعد ڈاکٹر عباد یزدانی ایمان کے گھر رشتے کے لیے گئے۔ ایمان کے بابا تو سن کر ہی ہتھے سے اکھڑ گئے تھے اور پھر انہوں نے رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایمان بھی یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھی سب اس کو ہی غصے سے دیکھ رہے تھے۔

جب اس بات کا اشعر کو پتا لگا تو جیسے وہ مرنے والا سا ہو گیا، ڈاکٹر عباد بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر پریشان اور بہت زیادہ دکھی ہوگئے اور پھر انہوں نے بھی عہد کر لیا کہ ان کے گھر کی بہو بنے گی تو وہ ایمان رحیم ہو گی اور کوئی نہیں، انہوں نے ہمت نہیں ہاری......

آج اتوار تھا......!

اس لیے وہ آج پھر سے سوالی بن کر ایمان کے گھر جا رہے تھے۔ اشعر خاموش کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس نے نہ ایمان کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی بات ہوئی تھی، عباد یزدانی نے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا تو اس کی حالت دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔

''اشعر! اپنے آپ کو سنبھالو بیٹا۔'' انہوں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کندھے کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

''لیکن پاپا! وہ لوگ ما......'' اس نے پریشانی سے ان کے ہاتھ کو تھام کر بولنا چاہا تو انہوں نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

''ان کو ماننا پڑے گا اس بار......'' انہوں نے بڑی سختی سے کہا۔

اشعر نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''کیونکہ میں ایمان کے ماموں سے ملا ہوں اور ان کو میں نے سمجھایا ہے، وہ تو مان گئے ہیں اور اب وہ بھی میرے ساتھ جائیں گے۔'' انہوں نے بڑے اطمینان سے اس کے چہرے کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''پاپا! آپ ایمان کے ماموں کو کیسے جانتے ہیں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''میں بعد میں بتاؤں گا۔'' انہوں نے جلدی سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر اس کو اسٹارٹ کر دیا اور کچھ دیر بعد وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن وہ ادھر ہی جما کھڑا تھا۔

☆☆☆

وہ کچن میں کھڑی کھانا بنا رہی تھی، کیونکہ بابا نے کہا تھا کہ آج ماموں نے آنا تھا اس کی طلاق کے بعد آج دوسری دفعہ وہ ان کے گھر آ رہے تھے۔ پینا آپا اور شیری آپا دونوں موجود تھیں، جب اشعر کے پاپا اس کا رشتہ لے کر آئے تو پینا آپا نے ان کو بہت

سنائی تھیں اور وہ سب کچھ دیکھتی رہی کچھ بول نہ سکی وہ جانتی تھی ایسا ہی ہوگا اس لیے وہ اشعر کو آگے بڑھنے سے روکتی تھی، اور وہ ضدی پھر بھی نہیں مانا۔

وہ ایسے ہی سوچوں میں گم کھڑی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ پینا آپا کی بیٹی نے دروازہ کھولا، ماموں آگے تھے ان کے ساتھ کون تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

ادھر اُدھر کی بات چیت کے بعد ماموں اصل مقصد کی طرف آئے اور کہنے لگے۔

"رحیم! میں جانتا ہوں ہم برادری سے باہر رشتے نہیں کرتے، لیکن تم جانتے ہو اپنی مانو طلاق یافتہ ہے کون بیاہے گا اس کو، وہ ایسے ہی گھر بیٹھی بوڑھی ہوجائے گی، یہ بہت اچھا رشتہ ہے مان جاؤ تم۔ ڈاکٹر عباد بھی بہت اچھے انسان ہیں، میں ان کو جانتا ہوں آج یہی مجھے لے کر آئے ہیں، وہ اتنی چاہت اور پیار سے مانگ رہے ہیں رشتہ۔" وہ بھی کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئی عابد ماموں کو سلام کرنے کے لیے لیکن جیسے ہی اس نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھاؤ۔ اندر سے عابد ماموں کی آواز سن کر اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

"عابد بھائی! آپ اپنے ریت رواج بھول گئے ہیں لیکن میں نہیں بھولا اور نہ ہی میں اس رشتے کے حق میں ہوں۔ لوگ کیا کہیں گے...... کتنی باتیں کریں گے اس بات کا اندازہ بھی ہے آپ کو یا نہیں۔ بس نہیں کرنا میں نے رشتہ۔" رحیم احمد نے بڑے سے دوٹوک انداز میں کہا۔ وہ اب بھی اپنی پرانی روایت کو زندہ رکھے ہوئے تھے، اور وہ گنگ سی وہیں کھڑی اندر سے آتی آوازیں سن رہی تھی، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"رحیم صاحب! کبھی کبھی انسان کو اپنے خول کو توڑ کر اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اب ان پرانے رسم و رواج کا دور گزر گیا ہے آپ بھی اب اس سے باہر نکل کر سوچیں۔ یہ جدید دور ہے اور اس کے تقاضے بھی اور ہیں۔" کب سے خاموشی سے ان کی باتیں سنتے عباد یزدانی نے ان کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"بس میاں بس! میں سب جانتا ہوں۔ اک دفعہ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" انہوں نے ایسے ہی ہاتھ اٹھا کر درشتی سے کہا۔

"اگر سب جانتے ہو تو مان کیوں نہیں جاتے تم۔ کتنی پیار اور چاہت سے وہ رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اور کتنے دنوں سے وہ تمہاری چوکھٹ پر آ رہے ہیں یوں ذلیل ہونے کے لیے۔ تم اک بار ایمان بیٹی کا تو سوچو اس کا کیا قصور ہے؟ کیا بیٹی ہونا اس کی غلطی ہے؟ یا پھر طلاق یافتہ ہونا اس کا گناہ ہے؟ کیا ساری عمر ایسے ہی لوگوں کی باتیں سننا اس کی سزا ہے؟ ان خوشیوں پر ایمان کا بھی حق ہے، میں نے اک بار غلطی کی ہے اس کا غلط جگہ پر رشتہ کروا کر اور اس لیے ہی اب میں اس غلطی کو سدھار رہا ہوں، میں اک بہت ہی اچھا رشتہ لے کر آیا ہوں۔ اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔" عابد ماموں نے ان کے جیسی تیز آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

عابد ماموں بات سن کر وہ اک دم سے خاموش ہوگئے، انہوں نے تو اک بار بھی ایمان کے بارے میں نہیں سوچا تھا وہ کیا چاہتی تھی کیا نہیں، ان کو تو بس ایک ہی فکر تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ تو بس لوگوں کی باتوں سے ڈر رہے تھے۔

"کیا ہوا رحیم میاں؟ اب کس سوچ میں پڑ گئے......؟" عابد ماموں نے ان کو خاموش اور سوچ میں گم دیکھ کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"کک...... کچھ نہیں! میں اس بارے میں سوچ کر بتاؤں گا اور ایمان کی ماں سے مشورہ کر کے۔" انہوں نے ایسے ہی کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عباد یزدانی نے بڑی حیرت سے ان کو باہر جاتے دیکھا اور پھر عابد علی کی طرف مڑے، انہوں نے ان کو سب ٹھیک ہے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

آج کا ہمارا معاشرہ سائنس ایجادات کی وجہ سے تو بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے، ہر طرف تبدیلی آ گئی ہے۔لیکن انسان کے رسم و رواج اور اس کی ذہنی سوچ آج بھی ویسی کی ویسی ہے،اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی،لوگ آج بھی اپنے خاندان کے پرانے رسم و رواج اور دقیانوسی روایتوں میں جکڑے ہوئے ہیں، اگر انہوں نے پرانے ریتی رواج چھوڑ دیے تو''لوگ کیا کہیں گے'' جیسی باتیں ان کے ذہنوں میں آج بھی گردش کرتی رہتی ہیں، جو ان کی سوچ کو بدلنے نہیں دیتیں۔

رحیم احمد بھی اسی معاشرے کے فرد تھے جو آج بھی اپنے باپ دادا کی صدیوں پہلے بنائے گئے ریت رواج کی پرستش کر رہے تھے، خاندان سے باہر شادی نہ کرنے کا رواج ان کے ہاں شروع سے ہی چلا آ رہا تھا،جس کو رحیم احمد آج بھی قائم رکھے ہوئے تھے، انہوں نے ساری عمر وہ ہی کیا جو ان کا دل کیا۔بڑی دونوں بیٹیوں کے رشتے بھی انہوں نے اپنی مرضی سے کیے اور سب نے ان کی بات مانی۔ایمان ان کی چھوٹی بیٹی تھی جو بہت ہی سادہ، معصوم اور صابر وشاکر تھی،اس کا رشتہ بھی انہوں نے اپنی سالی کے ہاں کیا لیکن وہاں اس کا گھر نہ بس سکا، اور اس کو طلاق ہو گئی۔

اور آج پھر اس کی دوسری شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، اگر ایمان کے لیے ان کے خاندان سے کسی رنڈوے، طلاق شدہ اور دو تین بچوں کے باپ مرد کا رشتہ آ جاتا تو انہوں نے کبھی بھی رشتے سے انکار نہیں کرنا تھا، کیونکہ ان کے ہاں بیوہ یا طلاق یافتہ لڑکیوں کے لیے ایسے ہی رشتے ہی آتے تھے اور خاندان سے باہر وہ کبھی رشتہ کرتے نہیں تھے۔بے شک بیٹی، بہن بوڑھی ہی کیوں نہ ہو جاتی۔

لیکن اس بار بہت الگ ہوا تھا رشتہ بھی خاندان سے باہر سے آیا تھا اور لڑکا بھی کنوارہ تھا اور سب سے اہم بات وہ ایمان کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا، رحیم احمد نے تو سنتے ہی انکار کر دیا تھا،رحیم احمد ان لوگوں میں سے تھے جو اپنا وقار بلند رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

وہ لوگ پندرہ دنوں میں پندرہ بار ان کے گھر رشتہ لے کر آ چکے تھے اور ہر بار ان کو جواب نا میں ہی ملا تھا۔لیکن اس بار عابد علی ان کے ساتھ آئے تھے انہوں نے ہی رحیم احمد کو احساس دلایا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ غلط کر رہے ہیں تب پھر وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے انہوں نے آج تک کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی اولاد کیا چاہتی ہے؟ وہ خوش بھی ہے کہ نہیں؟ان کے اندر کیا خواہشیں ہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی ان کو، وہ بس سب کی زندگی کا فیصلہ کر دیتے، جو سب کو سر جھکا کر ماننا پڑتا۔انہوں نے تمام عمر بیوی پر حکم چلاتے گزاری تھی لیکن اب ان کو اپنی تمام تر کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا۔آج اتنے سالوں میں پہلی بار وہ باپ اور شوہر بن کر سوچ رہے تھے انہوں نے سب کے ساتھ زیادتی کی تھی، جس کا آج ان کو بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

جب تک انسان کے اندر احساس نہیں ہوتا تب تک وہ بے حس بنا پھرتا رہتا ہے لیکن جب یہ احساس پیدا ہوتا ہے تو انسان پل میں بدل جاتا ہے اس کے نظریات کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ اور رویہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

اور اب وہ بھی بدل رہے تھے۔

انہوں نے بھی سوچ لیا تھا اب جو انہوں نے آگے کرنا تھا، اس لیے بہت مطمئن ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

☆☆☆

''یار! اب بیٹھ بھی جاؤ تم کب سے ٹہل رہے ہو۔تھک جاؤ گے۔'' وہ لاؤنج میں اضطرابی انداز میں ٹہل رہا تھا، جب سعد نے بہت فکرمندی سے کہا۔

وہ کب سے اس کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کو ایسے ہی بے چینی سے ٹہلتے دیکھ رہا تھا۔

''یار! پاپا ابھی تک نہیں آئے کب سے گئے

ہوئے ہیں وہ۔'' اس نے ایسے ہی ٹہلتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''اوہ! تو یار تم ان کو کال کر لو۔ اتنی دیر سے وہ ایمان کے گھر تو نہیں ہوں گے ناں......''

''یار! یہی تو ٹینشن کی بات ہے اتنی کالز بھی کی ہیں میں نے لیکن پاپا نے ایک بھی کال نہیں اٹھائی۔'' سعد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''انکل ہاسپٹل چلے گئے ہوں گے، اور تمہیں بتانا ان کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ ٹینشن نہ لو کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

اشعر نے سعد کی بات سن کر کچھ کہنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ ان کے کانوں میں ڈاکٹر عباد یزدانی کی آواز ٹکرائی۔

''کیا ہوا؟ تم لوگ ایسے کیوں پریشان سے کھڑے ہو؟'' ان دونوں نے چونک کر لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ بات کرتے ہوئے اندر آرہے تھے، ان کو دیکھ کر اشعر بھاگ کر ان کے گلے لگ گیا۔

''ارے کیا ہوا اشعر؟'' انہوں نے اس کو گلے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر پوچھا۔

''انکل! میں بتاتا ہوں...... آپ دوپہر سے گھر سے گئے ہوئے تھے، اب شام کو واپس آرہے ہیں تو اس وجہ سے یہ بے وقوف پریشان ہو گیا تھا۔'' سعد نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے ان کو بتایا۔

''ارے۔ سوری میری جان! میں جب ایمان کے گھر گیا، تو مجھے ہاسپٹل سے کال آگئی میں وہاں سے جلدی میں ہاسپٹل چلا گیا اور ٹینشن میں سیل بھی نہیں دیکھ پایا، اب میں فری ہو کر سیدھا ہی گھر آیا ہوں۔'' انہوں نے ایسے ہی اشعر کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر اسے تفصیل بتائی۔

''پاپا! آپ نے کھانا کھایا؟'' اس نے فکر مندی سے پوچھا، اور ان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ اس کو بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

''نہیں یار! ٹائم نہیں ہی ملا تم کھانا لگواؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر بات کرتے ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سعد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اب مل گیا سکون تمہیں۔؟''

''ہاں یار! میں پاپا کے بغیر نہیں رہ سکتا، ماما کے بعد پاپا نہ ہوتے تو میں کب کا ختم ہو جاتا۔'' اس نے بڑی عقیدت سے کہا، اس کے لفظوں میں اپنے پاپا کے لیے بہت پیار تھا۔

اشعر نے رانو سے کہہ کر کھانا لگوایا اور پھر وہ دونوں بھی کھانے کی میز کی طرف آگئے اور ڈاکٹر عباد کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھی آگئے، پھر تینوں نے کھانا شروع کیا۔

''انکل! آپ ایمان بھابھی کے گھر گئے تھے پھر کیا کہا ان کے بابا نے؟'' کھانے کے دوران سعد نے ڈاکٹر عباد سے پوچھا۔ اشعر نے بھی سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں بیٹا! میں گیا تھا ایمان کے گھر، اس کے ماموں بھی میرے ساتھ تھے۔ اس بار ایمان کے بابا نے صاف انکار کرنے کے بجائے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔'' انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر ان دونوں کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''سچ میں پاپا؟'' اشعر نے کھانا چھوڑ کر بہت پرجوش انداز میں پوچھا۔ اس کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں! مجھے لگتا ہے اس بار وہ انکار نہیں کریں گے۔ تم پریشان مت ہونا بیٹا۔ اب سب اچھا ہی ہوگا مجھے امید ہے۔'' انہوں نے مسکرا کہا اور کھڑے ہو گئے، کیونکہ وہ کھانا کھا چکے تھے۔

''جی پاپا۔'' اس نے بھی مسکرا کر کہا، اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھی یہ بات سعد اور ڈاکٹر عباد نے بھی نوٹ کی تھی۔ انہوں نے اس کے کندھے کو تھپتھپا کر اسے تسلی دی اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ سعد اس کو چھیڑ رہا تھا اور وہ بس دھیما دھیما سا مسکرا رہا تھا۔ اس کو بھی اپنے اللہ پر پورا بھروسا تھا۔

''ایمان بہت جلد تم میری ہو جاؤ گی۔'' اس نے تصور ہی تصور میں سوچا اور پھر مسکرا دیا۔ سعد نے اس کو مسکراتے دیکھ کر اس کے کندھے پر مکا جڑا تو وہ اور زیادہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اتنے دنوں کے بعد آج وہ دل سے ہنسا تھا......

☆☆☆

''ایمان! بابا نے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے اگر تم فارغ ہو تو آجاؤ ان کے کمرے میں۔''

وہ نماز پڑھ کے جائے نماز پر بیٹھی تھی کہ شیری آپا اس کے کمرے میں آئیں اور انہوں نے اس کو رحیم احمد کا پیغام دیا۔ وہ اک دم سے چونکی۔

''جی ٹھیک ہے آپا!'' اس نے دوپٹا سر پر ٹھیک کیا اور شیری کے پیچھے ہی اپنے کمرے سے نکل آئی۔ جب وہ دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں پینا آپا، اماں اور عابد ماموں پہلے سے ہی موجود تھے۔

''بابا! آپ نے مجھے بلایا۔'' اس نے سر جھکا کر آہستہ سے پوچھا، آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اس کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا وہ بہت حیرت سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

''ہاں بیٹا! مجھے کام تھا اس لیے میں نے تمہیں بلوایا۔ ادھر آؤ مانو بیٹا...... میرے پاس۔'' انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

ایمان نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے پاس آگئی۔

''ایمان بیٹا! مجھے معاف کردو، میں نے تمہاری زندگی کے بارے میں بہت غلط فیصلہ کیا جس کی سزا تمہیں ملی۔ میں بہت برا باپ ہوں میں نے ہر بار اپنی مرضی کی اور ہر بار تم لوگوں نے میرے غلط فیصلے کو مانا، میں نے کبھی بھی تم لوگوں کو اپنے قریب نہیں ہونے دیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، میں اپنی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ اس بار کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا میں۔'' انہوں نے محبت سے ایمان کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگایا۔

''بابا! آپ ایسے نہ کہیں آپ تو بہت اچھے ہیں۔ آپ نے ہمیں زندگی کی ہر سہولت دی ہے، ہمیں اچھا کھلایا، پہنایا۔ ہماری ہر ضرورت پوری کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی آپ نے میری بات مان کر مجھے یونیورسٹی پڑھنے کی اجازت دی۔ اتنا سب کچھ کیا ہے آپ نے ہمارے لیے۔'' اس نے ان کے سینے سے سر اٹھا کر ان کے دونوں کو تھام کر روتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنا سر ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ وہاں بیٹھے سب لوگ آبدیدہ ہوگئے، صدیقہ بھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں انہوں نے بھی تو بہت کچھ سہا تھا۔

''میں نے بہت کوتاہیاں برتی ہیں، بہت غلط کیا سب کے ساتھ۔ میں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر پرانے رسم ورواج کو اور دقیانوسی روایت کو سنبھالنے میں گزار دی، اور سب کی خوشیوں کو نظر انداز کیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ تم سب لوگ مجھے معاف کر دو۔'' انہوں نے نم آلود آواز میں کہا اور ایمان کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کو گلے لگا لیا۔

''بابا! ایمان ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ معافی مانگ کر ہمیں اور شرمندہ نہ کریں۔'' خاموش بیٹھی پینا آپا نے بھی دکھی سے لہجے میں کہا، پھر وہ اور شیری بھی اٹھ کر ان کے پاس آگئیں۔ رحیم احمد نے ان کو بھی گلے لگا لیا۔

عابد علی نے نم آلود نگاہوں سے اس بدلے ہوئے رحیم احمد کو دیکھا اور پھر دل ہی دل میں انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا، جس نے رحیم احمد کو بدلنے کی توفیق دی تھی۔ پھر انہوں نے اٹھ کر رحیم احمد کا کندھا تھپتھپایا اور اس کو بیڈ پر بٹھا دیا۔

''جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں ڈاکٹر عباد یزدانی پچھلے پندرہ دنوں سے ایمان کے رشتے کے لیے لگاتار آرہے ہیں اور ہر بار میں نے ان کے رشتے سے صاف انکار کیا ہے، لیکن اس بار میں نے بہت سوچا ہے اور پھر سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے ایمان کا رشتہ میں ادھر ہی کروں گا۔'' سب ال

بات سن کر شا کڈ رہ گئے، ایمان جوان کے پاس ہی بیٹھی تھی اس نے بھی چونک کر سر اٹھایا۔لیکن بولی کچھ نہیں اور پھر سر جھکا کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"لیکن بابا! ہم نے تو کبھی بھی برادری سے باہر رشتے نہیں کیا تو پھر اب ایمان کا رشتہ باہر کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ......؟" حیران کھڑی ہوئیں پینا آپا کی زبان میں اک دم سے کھجلی ہوئی تو انہوں نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر کہا۔

"ہاں! میں جانتا ہوں پینا۔ ہم نہیں کرتے برادری سے باہر رشتے لیکن اس بار میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ رشتہ میں باہر ہی کروں گا،لوگوں کی باتوں اور برادری کی لعن طعن کی مجھے اب پروا نہیں۔ دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے اور میں آج تک پرانی روایات میں ہی جکڑا رہا،لیکن اب لوگ جو مرضی کہیں مجھے پروا نہیں، میں نے اس روایت کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سب بدلنا تھوڑا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں،اور میں اب یہ سب بدلوں گا۔" انہوں نے پینا کی بات سن کر بڑے اٹل سے انداز میں کہا۔عابد علی جوان کی باتیں سن رہے تھے وہ بھی ان کی باتوں سے متفق ہو کر بولے۔

"رحیم! ٹھیک کہہ رہا ہے پینا۔اب پرانی رسمیں چھوڑ کر نئے دور کے ساتھ چلنا چاہیے،اور بچوں کے رشتے وہاں ہی کرنے چاہیے جہاں وہ خوش رہ سکیں، اور ایمان بہت خوش رہے گی ادھر مجھے یقین ہے،تم لوگ مجھے بھی جانتے ہو میں کتنا روایات کا غلام تھا، لیکن جب میں عباد یزدانی سے ملا تو انہوں نے مجھے سمجھایا اور میں ان کی بات شاید نہ سمجھ پاتا جو اگر اس دن میں ہسپتال نہ جاتا،اور اس لڑکی کی حالت نہ دیکھتا جو ایسے ہی رسم ورواج کی بھینٹ چڑھی ہوئی تھی۔وہ دیکھ کر میں دکھی ہو گیا اور میں نے بھی سوچ لیا کہ میں اپنے آپ کو بدلوں گا،میں تو اپنے بچوں کی شادیاں کر چکا ہوں لیکن ایمان کا رشتہ باہر کر کے ہم اس روایت کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔" ان کے اس فیصلے پر عابد علی بہت مطمئن تھے۔

عابد علی بھی پرانے رسم ورواج اور روایات کے بڑے پاسدار تھے، وہ اک دن اپنے دوست کی عیادت کرنے ہسپتال گئے تو وہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر عباد یزدانی سے ہوئی۔ وہ ان کو بہت اچھے لگے۔ پھر باتوں باتوں میں ایسے ہی پرانے رسم و رواج کی باتیں چل نکلیں اور تب انہوں نے ان کو وہ لڑکی دکھائی جو طلاق یافتہ تھی اور اس کی گھر والوں نے اس کی شادی دو بچوں کے باپ سے کر دی لیکن جو ظلم اس شخص نے اس لڑکی پر کیا تھا وہ دیکھ کر کسی بھی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔وہ لڑکی دل کی مریضہ بن گئی تھی اس کی دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی جس کے علاج کے لیے وہ وہاں داخل تھی۔

"لیکن بابا! میں نے اب کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔" کب سے خاموشی سے باتیں سنتی ایمان نے اک دم سے سر اٹھا کر کہا،وہاں موجود سب لوگوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن کیوں مانو؟ کیوں نہیں کرنی شادی اب؟" شیری نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں مانو بیٹی اب کیا ہوا؟" کب سے خاموشی اور حیرانی سے سب کچھ سنتے ہوئے صدیقہ نے بھی مداخلت کی۔وہ سب جانتے تو تھے کہ ایمان ایسا کیوں کہہ رہی ہے لیکن پھر بھی وہ پوچھ رہے تھے۔

"اماں! آپ جانتی تو ہیں پہلے شادی کر کے کیا ہوا ہے۔اور اب پھر وہ ہی دہرایا جا رہا ہے۔" اس نے سر جھکا کر ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ٹوٹے سے لہجے میں کہا۔اس کے دل میں ابھی بھی ڈر سا تھا،صدیقہ اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئیں۔

"نہیں ایمان بیٹا! اس بار ایسا نہیں ہوگا۔وہ لوگ بہت اچھے ہیں تمہیں خوش رکھیں گے،ہر خدشہ نکال دو دل سے۔" عابد علی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بابا! اگر آپ سب لوگ خوش ہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں،لیکن میں شادی ایم۔اے کے

بعد کروں گی۔'' اس نے جھکے سر کے ساتھ آہستہ سے کہا۔اور کمرے سے چلی گئی۔

رحیم احمد اور عابد علی نے صدیقہ، پینا اور شیری سے بھی مشورہ کیا۔صدیقہ اور شیری کو تو پہلے ہی کوئی اعتراض نہیں تھا،لیکن پینا تو تپ گئیں،ان کی باتیں سن کر رحیم احمد پھر سے سوچ میں پڑ گئے،لیکن پھر عابد علی نے ان کو سمجھایا تو نا چاہتے ہوئے بھی ان کو ماننا ہی پڑا۔سارے معاملات طے ہو گئے تھے بس اب ڈاکٹر عباد یزدانی کو کال کر کے ''ہاں'' کہنی تھی۔

☆☆☆

''اشعر، اشعر! اٹھ جاؤ یونی نہیں جانا کیا؟ پندرہ دن ہو گئے ہیں تم نہیں جا رہے، یہ تمہارا لاسٹ سمسٹر ہے اور تم اتنی لاپروائی کر رہے ہو۔تم جانتے ہو کہ تم ٹاپر ہو کلاس کے۔ایسے چھٹیاں کرنا اچھی بات نہیں۔'' ڈاکٹر عباد نے اشعر کے اوپر سے کمبل کھینچ کر کہا اور اس کو اک بار پھر سے جگانے کی سعی کی۔وہ کب سے اس کے کمرے میں اس کو جگانے آئے ہوئے تھے، پہلے وہ تو ٹس سے مس نہ ہوا، لیکن پھر ان کی بات سن کر اس نے کمبل منہ تک اوڑھا اور کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

''اشعر! اٹھ بھی جاؤ یار! چلو ٹھیک ہے، بس اب بہت ہو گیا، نہیں اٹھنا تو نہ اٹھو۔میں بھی نیچے جا رہا ہوں، میں تمہیں گڈ نیوز سنانے آیا تھا لیکن اب نہیں سناؤں گا، سوئے رہو اب تم۔'' انہوں نے اشعر کو پھر سے سوتے دیکھ کر خفگی سے پیاری بھری دھمکی دی اور اس کے کمرے سے جانے کے لیے مڑے۔

''گڈ نیوز......؟'' یہ لفظ سن کر اشعر کے دماغ میں جھماکا ہوا اور وہ جلدی سے کمبل دور پھینکتا اچھل کر بیڈ سے نیچے اترا اور ڈاکٹر عباد کے پاس پہنچ گیا۔اور ان کو بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

''پاپا! کون سی گڈ نیوز......؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔تم سوئے ہی رہو اب۔میں نے کچھ نہیں بتانا۔'' انہوں نے مصنوعی غصہ سے منہ بنا کر کہا۔پھر اس کے بے چین سے چہرے کی طرف دیکھ کر ترس آ گیا تو اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپا کر بولے۔

''ایمان کے بابا نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے......''

ان کی بات سن کر وہ اک دم سے خوشی سے اچھلا......اور ان کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے گھما کر بولا۔

''سچ میں پاپا......! ان لوگوں نے ہاں کر دی؟''

''ہاں یار۔میں سچ کہہ رہا ہوں۔لیکن ان کی اک شرط ہے۔'' انہوں نے بیٹے کے خوشی سے کھلتے چہرے کو دیکھا۔

''شرط......؟ لیکن کیسی شرط پاپا۔'' اس کے ہنستے لب آپس میں پیوست ہو گئے اور پھر اس نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

''ان کی شرط یہ ہے کہ ایمان چاہتی ہے کہ وہ ماسٹرز کے بعد شادی کرے گی۔اور میں نے بھی ان سے کہہ دیا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' ڈاکٹر عباد نے اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھا۔جواب بدل رہے تھے۔

''لیکن پاپا! آپ نے ان سے ایسے کیوں کہا؟ ایمان بعد میں بھی تو پڑھ سکتی ہے ہم کون سا روک رہے ہیں اس کو۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر خفگی سے کہا۔

''اب تو میں نے کہہ دیا ان کو، تم خود ہی ایمان سے بات کر لینا۔آج جانا ہے ان کے گھر تم تیار رہنا شام کو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کو گلے لگا کر کہا۔وہ اس کی بے چینی سمجھ رہے تھے پھر بھی وہ خوش تھے کیونکہ ان لوگوں نے ہاں کر دی تھی۔

''نہیں۔میں نے تو نہیں جانا ان کے گھر۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اس کی نظروں کے سامنے ایمان سے ہوئی وہ آخری ملاقات گھوم گئی، جب اس

نے وعدہ کیا تھا۔
''لیکن کیوں اشعر؟'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔
''میں نے ایمان سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سے تب بات کروں گا جب وہ اس گھر میں آئے گی میری بن کر۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔
''لیکن اشعر بیٹا۔انہوں نے......'' ابھی ڈاکٹر عباد کی بات منہ میں ہی تھی کہ وہ بے ساختہ بول پڑا۔
''پاپا! آپ چلے جائیں نا سمن انکل کے ساتھ۔میں نے نہیں جانا بس۔'' وہ ایمان سے تھوڑا خفا تھا اس لیے وہ نہیں جانا چاہتا تھا اور اس نے جو وعدہ کیا تھا وہ بھی نبھانا چاہتا تھا۔
''ٹھیک ہے! اب فریش ہوکر نیچے آؤ ناشتا کریں۔ بہت وقت ہوگیا میں نے ہسپتال بھی جانا ہے۔'' انہوں نے اس کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔
لیکن وہ وہیں کھڑا تھا۔اس کو ابھی بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے خواب سچ ہونے جارہے تھے اب۔ایمان اس کی بن کر اس کے گھر آنے والی تھی۔
''ایمان۔میں نے تم سے کیا ہوا ہر ہر وعدہ پورا کرنا ہے جس کی شروعات ہوچکی ہے بس تم بھی جلدی سے آجاؤ میرے پاس۔'' اس نے تصور ہی تصور میں ایمان سے مخاطب ہوکر کہا اور پھر اپنی بے چینی پر مسکرا کر واش روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

اشعر ایمان کے گھر نہیں گیا تھا۔اس نے اپنی ضد پوری کی تھی۔اس لیے صرف سمن صاحب، ان کی مسز فضیلہ اور ڈاکٹر عباد پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں کے ساتھ ان کے گھر روانہ ہوئے۔ پہلے کی نسبت اس بار ایمان کے گھر میں ان کا ستقبال بہت اچھے انداز میں کیا گیا، پھر سے رشتے کی بات ہوئی۔
لیکن پھر جب اشعر کی ضد کے مطابق انہوں نے جلدی شادی کرنے کی بات کی۔تو رحیم صاحب اور عابد علی شش و پنج میں مبتلا ہوگئے اور انہوں نے ان کو اک ہفتے بعد آنے کو کہا۔کیونکہ ایمان کی خواہش تھی کہ وہ ایم اے کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتی تھی۔اس لیے اب وہ لوگ بھی ایمان سے پوچھے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔
پھر ایک ہفتے کے بعد جب ڈاکٹر عباد اور سمن صاحب تشریف لائے تو اس بار ان کے ساتھ سعد اور اشعر بھی تھے۔سعد کے اصرار کرنے پر اشعر آنے کے لیے مانا تھا اور شاید اس کا اپنا بھی دل کررہا تھا ایمان کو دیکھنے کا۔
اشعر اور ایمان کی شادی کی ڈیٹ دو ماہ بعد کی رکھ دی گئی یعنی ایمان کے تھرڈ اور اشعر کے لاسٹ سمسٹر کے فائنل پیپرز کے بعد سب ہی اس رشتے سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔
دعائے خیر کے بعد ایمان کو بھی ڈرائنگ روم میں بلوایا گیا۔جب وہ آئی تو سامنے اشعر اور سعد کو دیکھ کر جھجک گئی۔کیونکہ وہ پہلی بار اس حلیے میں ان کے سامنے آئی تھی۔وہ ایسے ہی سر جھکا کر آگے بڑھی اور پھر اس نے سب کو بہت آہستہ سے سلام کیا۔ڈاکٹر عباد نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا، وہ ایمان سے بہت پیار اور شفقت سے ملے، ان کے دل میں ایمان کے لیے بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی کے اشعر کے لیے تھی۔
سعد اور اشعر نے ڈیڑھ سال میں پہلی بار ایمان کو ہلکے میک اپ میں دیکھا تو وہ عام دنوں کی نسبت ان کو بہت زیادہ چینج لگی، اُس ایمان سے بالکل الگ جو ان لوگوں نے یونی میں دیکھی تھی۔اشعر نے اک اچٹتی سی نظر ایمان پر ڈالی اور پھر سے عابد علی کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔اس نے خود کو بہت مشکل سے ایمان کو دیکھنے سے روکا تھا۔
ایمان ان لوگوں سے مل کر جلد ہی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔اشعر کے ایسے رویے سے اس کے اندر عجیب سی بے چینی اور اداسی سی پھیل گئی، پتا نہیں کیوں......؟

شاید وہ اشعر سے ایسے رویے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس لیے اس کا ایسا رویہ دیکھ کر وہ اداس ہوگئی۔

☆☆☆

آج اس کی بارات تھی......

دو ماہ کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں لگا۔ وہ اپنے روم میں کھڑا بڑے مگن انداز میں تیار ہو رہا تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی، اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اب اڑ کر ایمان کے پاس پہنچ جائے۔

"واہ! کیا روپ آیا ہے میرے یار پر۔ بالکل کسی ریاست کے شہزادے لگ رہے ہو تم۔" وہ میرون اینڈ وائٹ کنٹراسٹ کی شیروانی پہنے بالوں کو سلیقے سے سیٹ کر کے آئینے کے سامنے کھڑا اپنے مخصوص پرفیوم کا چھڑکاؤ کر رہا تھا جب سعد ہاتھوں میں پھولوں کی مالا اور کلاء لیے اس کے روم میں داخل ہوا اور اس کے خوشی سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہا...... مجھے پہلے ہی پتا ہے میں بہت پیارا لگ رہا ہوں اور پلیز تم اب مجھے نظر مت لگانا۔" اس نے پرفیوم کی شیشی ڈریسنگ کے آگے رکھ کر سعد کو گلے لگایا اور اس کی شرارت سمجھ کر زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہنہہ! بڑا آیا شہزادہ۔ جو تمہیں نظر لگے گی میری۔" سعد نے بھی مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے منہ بڑانے والے انداز میں کہا اور اک زوردار دھموکا اس کی کمر پر جڑ دیا۔

"ہاں۔ وہ تو میں ہوں۔ ابھی ابھی تم نے خود ہی تو کہا کہ میں شہزادہ لگ رہا ہوں......" اشعر نے مسکراہٹ دبا کر فرضی کالر جھاڑا۔

"ہاں۔ کہا ہے۔ تو کیا اب بندہ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔" سعد نے غصے سے منہ بنا کر چڑ کر کہا۔ اور دل ہی دل میں اس کی نظر اتار کر اس کے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا کی۔

"دفع ہو جا تو دوست نہیں دشمن ہے۔" اس نے سعد کو گھورا اور پھر سے پرفیوم کی شیشی اٹھا کر چھڑکنے لگا۔ وہ مکمل تیار ہو چکا تھا۔

تب ہی ڈاکٹر عباد اور سلمان صاحب بھی کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے اشعر کو گلے لگا کر پیار کیا اس کی نظر اتار کر اس کے گلے میں مالا ڈالی اور پھر وہ چاروں ہی اک ساتھ مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ بارات تیار تھی بس دولہا کا انتظار تھا اس کے آتے ہی بارات اپنی منزل پر روانہ ہوگئی۔

"میں آ رہا ہوں ایمان۔" اشعر نے تصور ہی تصور میں ایمان سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر مسکرا کر سر جھٹک کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ آج بہت مطمئن تھا کیونکہ اس نے جو چاہا تھا وہ پا لیا۔ اور ایمان سے کیا ہوا اپنا وعدہ بھی نباہ دیا تھا اور اب آگے بھی ہر وعدہ نباہتے رہنا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت برائیڈل روم میں اکیلی بیٹھی اپنی زندگی میں رونما ہونے والے نشیب و فراز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ حیرت اس کو اس بات کی تھی کہ اس کا رشتہ خاندان سے باہر اک ایسے شخص سے ہوگیا تھا جو اس سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ آج اس کے لیے سجی سنوری بیٹھی تھی۔

انسان کرنے پر آئے تو کچھ بھی کر سکتا ہے اور بڑی سے بڑی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو دور کر سکتا ہے، ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے لیکن تب جب اس کے اندر ہمت حوصلہ جرات اور لگن ہو اور اگر یہ سب کچھ اس انسان میں نہ ہو تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس بات کا اندازہ آج اسے بھی ہو گیا تھا۔ کیونکہ اشعر نے جو کہا تھا، وہ کر کے بھی دکھایا تھا۔ اور اس کے اپنے بابا بھی کر ہی رہے تھے اپنی پرانی رسومات کو چھوڑ کر۔

دو ماہ پہلے اس کا رشتہ اشعر عباد یزدانی سے ہو گیا تھا اور شادی کی ڈیٹ بھی رکھ دی گئی لیکن ان دو ماہ میں اس کی اشعر سے بات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اُس نے بات کرنے کی کوشش کی تھی شاید وہ اس سے

ناراض تھا۔ وہ دو ماہ میں صرف دو بار ہی ان کے گھر آیا تھا اک بار اپنے پاپا کو لینے اور دوسری بار تب آیا جب ان کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی، وہ بھی شاید سعد اور ڈاکٹر عباد کے بھرپور اصرار کرنے پر۔

ایمان جانتی تھی کہ اشعر جو کہتا ہے وہ کر کے بھی دکھاتا ہے اور اس کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ اب اس سے بات بھی تب ہی کرے گا جب وہ اس کے گھر اس کی بن کر جائے گی۔ اس کو اشعر سے ہوئی وہ آخری ملاقات آج بھی اچھی طرح سے یاد تھی۔

سب کچھ ٹھیک تھا اس کی ماں بہنیں ماموں سب خوش تھے لیکن اس کو عجیب سے بے چینی نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ آج اس کی شادی تھی اور اس کے دل و دماغ میں وہ پہلے والی شادی گھومنے لگی اک دم سے اس کا سر بہت زور سے گھوما، اس نے سر کو اک دم سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا شاید اس کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ وہ ایسے ہی سر کو تھامے بیٹھی تھی جب شیری آپا برائیڈل روم میں آئیں۔ اور اس کو ایسے بیٹھے دیکھ کر جلدی سے اس کی طرف بڑھیں۔

''کیا ہوا مانو؟ تم ایسے کیوں سر تھام کر بیٹھی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔'' انہوں نے پریشانی سے ایمان کا سر اوپر اٹھا کر اس سے استفسار کیا۔

''جج...... جی شیری آپا! میں ٹھیک ہوں بس ہلکا سا سر میں درد ہے۔'' اس نے اپنے بہت قریب شیری آپا کو اپنے لیے پریشان دیکھا تو جلدی سے خود کو سنبھال کر بولی۔ وہ کسی کو آج کے دن دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''لگ نہیں رہا مانو! میں بابا یا ماموں کو کہتی ہوں کہ وہ ڈاکٹر کو بلوا کر تمہارا بی پی چیک کروا دیں۔ ابھی بارات تھوڑی لیٹ ہے۔'' شیری آپا نے فکر مندی سے کہا اور باہر جانے کے لیے مڑنے لگیں تو اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہ...... نہیں رہنے دیں آپا پلیز۔ مم...... ٹھیک ہوں بس مجھے عجیب سی بے چینی نے گھیرا ہوا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میری قسمت مجھے کس طرف لے کر جا رہی ہے۔ آج میری شادی ہے اور میرے اندر خوف نے ڈیرے جمائے ہوئے ہیں آپا۔ میں کیا کروں بتائیں مجھے۔'' اس نے بے بسی سے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار کر نم آلودہ آواز میں شیری آپا کے ہاتھ کو پکڑ کر کہا۔

''مانو میری جان! اشعر بہت اچھا ہے اور یہ بات تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو۔ وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا کبھی دکھ نہیں دے گا۔ تمہیں ماضی کو بھول کر اپنے ہر خدشات کو بھول کر آگے بڑھنا ہو گا اور اک نئی زندگی کا آغاز کرنا پڑے۔ خوشیاں تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ ایسے مایوسی کی باتیں نہ کرو تم جانتی ہو مایوسی کفر ہے، اور اس بار کچھ بھی غلط نہیں ہو گا بس اللہ پر بھروسا رکھو۔'' شیری نے اس کی بات سن کر اس کو پیار سے گلے لگا کر بڑے رسان سے سمجھایا۔ وہ اس کے ڈر اور خوف کو بھی سمجھتی تھیں کیونکہ اس نے کم عمر میں بہت کچھ سہا تھا۔

''پھر بھی آپا آپ جانتی تو ہیں جو بھی ہوا۔'' ایمان نے ان کے ساتھ لگے لگے ڈرے ہوئے لہجے میں پھر سے کہا۔

''بھول جاؤ وہ سب ایمان! جو بھی ہوا وہ اک خواب تھا یہی سمجھ لو۔ اور اب اپنے حال اور مستقبل کو دیکھو۔ اگر ایسے ہی ماضی سے چمٹی رہیں تم تو کبھی خوش نہیں رہ پاؤں گی۔'' انہوں نے ایمان کو سمجھایا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کی نظر بھی اتاری کیونکہ وہ آج بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''جی ٹھیک ہے آپا......'' اس نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا اور پھر سے سر جھکا لیا۔ اب اس کو خود ہی ہمت کرنی تھی اور خود ہی ماضی کو بھلانے کی کوشش کرنی تھی۔

''گڈ۔ یہ ہوئی نہ بات۔'' شیری آپا نے مسکرا کر کہا۔ کچھ دیر کے بعد بارات آنے کا شور مچ گیا اور شیری آپا بھی باہر چلی گئیں۔ لیکن آنے والے وقت کا سوچ کر وہ عجیب سی صورتحال سے دوچار ہو رہی تھی

اس کا دل عجب سے انداز میں دھڑکنے لگ گیا تھا۔

☆☆☆

بارات آچکی تھی۔

بہت ہی خوب صورت انداز میں پھولوں کی پتیوں کے ساتھ بارات کا استقبال کیا گیا۔

پھر رسم نکاح ہوئی اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا، پھر دودھ پلانے کی رسم ہوئی اور آخر میں وہ وقت آہی گیا جس کا اشعر کو شدت سے انتظار تھا۔ یعنی ایمان کو اشعر عباد یزدانی کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا گیا۔

وہ خوب صورت تو پہلے ہی بہت تھی لیکن بیوٹیشن کے ماہر ہاتھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیا تھا۔ میرون اینڈ گولڈن کنٹراس کے ہیوی لہنگے میں ملبوس فل ہتھیاریوں سے لیس وہ کوئی آسماں سے اتری اپسرا لگ رہی تھی۔

جب اشعر نے دور سے اس کو آتے دیکھا تو وہ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے ایمان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر اس کو اسٹیج پر چڑھنے میں مدد کی۔ ہر طرف قہقہے اور ہوٹنگ شروع ہوگئی۔ سب لوگ اس خوب صورت منظر کو خوشی سے دیکھ رہے تھے اور اس دلکش منظر کو سب نے ہی اپنے موبائلز میں محفوظ کر لیا تھا۔

اشعر کی نظریں اپنے پہلو میں بیٹھی ایمان کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں پا رہی تھیں، وہ بے خود سا اس کو ہی تکے جا رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ ایمان اس کی ہوگئی تھی اور اب اس کو دیکھنے کا مکمل اختیار اس کے پاس تھا۔

ایمان اشعر کو اپنی طرف یوں والہانہ انداز میں تکتے پا کر پزل ہو کر سر جھکا گئی۔ اشعر جو اس کی یہ حرکت دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا وہ دھیمے سے مسکرا دیا اور پھر اس کی طرف تھوڑا جھک کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو ایمان۔"

ایمان اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر جھینپ کر خود میں سمٹ گئی۔ اشعر پھر سے مسکرا دیا۔

سعد جو تھوڑا دور کھڑا مہمانوں کو کمپنی دے رہا تھا وہ اس کو ایسے ہنستے دیکھ کر ان سے ایکسکیوز کرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"بڑے دانت نکل رہے ہیں تمہارے آج۔"

اس نے شرارت سے ایمان کے جھکے سر کو دیکھ کر کہا۔

"ہاہاہا..... تو اور کیا اب میں ہنسوں بھی ناں۔"

اس نے بھی زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔ سب لوگ اشعر کو ایسے ہنستے دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور پھر ان دونوں کو بڑی حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ایمان بھی اشعر کی باتوں سے پزل ہو کر الگ سے خود میں سمٹتی جا رہی تھی۔

"کچھ شرم وحیا کر لے تو دولہا ہے، سب ادھر متوجہ ہیں۔ چل تو میرے ساتھ ادھر مہمانوں سے مل کے آتے ہیں۔" سعد نے بھی مصنوعی غصے سے ڈپٹتے ہوئے کہا اور پھر اس کا ہاتھ کھینچ کر اس کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر اسٹیج سے نیچے اتر گیا کیونکہ اس کو ڈاکٹر عباد بلا رہے تھے۔

ایمان نے سکون کا سانس لیا۔ اشعر کے جاتے ہی اس کی کزنز نے ایمان کے پاس ڈیرے ڈال لیے۔ وہ سب اس کے ساتھ سیلفیاں بنا رہی تھیں، لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد رخصتی کا شور اٹھا۔

صدیقہ بی، پینا آپا، شیری آپا، رحیم صاحب اور عابد علی کے علاوہ باقی سب لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، وہ سب کے گلے لگ کر خوب روئی۔ آج دوسری بار پھر سے وہ اپنے باپ کے گھر کی دہلیز سے رخصت ہو رہی تھی۔ لیکن اس بار اس کے والدین کے پیار ومحبت اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ جس گھر میں وہ بیاہ کر جا رہی تھی ان کا پیار اور چاہتیں بھی شامل تھیں۔

سب سے ملنے کے بعد شیری آپا اور پینا آپا نے اس کو گاڑی میں بٹھایا۔ رحیم احمد اور صدیقہ بی بہت افسردہ سے لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر عباد اور عابد علی نے رحیم احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی

اور جب اشعر آگے ہو کر ان سے ملا تو انہوں نے اشعر کو گلے لگایا اور پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر نم آلود آواز میں بولے۔

''اشعر بیٹا! میں نے اپنے باپ دادا کی برسوں پرانے رسم ورواج کو توڑا ہے، ایمان کی خوشی کے لیے یہ اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ اب آپ ایمان کا بہت زیادہ خیال رکھنا، اس کو ہمیشہ خوش رکھنا، اور کبھی دکھی مت ہونے دینا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں بہت سے دکھ جھیلے ہیں۔ یہ اک باپ کی درخواست ہے بیٹا۔''

''بابا! آپ بے فکر ہو جائیں اور بھروسا رکھیں مجھ پر، میں کبھی بھی ایمان کو دکھی نہیں ہونے دوں گا۔ اب وہ میری ہے اور اس کو خوش رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ آپ کو اس معاملے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ اک بیٹے کا اپنے باپ سے وعدہ ہے۔'' اس نے رحیم احمد کے ہاتھوں کو تھام کر بڑے پیار سے انہیں یقین دہانی کروائی۔ ڈاکٹر عباد جو ان کی باتیں سن رہے تھے وہ بھی بولے۔

''رحیم بھائی! اشعر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اور ایمان آج سے میری بیٹی ہے اور وہ گھر اب اس کا ہے، اور اب اپنے گھر میں اس کو کبھی کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ بس اب آپ پریشان نہ ہوں اور ہمیں اجازت دیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' رحیم احمد نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر قرآن مجید کے سائے تلے ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ ایمان مسز اشعر بن کر اس گھر سے اک بار پھر سے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

اشعر کے گھر میں جیسے ہی اس نے گاڑی سے قدم باہر نکالا اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ بہت پرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا گیا، ہر طرف کیمروں کی لائٹس تھیں جو اس کے خوب صورت سراپے کو قید کر رہے تھے۔ پھر آنٹی فضیلہ (سعد کی ماما) اور اشعر کی کزنز اس کو وسیع وعریض خوب صورتی سے سجائے گئے لاؤنج میں لے کر آئیں۔ اشعر بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی لاؤنج میں آیا، لیکن پھر اس کی کوئی ضروری کال آگئی اور وہ تھوڑا دور جا کر سننے لگا۔

ایمان نے جیسے ہی سر اوپر اٹھا کر لاؤنج پر طائرانہ نگاہ ڈالی اس کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیل گئیں۔ اشعر کا گھر اتنا خوب صورت تھا اس نے صرف اپنی بہنوں سے سنا تھا لیکن خود نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ حیران سی ہو گئی۔ اس نے ایسے ہی حیران نظریں اٹھا کر دور کھڑے اشعر کو دیکھا جو پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کو ایسے حیران دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا اور پھر جلدی سے اس کے پاس آیا۔

''کیا ہوا ایمان؟ آر یو اوکے؟'' اس نے فکر مندی سے ایمان سے استفسار کیا، لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ بس خاموشی سے سر جھکائے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ کیونکہ کیمرہ مین اور فوٹو گرافر ان کو کچھ ہدایت دے رہے تھے۔

فوٹو سیشن کے بعد رسموں کا اک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ بھی سب رسمیں خاموشی سے کرتی رہی۔ سب لوگ بہت انجوائے کر رہے تھے اس لیے وہ ان کو اپنی تھکن کا بتا کر ان کی خوشی کو کم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اشعر جو گاہے بگاہے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا وہ اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس لیے وہ اک دم سے کھڑے ہو کر بلند آواز میں بولا۔

''بس فضیلہ آنٹی۔ اب میں تھک گیا ہوں باقی رسمیں کل کریں گے۔'' جیسے ہی اس نے یہ بات کہی لاؤنج میں ہنسی کا اک شور بلند ہو گیا اور سب کی طرف سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

''تم تھک گئے ہو یا تمہاری دلہن۔'' فضیلہ آنٹی نے مسکراہٹ دبا کر کہا، کہیں سے کچھ اور آوازیں آرہی تھیں۔

''سمجھا کرو بیگم۔'' سلمان صاحب نے بھی

میدان میں قدم رکھا، تو فضیلہ آنٹی بھی شرما گئیں۔
''بڑا پیار ہے ہمارے شیر کو اپنی دلہن سے۔''
سعد نے شرارت سے آنکھ دبا کر کہا۔ وہ بھی ان سب کے ساتھ برابر کا شریک تھا سب مل کر اس کی ٹانگ کھینچ رہے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ایمان سب کی باتیں سن کر جھک کر سر جھکا گئی۔ اس کو بھی یہ سب نیا نیا اور اچھا سا لگ رہا تھا، رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی تو اس کے ساتھ ہی اس کی سوچ نے بھی نیا رخ اپنایا تھا۔

''ہاں جی! بہت پیار ہے مجھے اپنی دلہن سے اور یہ ہمیشہ ایسے ہی رہے گا ان شاء اللہ۔'' اشعر کے یوں سب کے سامنے والہانہ اظہار محبت کرنے پر ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا اور ایمان اور زیادہ شرما گئی۔
ڈاکٹر عباد جو سب کچھ سن اور دیکھ کر مسکرا رہے تھے وہ اپنی ہنسی روک کر شرارت سے بولے۔
''بس بہت ہو گیا! اب کوئی بھی میرے بیٹے کو تنگ نہیں کرے گا۔ فضیلہ بھابھی۔ آپ ایمان بیٹی کو روم میں لے جائیں۔'' اشعر باپ کی آواز سن کر مسکرا دیا اور پھر پرجوش انداز میں ان کے گلے لگ گیا۔
''تھینکس پاپا! آئی لو یو سو مچ، آپ ورلڈ کے بیسٹ پاپا ہیں۔''
''بس بس...... اب اور زیادہ مسکے اور مکھن نہ لگاؤ انکل کو۔'' سعد نے کی زبان میں پھر سے کھجلی ہوئی تو اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ تم تو ہو ہی جل ککڑ۔ اب جل جاؤ، ہمارے پیار سے۔'' اشعر نے بھی چڑانے والے انداز میں کہا۔ اور پھر کیا تھا...... سعد کے ہاتھ میں کشن تھا اور اشعر اس کے آگے بچاؤ بچاؤ کہتا بھاگ رہا تھا، سب ہنس رہے تھے، یہ اک الگ روپ تھا اشعر کا جو سب کے لیے ہی حیرت و خوشی کا باعث تھا۔ محبت انسان کو اتنا بدل دیتی ہے یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سلمان صاحب اور ڈاکٹر عباد نے ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروایا اور پھر ایمان کو اشعر کے خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیے گئے روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔

☆☆☆

جب سے آنٹی فضیلہ اور اشعر کی کزنز اس کو اشعر کے روم میں چھوڑ کر گئی تھیں وہ تب سے مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی، اس نے اک دو بار کمرے کا جائزہ لیا جو کہ بہت خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ روم میں جا بجا سرخ گلابوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں جن کی دلفریب دھیمی مسحور کر دینے والی خوشبو پورے روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روم اشعر کی اعلا پسند کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہا تھا۔
اک بار پھر سے اس نے روم کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور سر جھکا کر بیٹھی گئی۔ اس کی دھڑکنوں میں عجب ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب اس کے اور اشعر کے رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی، تو اشعر کی آمد کا سوچ کر اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی، اشعر ابھی تک نہیں آیا تھا شاید وہ اس سے خفا تھا۔
تھکن کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اشعر کے آنے کا انتظار کر رہی تھی، پھر اس نے کچھ سوچ کر تکیہ ٹھیک کر کے بیڈ کراؤن سے لگایا اور تھوڑا پیچھے ہو کر اس کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ ابھی وہ آنکھیں موندنے ہی لگی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی وہ اک دم سے سیدھی ہوئی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
جیسے جیسے اشعر کے قدموں کی چاپ اس کے قریب ہو رہی تھی، اس کے چہرے پر وحشت اور آنکھوں میں ڈر و خوف کے آثار صاف دکھائی دینے لگے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور ہاتھ ہول ہولے لرزنے لگے۔ وہ اس کی حالت سے بے خبر دھیمی مسکان چہرے پر سجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا، آہستہ سے سلام کیا۔
''بہت بہت مبارک ہو مسز ایمان اشعر۔'' اس نے ایمان کے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے مبارک

دی۔
"جج...... جی۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا اب وہ مکمل طور پر گھبرا چکی تھی، اشعر نے اس کی ایسی حالت دیکھی تو وہ پریشان ہو گیا اور اس کے لرزتے ہاتھوں کو پکڑ کر نرمی سے گویا ہوا۔
"ایمان کیا ہوا؟ آپ ایسے کیوں گھبرا رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟"
"پپ...... پتا نہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ مجھ...... مجھے...... بب...... بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے خوف سے آنکھیں بھینچ کر کہا۔ آواز اس کے حلق میں اٹک رہی تھی۔ اشعر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہاں خوف ہی خوف تھا۔
"ریلیکس ایمان! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں، کچھ نہیں ہوگا۔ پلیز، مجھ پر یقین کریں۔ کبھی بھی کچھ بھی غلط نہیں ہوگا اب آپ کے ساتھ۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے کہ میں آپ کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔" اس نے ایمان کے ہاتھوں کو پکڑ کر بہت پیار سے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، وہ اس کے چہرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا تب ہی اس نے اوپر دیکھا اشعر کی نظریں اس کے نظروں سے ملی تو وہ سر جھکا گئی۔ اس کی نگاہوں میں خوف اب بھی تھا۔
"مم...... میں نے اپنی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اب تو مجھے خوشیوں سے بھی بہت زیادہ ڈر لگنے لگ گیا ہے۔" اس نے درد بھرے لہجے میں اٹکتے ہوئے کہا۔
"لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا، جو ہونا تھا وہ پہلے ہو گیا۔ اللہ بہت رحمان و رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑتا اور نہ ہی اس کو ضرورت سے زیادہ آزماتا ہے۔" وہ ایمان کو دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ ایمان یک ٹک اسے ہی دیکھی جا رہی تھی اور اس کی باتوں کو غور سے سن رہی تھی۔
"بے شک! وہ ہی اک ذات تو ہے جو انسان کو سنبھالتی ہے ورنہ دنیا والے تو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔" اس نے پچھلی باتوں کو یاد کر کے اشعر کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے سے کچھ دیر پہلے والی گھبراہٹ اب قدرے کم ہوئی تھی۔
"آپ چھوڑیں ان سب باتوں کو، جو گزر گیا وہ ماضی تھا اس لیے اب اس کو یاد کر کے دکھی نہیں ہونا، آپ کے دل میں جو بھی ڈر و خوف ہے وہ اب آپ نکال دیں۔ اب میں آپ کا حال ہوں اور میرے ساتھ ہی آپ کا ماضی اور مستقبل ہے جو ان شاءاللہ اب بہت بہت اچھا گزرنے والا ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں ہر قدم پر...... ہر دکھ میں...... ہر سکھ میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گی۔ میں اب آپ کی آنکھوں میں کوئی ڈر نہ دیکھوں۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ وہ ایمان کو اپنے ہونے کا یقین دلا رہا تھا اور اس کو رسان سے سمجھا رہا تھا۔ ایمان بھی اس کی باتیں سمجھ رہی تھی۔ پھر اک دم سے اسے خیال آیا۔
"آپ مجھ سے ناراض کیوں تھے؟" اس نے اشعر کی ساری باتیں سن کر اک دم سے پوچھا۔ اشعر کو اس کے پوچھنے پر اک دم سے حیرت نے گھیرا۔ کہاں وہ کچھ دیر پہلے ڈر رہی تھی اور اب وہ اس سے شکوہ کر رہی ہے۔
"کب؟" اس نے تحیر سے پوچھا۔
"جب آپ ہمارے گھر آئے تھے؟" اس فوراً جواب دیا۔
"اوہ۔ اچھا تب۔ میں آپ سے ناراض نہیں تھا، میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ بس میں اپنا وعدہ نباہ رہا تھا۔ اور دیکھیں وہ وعدہ میں نے نباہ لیا اور اب آپ میرے گھر میں میرے بیڈروم میں بیٹھی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جواب بہت حد تک پرسکون ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والا ڈر اور خوف اب اس کی آنکھوں میں نہیں تھا، اشعر نے دل ہی دل میں شکر کیا۔
"تو جب آپ ہمارے گھر آئے تھے تب مجھ سے بات بھی نہیں کی اور اگنور کر دیا......" اس نے پھر سے پچھلی بات کو یاد کر کے شکوہ کیا، اشعر کو خوش گوار

حیرت نے گھیرا۔
''وہ تو میں تھوڑا سا خفا تھا، اب اتنا حق تو میرا بھی بنتا ہے۔'' اس نے شرارت سے آنکھ دبا کر کہا، ایمان جھینپ گئی۔
''میں نے اب چینج کرنا ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے اک دم سے لہنگا سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا۔
''نو۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو میں نے آپ کو جی بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ آپ کو سمجھانے میں ہی اتنا وقت گزر گیا۔'' اس نے ایمان کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''اشعر۔ آپ مجھے ''آپ'' نہیں بلکہ اب تم کہا کریں۔'' ایمان نے بات بدلی۔
''کیوں؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا
''آپ، مجھے آپ کہتے ہیں تو اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور مجھے آپ سے بات کرتے ہوئے اک جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ اب میں آپ سے ہر بات بلا جھجک کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔
''میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اس لیے آپ کو آپ کہہ کر پکارتا تھا مجھے اچھا لگتا تھا آپ کہنا۔'' اس نے عقیدت سے کہا۔
''میں جانتی ہوں آپ بہت عزت کرتے ہیں میری۔ میں بھی دل و جاں سے آپ کی عزت کرتی ہوں۔'' اس نے بھی آہستہ سے اعتراف کیا۔
''اور محبت......؟'' اشعر نے اس کے ہاتھ تھام کر برجستگی سے پوچھا۔
''مجھ...... مجھے اب چینج کرنا ہے پلیز۔'' اس نے اشعر کی محبت پاش نظروں سے گھبرا کر کہا اور جلدی سے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر بیڈ سے کھڑی ہوگئی۔
''ہاہاہاہا......'' ایمان کی گھبراہٹ دیکھ کر اشعر کا زندگی سے بھرپور قہقہہ بلند ہوا جو کہ پورے کمرے میں گونج گیا۔

''آپ بعد میں ہنس لینا، پہلے مجھے بتائیں میں کہاں چینج کروں؟'' اس نے اشعر کے قہقہے سے گھبرا کر روہانسی ہو کر پوچھا۔
''وہ ادھر رائٹ سائڈ پر واڈروب ہے ادھر چلی جائیں آپ۔'' اشعر نے ہنسی کو بریک لگا کر چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بتایا۔ ایمان اس کی بات سن کر جلدی سے وارڈروب میں گھس گئی۔
''جلدی چینج کر کے آنا آپ۔ ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں میں نے آپ سے۔'' اشعر کی شرارتی آواز اندر تک سنائی دی۔ وہ آہستہ سے مسکرا دی اور بڑبڑائی۔
''یہ اشعر بھی نا۔ بالکل پاگل ہیں۔''
اک بار پھر سے خوشیوں نے ایمان کی زندگی میں قدم رکھا تھا، اب یہ تو اس پر ہی منحصر تھا کہ وہ ماضی کو بھول کر خوشیوں کو اپناتی یا پھر ماضی سے چمٹ کر اپنی طرف آنے والی خوشیوں کا روک راستہ روک لیتی۔
لیکن اب اس کے سب خدشات، ڈر اور خوف کم ہو گیا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اشعر کے سنگ اس کی زندگی حسین ہونے والی تھی۔
اشعر بھی بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس نے جو چاہا تھا وہ پا لیا، وہ اپنے پاپا کا بھی بہت زیادہ شکر گزار تھا جنہوں نے ہر ہر موڑ پر اس کی مدد کی تھی، اور اپنے رب کا تو وہ جتنا بھی شکر ادا کرتا وہ کم تھا۔ اب اسے یہ امید تھی کہ بہت جلد ایمان بھی اس سے محبت کرنے لگ جائے گی۔
''آپ یہاں کھڑے ہیں۔'' ایمان کی آواز پر چونک کر اس نے پیچھے دیکھا، وہ چینج کر کے آ چکی تھی اب وہ سادہ سے سوٹ میں دھلے دھلے چہرے کے ساتھ نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر دھیمی سی اور آنکھوں میں چمک سی تھی۔ وہ پہلے والا بے تاثر چہرہ اور ویران آنکھوں کا دور دور تک کوئی شائبہ نہ تھا۔

''ہمم ...... میں چاند کو دیکھ رہا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر کھڑکی کے پار چمکتے چاند کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آپ کو چاند کو دیکھنا اچھا لگتا ہے؟'' اس نے اشعر کے خوشی سے چمکتے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں! لیکن اب تو میرا چاند میرے پاس آ گیا ہے۔'' اس نے محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ اک دم سے جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کک ...... کچھ بھی نہیں، وہ میں نے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے اسے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

اشعر جو سینے پر ہاتھ باندھے اس کی اٹھتی گرتی پلکوں اور گھبراہٹ بھرے لہجے سے محظوظ ہو رہا تھا اس کی بات سن کر حیرت سے بولا۔

''آپ نے مجھ سے جو بھی بات کرنی ہو بلا جھجک کر سکتی ہیں، کیونکہ مجھ سمیت میری ہر چیز پر آپ کا پورا حق ہے۔'' اتنا خوب صورت اعتراف سن کر وہ اس کو دیکھے گئی۔ کیا کوئی اتنی بھی محبت کر سکتا ہے کسی سے، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس کے دل میں اشعر کے لیے عزت اور زیادہ بڑھ گئی۔

''میری اتنی عزت کرنے کے لیے، مجھے اتنا مان دینے اور مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرنے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ اشعر۔'' اس نے جھکی نگاہوں کو اوپر اٹھا کر کہا اور پھر جلدی سے نگاہیں نیچے کر لیں کیونکہ وہ اس کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''ایمان۔ ایسی بات آج تو آپ نے کر دی ہے لیکن دوبارہ مت کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا آپ سے اور جس سے میں ناراض ہو جاؤں تو پھر میں جلدی مانتا نہیں اور نہ ہی اس سے بات کرتا ہوں پھر وہ جو مرضی کر لے۔'' اس نے ایمان کی بات سن کر انتہائی سنجیدگی سے کہا، کیونکہ اس کو ایمان کا ایسے کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''سس ...... سوری اشعر ...... وہ مم ......'' اس کے چہرے کی سنجیدگی اور رویے کی سختی دیکھ کر اور اس کی ناراضی کا سن کر ایمان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو اپنے اندر اتارا اور نم آلود آواز میں کہا۔

''ایمان۔ پلیز اب روئیں نہیں آپ۔ میں آپ کو روتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے آپ سے شکریہ نہیں چاہیے بس آپ مجھ سے اک وعدہ کریں کہ آپ ہمیشہ مجھ پر یقین کریں گی اور ہمیشہ خوش رہیں گی۔'' اس کو اپنی سنجیدگی اور سخت رویے کا احساس ہوا وہ تو چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر پیار سے اس نے ایمان کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔

''اشعر۔ آپ بہت اچھے ہیں، مجھے آپ پر پہلے ہی یقین ہے میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ ......

بنا تیرے اب میں کچھ نہیں اے میرے مہرباں
ہوئے جو تم مہرباں، تو ہے میری جان میں جاں

اس نے اپنی دھیمی آواز میں شعر پڑھا۔

جبکہ اشعر اس کے اتنے خوب صورت اعتراف پر دل سے مسکرا دیا اور پھر اس نے اپنی باہیں پھیلا کر اس کو اپنے محبت بھرے مضبوط حصار میں لے لیا۔ وہ بھی خاموشی سے اس کے سینے میں سر چھپا گئی کیونکہ اب یہ خوب صورت دل والا انسان ہی اس کی خوشیوں کا محور اور اس کی عزت کا محافظ تھا۔

باہر کھڑکی کے پار کھڑا مہینے کے آخری دنوں کا چاند بھی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

☆☆

ثانیہ چوہدری

دائرۂ وفا

کبھی آپ نے قسمت کا دھنی یا خوش نصیب جیسے الفاظ سنے ہیں، پڑھے ہیں؟

نہیں؟

چلیں میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ ایک ایسے لڑکے کی کہانی جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا تو نہیں ہوا تھا لیکن اس نے قسمت بڑی اچھی پائی تھی۔ آپ میں سے بہت سے لوگ قیافہ شناسی میں بھی ماہر ہوں گے اور اس وقت سوچ رہے ہوں گے کہ جس کی کہانی میں سنانے جا رہا ہوں کہیں وہ میں ''خود'' تو نہیں؟

بالکل، آپ ٹھیک سمجھے۔ میں آپ کو اپنے بارے میں بتانے لگا تھا۔ جی تو میں کہہ رہا تھا۔

''احسن! آپ کو کتنی دفعہ کہا ہے کہ بچوں کو ٹیبلٹ یا موبائل مت دیا کریں۔ کل بھی جیا کتنی دیر روتی رہی تھی کہ میں اسے گیمز کھیلنے کے لیے اپنا موبائل دوں۔ یہ آپ کی ہی کارستانیاں ہیں بچوں کو گیمز لگا کر دینے والی۔''

''بیگم۔ بچے ہیں ان کی بات نہ مانی جائے تو ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور جیا تو اپنے لاڈ اٹھوانا خوب جانتی ہے۔'' جھنجلائی ہوئی انعم کو میں نے تسلی دینا چاہی تھی لیکن میں جانتا ہوں اب اس گھر سے موبائل، ٹیبلیٹ اور لیپ ٹاپ کسی ایسی جگہ منتقل کر دیے جائیں گے جہاں بچوں کے ساتھ ساتھ میری پہنچ بھی ممکن نہیں ہوگی۔

خیر، اصل مدعے پر واپس آتے ہیں۔ میری زندگی بہت سہل گزری ہے۔ یہ غم، پریشانیاں اور الجھنیں کن بلاؤں کے نام ہیں، میں قطعاً نہیں جانتا۔ ابا میاں کا اپنا کاروبار تھا اور اماں گھریلو سی خاتون۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے مجھے اسی عزت اور مقام و مرتبے سے نوازا گیا جو عموماً ''اکلوتے'' کو ہمارے ہاں دی جاتی ہے۔ میرا ددھیال خاصا بھرا پرا تھا۔ میرے کتنے ہی کزن میرے ہم عمر تھے اور مجھے کبھی اکیلا ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن بہرحال تھا تو میں ''اکلوتا'' نا۔

بچپن گزرا اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا اپنی اہمیت کا احساس نشے کی مانند میرے حواس پر چھاتا جا رہا تھا۔ جوانی کی عمر بھی کچھ لاابالی ہوتی ہے، ہمہ وقت مستی سی چھائی رہتی ہے۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ جو چاہوں گا، پالوں گا اور......

ایک دن کالج سے گھر آیا تو انعم لان میں موتیے کے پھول جمع کر رہی تھی۔ کچھ پھول اس نے کانوں اور بالوں میں ٹکائے ہوئے تھے اور کچھ گود میں رکھے دھاگے میں پرو رہی تھی۔ مجھے یکدم شرارت سوجھی تھی اور میں نے اسے پیچھے سے جا کر ڈرا دیا۔ وہ گھبرا کر اچھلی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے پھول احتجاجاً مجھ پر پھینکے تھے اور روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اور میں اس کی روتی ہوئی آنکھوں، اس کے کان میں لگے موتیے کے پھولوں اور وہ دھاگے میں پروئے ہوئے سفید پھولوں میں اپنا چین ڈھونڈتا رہ گیا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔

میری پہلی نظر کی محبت۔

مگر وہ کہتے ہیں نا کہ جس چیز کو شدت سے چاہا جائے، اسے حاصل کرنے کے لیے بھی بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی ہے تب جا کر انعام ملتا ہے۔ انعم کا حصول میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ میرے چچا کی بیٹی تھی۔ مجھ جیسا لائق فائق، وجیہہ اور شاندار خاندان میں دوسرا کوئی

نہیں تھا۔ چچا کو بھلا کیا انکار ہوتا۔ میں نے اماں سے ذکر کیا تھا اور گویا بھونچال آگیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ اماں انعم کو بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں یا کوئی خاندانی چپقلش تھی۔

وجہ تھی......صائم!

میرا کزن اور میرا بہترین دوست۔

انعم بچپن سے ہی صائم کی منگ تھی۔ دادی نے صائم اور انعم کا رشتہ طے کیا تھا۔ مگر میں یہاں آکر ڈٹ گیا تھا۔

"شادی کروں گا تو صرف انعم سے۔"

مجھے حیرانی ہو رہی تھی میرے منہ سے نکلنے سے پہلے ہی میری خواہش پوری کرنے والے والدین آخر کیوں نہیں مان رہے تھے؟ بس انعم کی شادی صائم کے بجائے مجھ سے ہو جاتی۔ آخر کیا قباحت تھی اس میں؟

اماں نے حتمی فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ کبھی بھی چچا سے میرے رشتے کی بات نہیں کریں گی۔ دراصل اماں روایات اور وعدوں کی پاس داری کرنے والی عورت تھیں۔ مجھے ان کے فیصلے سے شدید دھچکا پہنچا تھا اور میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

میری خوش نصیبی کہ میں بچ گیا تھا اور یوں بند کواڑوں سے نکل کر یہ خبر پورے خاندان میں پھیل گئی۔ اماں تو یوں منہ چھپائے پھرتیں جیسے میں نے محبت نہیں گناہ کر لیا ہو۔ انہیں دنوں صائم نے انعم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ وہ اپنی کسی کولیگ کو پسند کرتا تھا اور یہ بات میرے حق میں اچھی ثابت ہوئی تھی۔ میں نے کہا نا کہ میں قسمت کا دھنی ہوں جو مانگتا ہوں بڑے آرام سے پالیتا ہوں۔ مجھے ابھی تھوڑی دیر قبل انعم سے کہی گئی بات یاد آرہی ہے کہ بچوں کی نہ مانی جائے تو ہنگامہ مچا دیتے ہیں بالآخر میری ضد سے تنگ آکر اماں میرا رشتہ لے گئیں۔

"احسن کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آجایئے۔"

مجھے انعم آواز دے رہی ہے۔ میں چلتا ہوں۔



میرے دل کی تمنا، خواہش انعم تھی اور اسے پا کر مجھے یوں لگتا ہے دونوں جہاں کی خوشیاں پالی ہوں۔

☆☆☆

"انعم تو میرے صائم کی دلہن بنے گی۔"

بچپن سے ہی دادی اور تائی اماں کے منہ سے سن سن کر میرے کچے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میری شادی صائم سے ہو گی۔ بچپن میں کوئی بھی کھیل کھیلتے میں ہمیشہ چاہتی کہ صائم میرا ساتھی بنے لیکن وہ ہر بار احسن کو چنتا تھا۔ احسن صائم کا پکا والا دوست تھا۔ صائم تھا بھی بہت اچھا، سب کا خیال رکھتا تھا۔ احسن ہمیشہ دادی کا چشمہ چھپا دیتا اور صائم چپکے سے ڈھونڈ نکالتا تھا۔ وہ سب کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتا تھا اور مجھے اس کی یہی عادت اچھی لگتی تھی۔ نویں جماعت میں جب میں فیل ہو گئی تو انیلا اور رمشا نے گھر آکر سب کو بتا دیا تھا۔ احسن نے میرا بہت مذاق اڑایا تھا۔ میں بہت روئی تھی اس دن......

وہ صائم ہی تھا جس نے آ کر مجھے تسلی دی تھی اور روز پڑھانے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

وہ روزانہ رات کو مجھے پڑھاتا تھا، اسی کی بدولت میٹرک میں میں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ میری صائم سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی، وہ میری ہر سالگرہ پہ مجھے تحفہ دیتا تو مجھے اپنا آپ بہت "خاص" محسوس ہوتا تھا۔

میں بارہویں جماعت میں تھی جب میں نے دادی اور امی کی گفتگو سنی تو مجھے پتا چلا کہ جب میں پیدا ہوئی تو دادی نے مجھے صائم سے منسوب کر دیا تھا، میرا دل مزید خوش فہم ہوا تھا اور میں پہروں اسے سوچنے لگی تھی۔ اس سے جو دل کا رشتہ محسوس ہوتا تھا وہ یوں ہی نہیں تھا۔ صائم کے میرے لیے کیا جذبات تھے...... میں نہیں جانتی تھی۔

وہ بھی تو جانتا ہو گا میرے اور اپنے رشتے کے بارے میں؟ میں اکثر سوچتی۔

میں مطمئن تھی کہ دنیا کا سب سے اچھا انسان "صائم" جلد میرا ہونے والا ہے۔ مجھے یاد ہے وہ دن جب صائم کو جاب ملی تھی۔ وہ ہم سب کزنز کو ٹریٹ دینے کے لیے باہر لے کر گیا تھا اور ساحل سمندر بھی۔

وہ کیسے جان گیا تھا کہ ساحل سمندر ننگے پاؤں چلنا مجھے بہت پسند ہے، میں اسے چپکے چپکے دیکھنے کی کوشش کرتی تھی اور وہ جیسے میری اس کوشش کے بارے میں پہلے سے ہی باخبر ہوتا تھا۔ میری اس چوری کو فوراً پکڑ لیتا تو میں شرمندہ ہو جاتی تھی۔ مجھے سمندر کی گہرائی سے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا، اس دن بھی میں دور کھڑی سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کو دیکھ رہی تھی، اچانک احسن دوڑتا ہوا آیا تھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سمندر کی طرف کھینچنے لگا تھا۔ میں نے ڈر کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

"انعم کو سمندر سے ڈر لگتا ہے۔ نہیں تنگ کرو اسے احسن۔" صائم کے کہنے پہ احسن نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ممنون نگاہوں سے صائم کو دیکھا۔

احسن سے مجھے عجیب سی چڑ محسوس ہوئی، کیسا عجیب شخص تھا وہ، دوسروں کو تنگ کر کے جانے کیسا سکون محسوس کرتا تھا لیکن وہ لمحہ میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ صائم میری پسند نا پسند کیسے جانتا تھا؟ اسے کیسے خبر ہو جاتی تھی؟ ایسی سوچیں مجھے خوش فہم کرنے لگتیں۔ اس کے دل میں میرے لیے جذبات ضرور تھے ورنہ وہ میری پروا کیوں کرتا؟

میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتی اگر صائم کی اپنی کسی کولیگ سے شادی کی خبر نہ سنتی، میں یہ...... خبر سن کر ٹوٹ گئی تھی۔ بکھر گئی تھی۔ یہ جھوٹ تھا۔ میں نے صائم کی نظروں میں اپنے لیے کچھ محسوس کیا تھا۔ کچھ انوکھا لیکن وہ سب فریب ٹھہرا، میری نظروں کا دھوکا تھا۔ ان دنوں میں جب میں اپنے ریزہ ریزہ ہوئے دل کی کرچیاں اٹھانے میں ہلکان تھی۔ چچی مجھے احسن کے لیے مانگنے چلی آئیں۔ بابا نے انہیں ہاں کر دی۔ وہ مجھے جلد از جلد بیاہنا چاہتے تھے۔ میری شادی احسن سے ہو گئی۔ احسن مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ میں ان کی سنگت میں اک آسودہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ اب کبھی بھولے بھٹکے صائم کا خیال آئے تو میں بس مسکرا کر رہ جاتی ہوں کیا بے وقوفانہ پن تھا میرا۔

مجھے احسن بلا رہے ہیں...... میں چلتی ہوں۔ ذرا بھی آنکھ سے اوجھل ہو جاؤں تو شور مچا دیتے ہیں۔

☆☆☆

مجھے میری کمپنی کی طرف سے پروموشن ملی تھی، نیا گھر اور فیملی کے ساتھ عمرہ کے ٹکٹس بھی۔

ابھی چند دن پہلے ہی میں اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ عمرہ کر کے آیا ہوں۔

میں اس وقت کمپنی کی طرف سے ملے شاندار گھر کے لاؤنج میں اپنے بیٹے حاذق کے ساتھ بیٹھا ہوں اور میری بیوی میرب، حاذق اور میری فرمائش پہ لزانیہ بنا رہی ہے۔ بظاہر زندگی میں سب کچھ نارمل

چل رہا ہے۔ اچھی جاب، پیار کرنے والی بیوی اور حاذق کے آنے سے اولاد کی کمی بھی جاتی رہی۔

''صائم کہاں کھو گئے ہیں؟'' میرب نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو میں ہوش کی دنیا میں واپس لوٹا تھا۔ میرب دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے ابھی بھی مجھے دیکھ رہی تھی، میں مسکرایا۔

''ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

''ممی کی کال آئی ہے۔ کل بابا کی برسی ہے تو انہوں نے کہا ہے ہم کل وہاں آئیں۔''

''اچھا۔'' اس نے میری ماں کی فون کال کا تذکرہ کیا اور میں بے دھیانی میں بس اسے دیکھتا رہا۔ وہ مزید کیا کہہ رہی تھی؟ میں بہرہ ہو گیا تھا۔ دماغ میں تیز جھکڑ چلنے لگے تھے۔ کل وہ بھی وہاں ہوگی اور مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

کون؟

ہر مکمل انسان کے پیچھے کچھ کمیاں چھپی ہوتی ہیں جو اسے مکمل کر دیتیں ہیں۔ میں بھی بظاہر ایک مکمل انسان ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال ہوں لیکن کچھ کمیاں، کچھ خامیاں ہیں جو اس مکمل وجود کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔

اور اپنا آپ کسی کے سامنے عیاں کرنا انتہائی تکلیف دہ امر ہے، وہ زخم جو آپ زمانے سے چھپا کر بیٹھے ہوتے ہیں، رسنے لگتے ہیں اور درد پھر سے کروٹیں لینے لگتا ہے۔''

وہ وہاں آئے گی۔ میں جانتا ہوں۔

وہ یعنی ''انعم''

میری بچپن کی منگ جسے چھوڑ کر میں نے میرب سے شادی کر لی تھی۔ آج تک سب کے لیے یہ بات معمہ ہی رہی کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اماں نے رو رو کر آنکھیں سوجھالی تھیں اور دادی میرے انکار کو سینے سے لگائے یہ جہاں چھوڑ گئی تھیں، میں سب کی نظروں میں ناپسندیدہ ٹھہرا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی اگر تھی تو صرف انعم کی۔ میری آنکھوں کے دیے ہمیشہ اس کو دیکھ کر جل اٹھتے تھے۔ میں نے ''اسی سے'' شادی سے انکار کر دیا۔

جب میں نے میرب سے شادی کی تو میں چاہتا تھا وہ بھی آ کر سب کی طرح مجھے برا بھلا کہہ لے، دل کی بھڑاس نکال لے لیکن وہ نہیں آئی تھی اور شاید مجھ میں بھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

احسن میرا کزن ہی نہیں بہترین دوست بھی تھا اور مجھے بے تحاشا عزیز بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تو میں بہت ہنسا بھلا اس جیسے محبتیں سمیٹنے والے کو بھی کسی سے محبت ہو سکتی ہے اس کی باتوں سے شدت واضح ہوتی تھی اور ایک دن اس نے مجھے کال کی تھی۔ وہ شاید ہوش میں نہیں تھا، بے ربط بولتا رہا اور اپنی محبت کا اعتراف کرتا رہا، میں اس کی باتوں پر حیران تھا احسن کو کیا ہو گیا تھا اور فون بند ہو گیا۔

پانچ منٹ بعد چچا کی کال آئی تھی۔ احسن نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ لمحے مجھ پر قیامت تھے۔ قیامت کیا ہوتی ہے؟ مجھے اس دن پتا چلا تھا۔ احسن میرا بھائی میرا دوست...... میں نے چچا سے ساری بات اگلوا لی تھی۔ چچا بتاتے ہوئے بہت شرمندہ تھے اور میں دنگ تھا۔ یہ قسمت کس موڑ پہ لے آئی تھی۔

''میرے بیٹے کو بچالو صائم۔'' چچا ہاتھ باندھے گڑگڑا دیے تھے اور انہوں نے کہا کہ میں انعم سے شادی سے انکار کر دوں۔ میرے انکار کی وجہ ''احسن'' اور ''چچا'' تھے۔ رشتے بچاتے بچاتے میں اپنی محبت ہار گیا۔ میں نے انعم کا دل توڑ دیا تھا۔

انعم کے ٹوٹے ہوئے دل کا مدفن میرے دل میں ہے اور میرا دل ''تاعمر'' اس کے سوگ میں گزارے گا۔

☆☆

عمارہ خان

جس دن تم لاگے

''شہریار کیوں بہن کو ستاتے ہو بچے، بس بھی کرو۔'' مہرالنساء نے بالآخر تھک کے کہا۔ ''دیکھو کتنے دنوں سے گھر کا ماحول بھی خراب ہو رہا ہے۔''

شہریار نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اپنی بڑی بہن کو دیکھا جو ہر چیز کا الزام اس پہ لگاتے ہوئے خود بری الذمہ ہو رہی تھیں۔

''اس دن کے لیے پال پوس کے تمہیں پالا تھا کہ تم اتنی سی بات کے پیچھے ضد لگاؤ مجھ سے۔''

''ضد آپ نے باندھ رکھی ہے آپی۔'' شہریار نے ہر ممکن نرمی سے اپنی جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے میری زندگی کا معاملہ ہے۔''

''میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں شہریار۔ تمہاری دشمن تھوڑی ہوں بیٹے۔''

''پھر مان لیں نا میری بات۔'' شہریار نے ترنت جواب دیا۔

''تم آگ مانگ رہے ہو، ہاتھ جل جائیں گے۔'' مہرالنساء نے ہار نہیں مانی تھی۔ ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ بیٹے جیسا بھائی ان کی بات مان لے۔

''وہ تمہارے لائق نہیں ہے شہری۔ میرا بھی کوئی زندگی کا تجربہ ہے آخر۔''

''کوئی بات نہیں آپی، مجھے کم از کم تسلی رہے گی، میری اپنی چوائس تھی۔'' شہریار نے بھی ان کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ ''آپ فکر مت کریں، بس یہ سوچ کر ہاں کہہ دیں آپ کے بھائی کی خوشی اسی میں ہے۔''

''میرا بھی کوئی فرض ہے، ایسے کیسے تمہیں نقصان کا سودا کرنے دوں۔ ابو امی کو کیا جواب دوں گی، تمہارا اتنا سا خیال نہیں رکھ سکی۔'' اس بار مہرالنساء نے جذباتی طور پہ اپنے مہرے آگے بڑھائے۔

''آپ اپنی مرضی کریں گی تو مجھے کھو دیں گی پھر۔ ترسیں گی مجھے خوش دیکھنے کے لیے آپی۔'' شہریار نے بھی حتمی جواب دیتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''اب چوائس آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے، جو دل چاہے کریں۔ میں تھک گیا ہوں روز روز کی اس عدالت سے۔''

''شہری......''

''بس آپی بس۔'' شہری نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے مہرالنساء کو دیکھا اور اپنے الفاظ پہ زور دیتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''ایک بار وہ چلی گئی تو سمجھ لیں میری زندگی کا سکون بھی چلا جائے گا۔''

☆☆☆

''فلک ناز صرف ایک موقع اور دو مجھے پلیز۔''

کراچی کے ایک پوش علاقے میں بنا یہ حسین شاپنگ مال جگمگاتی لائٹس سے رات کو بھی دن کا سماں کیا ہوا تھا، اسی مال کے ٹاپ فلور پہ بنے کیفے میں فلک ناز جو گلابی شارٹ شرٹ کے ساتھ سفید کلر کی ٹیولپ شلوار میں دل تک اتر جانے والی حسین لگ رہی تھی تو دوسری طرف شہریار بھی مردانہ حسن کا شاہکار تھا۔ آس پاس کی میزوں پہ بیٹھے لوگ بے

ساختہ کئی بار ان دونوں کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن...... لیکن وہ دونوں سب کی نظروں سے بے نیاز ایک دوسرے کو تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''تم فکر مت کرو، مجھے یقین ہے آپی مان جائیں گی، بس آخری چانس سمجھ کے ایک اور موقع دے دو۔''

''مجھے نہیں لگتا شہری! وہ مانیں گی، ان کی آنکھوں میں حقارت تھی میرے لیے۔'' فلک کی بھیگی آواز نے شہریار کا دل چیرا۔ ''وہ مجھے پسند نہیں کرتیں، تمہیں بھی علم ہے۔''

''تمہیں میری آنکھوں کی محبت نہیں نظر آتی یار اور آپی کی ایک ہی ملاقات میں حقارت نظر آ گئی۔'' شہریار نے افسردہ ہو کے سوال پوچھا۔ ''فلک! کیا واقعی تمہیں مجھ پہ بھروسا نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے شہری! مجھے تم پہ بھروسا ہے



لیکن تم ایک معمولی سی بات ہمیشہ بھول جاتے ہو۔" فلک ناز نے بے رحمی سے مسکراتے ہوئے شہر یار کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اور وہی بات دنیا والے نہیں بھولتے۔"

"مجھے دنیا والوں کی نہ پہلے پروا تھی نہ اب ہے، اس بات کو یاد رکھو فلک ناز!" شہر یار نے مضبوط لہجے اپنی بات دہرائی۔ "مجھ پہ بھروسا رکھو، تم نہیں تو اور کوئی نہیں اور یہ بات آپی کو بتا چکا ہوں میں۔"

فلک نے لو دیتی ہوئی آنکھوں سے نظریں چرائیں۔

"بجائے ہمت دینے کے تم مجھے توڑتی ہو یار۔ میں دو دو محاذ پہ ایک ساتھ نہیں لڑسکتا۔ کم از کم تم تو یقین رکھو مجھ پہ۔" شہر یار نے تھکے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھ میز پہ رکھے اور ان پہ اپنا سر گرا لیا۔

"شہری۔" فلک نے بے ساختہ ہی اپنا ہاتھ بڑھا کے اسے تسلی دینا چاہی اور جھجک کے رک گئی۔

"آئی ایم ساری بٹ یو نو......"

"یس آئی نو، آئی نو ویری ویل فلک ناز۔ تم ایک بیوہ ہو۔ مجھے معلوم ہے یہ بات اور تم یاد رکھوانے میں ماہر ہو۔ لیکن تم کیوں یہ بات نظر انداز کر دیتی ہو میں تمہیں چاہتا ہوں، ابھی سے نہیں بہت پہلے سے اور میرے جذبوں کو تمہارے بیوہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم یہ بات کیوں یاد نہیں رکھتیں یار۔ پلیز ٹرسٹ می، کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن میں تم کو جیت لوں گا۔" شہر یار نے اداس آنکھوں والی لڑکی کو اعتماد دیا۔ خود مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ مرد تھا اسی لیے کمزور نہیں پڑسکتا تھا۔ "تم اس ویک اینڈ پہ ملو یقیناً میرے پاس ہم دونوں کے لیے خوش خبری ہوگی۔"

"ویک اینڈ پہ پھر......" فلک نے پریشانی سے سامنے بیٹھے اپنے روشن مستقبل کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔ "مجھے مشکل میں مت ڈالا کرو شہری! ایسے بار بار ملنا۔ یو نو......"

"اوہ کم آن فلک! میں خود ڈراپ کر دوں گا تم کو۔ پھر کیا مسئلہ ہے۔"

"مسئلہ...... مسئلہ صرف اتنا سا ہے۔ میں صرف بیوہ ہی نہیں شہری!" فلک ناز نے اپنے آنسو پیتے ہوئے نظریں جھکائیں۔ "بلکہ ایک آٹھ سالہ بیٹے کی ماں بھی ہوں، جو یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔ ہاں شہری! چاہ کے بھی میں خوش نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے آس پاس رہتے لوگ اس بات کو حتمی بناتے ہیں کہ کہیں وہ مجھے ہنستے نہ دیکھ لیں اور اگر میں انہیں کہیں ہنستی مسکراتی یا کسی کے ساتھ ایسے چائے پیتی نظر آ گئی تو وہ لوگ......نہیں تمہیں نہیں معلوم، میں نے یہ آٹھ نو سال کس طرح گزارے ہیں۔ ایک تنی ہوئی رسی تھی اور میں تھی، جو ایک ذرا بھی لڑکھڑا نا نہیں سہہ سکتی تھی ورنہ نیچے پھیلی ہوئی کھائی میرے بیٹے کو اپنے اندر نگل لیتی۔ اس معاشرے میں جس طرح ایک بیوہ کو رہنا ہوتا ہے کاش اس کا ایک فیصد بھی تمہیں اندازہ ہوتا۔" بھیگی ہوئی آواز شہر یار کو احساس دلا رہی تھی، اس نے فلک ناز کو ایک بار پھر جذباتی طور پہ ہلا دیا ہے۔

"تمہیں معلوم ہے شہری! میں اکثر سوچتی ہوں کاش ہم لوگ، جن کے مذہب میں بیوہ عورتوں کی شادی کا حکم ہے کہ جلد سے جلد وہ شادی کر لیں۔ ہم لوگ اپنی ہونے والی بیوہ عورتوں کو ہندوؤں کی طرح شوہر کی ساتھ ہی ستی کیوں نہیں کر دیتے۔ انہیں زندہ مارنے سے تو بہتر ہے وہ وقتی طور پہ آگ میں جل مریں تاکہ سکون سے راکھ بن کے کھلی فضا میں سانس تو بھر سکیں۔ یقیناً وہ آگ کی لپٹیں ان سوال کرتی نظروں سے بہتر ہوں گی جو ہم لوگ ساری زندگی برداشت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہم اکیلی عورتوں کو پتا نہیں کیوں سانس لینے کی اجازت دیتے ہیں۔"

شہر یار بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ مسلسل بولتی ہوئی فلک ناز کے بخ بستہ ہاتھوں پہ رکھ گیا۔ شہری کا اپنائیت بھرا لمس پاتے ہی فلک ایک دم خاموش ہو گئی، یقیناً وہ اپنے اتنا بولنے پہ شرمندہ تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا اس میں شہر یار کا بھلا کیا قصور تھا لیکن

شاید وہ بھی تھک گئی تھی معاشرے کے دہرے معیار کو جیتے جیتے۔

''سوری شہری! لیکن یقین کرو میں بہت مجبور ہو کر تم سے ادھر ملنے آتی ہوں۔ اتنے سالوں تک خود پہ جبر کرتے کرتے میں بھی تھک گئی ہوں۔ تمہاری شکل میں اپنے بیٹے کا اچھا مستقبل اور اس کا احساس محرومی کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔'' شہری نے ایک دم سکون کی سانس لی۔ فلک ناز نے خود پہ قابو پالیا تھا۔

''بلال بڑھتی ہوئی عمر میں ہے، اس کے لیے ایک باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو اس بات کو۔ پلیز مجھے دوبارہ ملنے کے لیے مت کہنا، میں نے بہت پھونک پھونک کے قدم رکھے ہیں کہ کسی کا کہا ایک جملہ بھی میرے کردار پہ وہ سیاہی نہ لگا دے جو میں انگاروں پہ چل کے بھی صاف نہیں کر پاؤں۔'' فلک ناز کی بھیگی آواز سنتے ہی شہری نے تسلی آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن اسی کے ساتھ ایک بار پھر شہریار کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم پڑ گیا تھا، جس کی مدد سے وہ اس لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلا سکے۔

☆☆☆

تین کمرے کے اپارٹمنٹ میں اس وقت گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی سوائے ایک کمرے کے جہاں فرسٹ ایر کی صنم اپنی عمر کے حساب سے ٹی وی ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی لیکن برابر والے کمرے میں مسلسل بجتا ہوا موبائل اس کی توجہ بھٹکا رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ ڈرامے کا تسلسل خراب ہو رہا تھا۔

''ماموں! آپ کا فون ہے۔''

شہریار جس کو آج کل اپنا ہی ہوش نہیں تھا وہ بھانجی کی آواز سے کہاں متوجہ ہوتا۔ وہ خلا میں ایک ٹک کھویا ہوا اپنی آنے والی زندگی کا حساب کتاب کر رہا تھا۔

''ماموں...... ماموں ں ں ں......''

صنم نے ٹھنک کر اس کے کمرے کا ادھ کھلا دروازہ پورا کھولتے ہوئے بولا۔

''جی بچے۔'' شہریار چونک کر بولا۔ ''کیا ہوا؟''

''آپ کا فون آرہا ہے کب سے، پتا نہیں کون سی دنیا میں ہیں آپ۔'' صنم نے فون شہریار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اوہ کس کا فون ہے وہ بھی اتنی رات گئے۔'' شہریار نے فون کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''چھوڑو میں کال بیک کرلوں گا بعد میں۔''

''کیا ہوا ماموں! آپ اتنے دنوں سے پریشان کیوں ہیں؟'' صنم نے ماموں کے چہرے پہ چھائی ہوئی تھکن بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ایک طرف آپ ایسے خاموش ہو گئے ہیں اور ماما بھی روز بلڈ پریشر کی دوائی کھا رہی ہیں، عجیب سا ماحول ہو گیا ہے ہمارے گھر کا۔'' صنم نے کمرے میں موجود ماموں کو خاموش اور خود سے بھی انجان دیکھا تو بولے بنا نہیں رہ سکی۔

کہاں شہری ماموں کی پرسنالٹی کے اس کے کلاس فیلوز دیوانے تو اب کہاں وہی ماموں بڑھی ہوئی شیو اور مسلی ہوئی شرٹ میں اداس بیٹھے ہوئے تھے، جیسے ان کی دنیا لٹ گئی ہو اور وہ بے بسی سے لٹی ہوئی دنیا کو دیکھ رہے ہوں۔

''ارے کچھ نہیں ماموں کی جان۔ بس ایک چھوٹا سا ایشو ہے جلد ہی صحیح ہو جائے گا، تم فکر نہیں کرو۔'' شہریار کو قطعی اندازہ نہیں تھا صنم اتنی گہرائی سے گھر کے ماحول کا تجزیہ کر رہی ہے۔ اس کے نزدیک تو صنم ابھی چھوٹی سی بچی تھی جو صرف اسکول سے نکل کے کالج آ گئی تھی۔

''نہیں جی۔'' صنم نے منہ بناتے ہوئے شہریار کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کو یاد دلایا۔ ''میں کالج جانے لگی ہوں اور بڑی بھی ہو چکی ہوں۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔'' صنم نے سرگوشی کرتے ہوئے اپنے ماموں کو جتایا۔

''آپ جہاں شادی کرنا چاہتے ہیں ماما وہاں راضی نہیں ہیں نا؟'' صنم نے معنی خیز انداز میں بات کا اختتام کیا۔

''ہیں......؟ یہ تم اتنی بڑی کب سے ہوگئیں کہ ایسے معاملات میں دخل دینے لگو۔''

شہریار نے حیرانی سے اس بڑھتے قد کی نوجوان لڑکی کو دیکھا جو کچھ ہی سال پہلے دو پونیاں باندھے آپی کی انگلی تھامے، روتی ہوئی شہریار کے آبائی گھر میں آئی تھی۔ آپی کے میاں نے دوسری شادی کرلی تھی اور آپی نے اس چیز کو اپنی شدید توہین جانتے ہوئے خلع کا فیصلہ کرلیا تھا۔ رشتے داروں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے بیٹی کو ساتھ لیا اور اپنے اکلوتے بھائی شہریار کے پاس آگئیں۔ جو خود بھی اس وقت فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ کچھ ہی عرصے پہلے ماں باپ حج کرنے گئے تھے لیکن واپس آنا نصیب میں نہ تھا اور وہ وہیں سے اپنے ابدی سفر پہ روانہ ہوگئے۔ پیچھے رہ جانے والا شہریار اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا اس کڑے وقت میں آپی نے ماں بن کے اس کی دلجوئی کی اور گزرتے وقت کے ساتھ جہاں وہ سنبھلا وہیں آپی کا گھر خراب ہوتا چلا گیا۔ آپی کے گھر چھوڑ کے آتے ہی ان دونوں نے اپنا آبائی مکان بیچا اور شہریار کے آفس کے نزدیک ایک اپارٹمنٹ لے کے دونوں بہن بھائی رہنے لگے اور اب آپی کے ساتھ آنے والی بچی آج شہریار سے اس کی شادی کی بات کررہی تھی جس کے لیے وہ کچھ ہی عرصہ پہلے کالج سے چاکلیٹ لاتا رہا تھا اور وہ ہر وقت کندھے سے لٹکی فرمائشیں کرتی نہیں تھکتی تھی۔

''کیا ہوا ماموں؟'' صنم نے ٹکٹکی باندھے ماموں کو اپنی سمت دیکھتا پایا تو فوراً ہی مصنوعی کالر فخر سے کھڑے کیے۔ ''دیکھ لیں مجھے ہر چیز معلوم ہے اور بس اب آپ مجھے زیادہ نہیں بنائیں۔''

''کیا باتیں ہورہی ہیں ماموں بھانجی میں بھئی؟'' مہرالنساء نے بہت دنوں بعد گھر میں زندگی سے بھری ہوئی آوازیں سنیں تو اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

''آپی! یہ صنم کتنی بڑی ہوگئی ہے نا۔'' شہریار ابھی تک حیرت کا ہی شکار نظر آرہا تھا۔

''ہاں تو وقت گزرتے معلوم ہی کہاں ہوتا ہے، ابھی تم کالج جاتے تھے اور اب دیکھو کیسے آفس جانے لگے ہو۔'' مہرالنساء نے پیار بھری نظروں سے صنم اور اپنے بھائی کا احاطہ کیا۔ ''تم دونوں بڑے ہوگئے، میں بوڑھی ہوگئی بس اتنا سا فرق آیا ہے ان گزرے برسوں میں۔''

''ارے آپ بوڑھی کہاں سے ہوگئیں آپی۔'' شہریار نے فوراً ہی اپنی بہن کی دل جوئی کی۔ ''آپ سے تو گھر قائم ہے، ہم ہیں اور یہ چھٹکی ہے۔ چلو صنم جاؤ کافی بنا لاؤ، بہت دن ہوئے تمہارے ہاتھ کی کافی نہیں پی۔'' شہریار کا موڈ ایک دم بدلا۔

''اچھا ماموں جی! مجھے بھگا رہے ہیں۔'' صنم نے شرارتی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اب تمہاری بھی وقت پہ شادی ہوجاتی تو میں کب کی پھپھو بن چکی ہوتی۔'' مہرالنساء نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بات شروع کی۔ ''اچھی نوکری پہ ہو، مناسب کماتے ہو کس بات کا انتظار ہے اب۔''

''میری شادی؟'' شہریار نے زیرلب کہا۔

''ہاں، کیوں شادی نہیں کرنی تمہیں کیا، کنوارے رہو گے۔'' مہرالنساء نے شگفتہ انداز میں ہنستے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

''آپ راضی ہوجائیں تو کل ہی سہرا باندھ لوں گا آپی۔'' شہریار نے ایک بار پھر اپنا کیس لڑنے کے لیے پر تولے۔

''شہریار......!'' مہرالنساء نے خفگی سے اسے پکارتے ہوئے دیکھا۔

''کیا برائی ہے فلک میں آخر۔ آپ ایک بار ٹھنڈے دل سے......''

''وہ ہی کیوں، کیا سارے جہاں کی لڑکیاں مرگئی ہیں جو تم ایک بیوہ سے شادی کروگے۔'' ہمیشہ کی طرح مہرالنساء فوراً ہی جذباتی ہوگئیں۔ ''کیا کمی ہے تم میں، کون سی ایسی مجبوری ہے جو اس......''

''آپی......''

"دیکھو شہری! وہ نہ صرف بیوہ ہے بلکہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ سارے کھیل کھیل چکی ہے۔ تم نہیں جانتے ایسی عورتوں کو، بہت چلتر آتے ہیں ان کو، تم جیسے اکلوتے لڑکے کو پھنسانے کے۔ ورنہ جس لڑکی کی ایک بار شادی ہو جائے، اولاد ہو جائے وہ کہاں بن ٹھن کے لور لور پھرتی ہے۔" مہر النساء کی بولتے بولتے سانس پھول گئی لیکن وہ جانتی تھیں آج اس مسئلے کو ختم نہیں کیا تو پھر آگے بھی کبھی ختم نہیں ہوگا۔ گھر پہ چھائی ہوئی اتنے دنوں کی تلخی آج کم ہوئی تھی تو موقع کا فائدہ اٹھانا بنتا تھا۔

"کیوں پرائی اولاد کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہو۔ اللہ رکھے تمہاری اچھی جگہ شادی ہوگئی تو دیکھنا کیسے دنوں میں بیٹوں کی لائن لگ جائے گی۔ وہ یتیم اور بیوہ ہی رہ گئے ہمارے لیے......"

"اُفف۔ مت بولیں اتنا تلخ مت بولیں۔ پلیز آپی! خدا سے ڈریں۔" شہریار نے کرب سے آنکھیں بند کی۔

"کیا جھوٹ ہے اس میں بتاؤ تم؟ کیسے بن ٹھن کے وہ آتی تھی تمہارے آفس، میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہوا ہے۔"

"وہ نوکری کرتی ہے، اس کی ضرورت ہے خود کو مین ٹین رکھنا اور وہ میرے آفس جائے یا کسی اور کے آفس جائے۔"

"ہاں اور ضرورت ہے لڑکوں کو بھی پھانسنا، تم جیسے بے وقوف لڑکے ہوتے ہیں جو ایسی عورتوں کی خوب صورتی کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں، لیکن میں تم کو بتا رہی ہوں، خاندان ایسے نہیں بستا شہری! تم ایک بار ہاں تو بولو، ایک سے ایک خاندانی لڑکیاں موجود ہیں اور کنواری بھی۔ تمہیں ایسی کیا مجبوری آن پڑی کہ ایک بچے کی ماں سے شادی کرنے پر بے تاب ہوئے پڑے ہو، اس کی ذات، نسل خاندان کچھ تو دیکھا ہوتا۔" ناگواری سے کہتی ہوئی مہر النساء ہمیشہ کی طرح شہریار کو حیران کر رہی تھیں۔ "پتا نہیں کس گرے پڑے خاندان کی ہے جو ایک لڑکی کو گھر بٹھا کے نہیں کھلا سکتے۔"

"آپی۔" شہریار نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے نظریں چرائی۔ "آپ بھی تو ایک خاندانی آدمی سے بیاہ کر کے گئی تھیں نا۔"

مہر النساء جو اگلی بات کہنے جا رہی تھیں، ایک دم چپ ہو گئیں۔

"فلک بہت اچھے خاندان سے ہے آپ بھی جانتی ہیں، اس کے شوہر نے طلاق نہیں دی تھی وہ شادی کے چھ ماہ بعد بیوہ ہو گئی تھی۔ نہ ہی اس نے خلع لیا تھا۔ میں اسے دس سالوں سے جانتا ہوں۔ وہ صرف اٹھارہ سال کی تھی جب اس کی شادی ہوئی اور انیس سال سے پہلے وہ نہ صرف بیوہ ہو چکی تھی بلکہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ آپ مجھے بتائیں اس سارے قصے میں فلک کا کیا قصور ہے۔ کیا اس نے جان کے اپنے شوہر کو مارا تھا یا ہونے والی اولاد کو یتیم کیا تھا۔" شہریار نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ بات جاری رکھی۔

"کیا کوئی بھی لڑکی ہنسی خوشی بیوہ ہوتی ہے یا اپنا گھر خراب کرتی ہیں۔ آپ نے بھی تو خلع لیا ہوا ہے آپی! لیکن کسی نے کبھی آپ کو کچھ نہیں کہا، بلکہ میں نے آپ کو ہی فخر سے اس بات کو ایڈمٹ کرتے سنا ہے کہ آپ نے اس آدمی کو چھوڑ دیا جس نے آپ کے اوپر دوسری عورت لا کے بٹھا دی تھی۔ آپ کی کہی ہوئی بات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے...... میں نے اپنے پندار کو ٹھیس لگانے والے کو چھوڑ دیا اس کے ساتھ رہ کے پل پل مرنے سے اچھا تھا ایک ہی بار اذیت کا سفر طے کر لوں۔"

مہر النساء نے دھوئیں دھوئیں چہرے کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے بھائی کو دیکھا جس نے ان کی ہی کہی بات کس جگہ لٹائی تھی۔

"آپی! فلک اللہ کی رضا مندی میں راضی رہی ہے، وہ بھی میرے دو سال سے مسلسل اصرار کرنے کے بعد شادی پہ تیار ہوئی تھی کہ آپ نے...... آپی آپ نے اس کی ذات کی پرخچیاں اڑا دی ہیں اور

آپ کو احساس بھی نہیں ہے۔" ہونٹ بھینچتے ہوئے شہریار نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بت بنی ہوئی آپی کو ایک نگاہ دیکھا۔ مہر النساء اپنے چھوٹے بھائی کے منہ سے وہ الفاظ سن کے چور بن چکی تھیں جو عرصہ پہلے بجا طور پہ وہ فخریہ انداز میں ہر آئے گئے کے سامنے کہتی تھیں۔ آج ان ہی جملوں کو اور حقیقت کو اپنے ماں جائے کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں دل کرچی کرچی ہو گیا۔ شہریار نے سامنے بیٹھی بہن کو خاموش اور گم صم دیکھا تو بے ساختہ اٹھ کے انہیں مضبوط بازوؤں کے حصار میں سمالیا۔

"آپی! بخدا میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا لیکن آپ جس چیز کی سزا دے رہی ہیں کیا وہ ہمارے آپ کے ہاتھ میں ہے؟ تقدیر سے بڑھ کے کوئی چیز ہو سکتی ہے بھلا۔ اس کے آگے تو ہم سب مجبور ہیں نا۔"

اور نہ چاہتے ہوئے بھی مہر النساء نے بالآخر اپنے بھائی کی آنکھوں میں محبت کی جوت دیکھ کے ہار مان ہی لی۔

☆☆☆

بے شک دل سے راضی نہ ہوتے ہوئے بھی مہر النساء نے شہریار کی شادی میں کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی لیکن بہر حال جب دل راضی نہیں ہو کسی کام کے لیے تو ایک تشنگی رہ ہی جاتی ہے۔ ان کے دل میں گرہ بیٹھ گئی تھی فلک ناز کے متعلق، کہ وہ انہیں ہرا کے اس گھر میں آئی ہے۔ بھائی نے اسی لڑکی کی خاطر بہن سے لڑائی مول لی اور ان کو یاد دلایا انہوں نے خلع لی تھی۔ جس بھائی کو انہوں نے بیٹا بنا کے پالا وہ زندگی میں پہلی بار ان سے دو بدو لڑا تو بھی اسی لڑکی کے لیے۔ وہ اپنا دل کشادہ نہیں کر پائیں فلک ناز کے لیے۔

☆☆☆

شہریار اپنی خوشیوں کا مقدمہ جیت کے فلک ناز کے سامنے سرخرو ہو گیا اور آج فلک ناز دلہن بنی بے حد حسین لگ رہی تھی تو دوسری طرف شہریار بھی کالی شیروانی میں کسی صورت نظر انداز کرنے قابل نہیں تھا۔ دراز قد دلہا دلہن ہر ایک کی توجہ کھینچ رہے تھے۔ لیکن آپی کی نظریں بھٹکتے بھٹکتے فلک کے بیٹے کی سمت اٹھ رہی تھیں اور وہ سرد آہ بھر کے اپنے جوان بھائی کو دیکھ کے رہ جاتی تھیں۔

"جہیز میں بیٹا...... حق ہاہ۔"

ان کی نگاہوں کو فلک ناز بھی محسوس کر رہی تھی، وہ پہلے ہی فطری گھبراہٹ کا شکار تھی جو اتنے لوگوں کی موجودگی سے بے چینی کا شکار تھی تو اکلوتی نند کے چہرے پہ چھائی ہوئی بےزاری بھی اسے صاف نظر آرہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے برستا قہر وہ صاف محسوس کر رہی تھی۔ شہریار کا ساتھ بھی اسے حوصلہ نہیں دے رہا تھا۔

"یا اللہ اتنے سال اپنی عزت کی حفاظت کی ہے۔ تو گواہ ہے میرے گزرے سالوں کا، سوائے شہریار کے کوئی بھی میرے اتنے پاس نہیں ہوا۔

اگر شہریار بھی بلال کے لیے سیریس نہ ہوتے تو شاید بہت سے ہاتھوں کو ریجکٹ کرتے، انہیں بھی مایوس کر دیتی۔ اتنے سالوں تک لوگ رشتے لے کے دہلیز تک آئے لیکن میرے بلال کے لیے کسی کا دل بڑا نہ ہوا۔ دوسری شادی گناہ نہیں لیکن تیرے پیدا کردہ انسان جب خود کو خدا سمجھ لیتے ہیں تو کسی کی بے بسی اور کمزوری ان کو نظر نہیں آتی۔

اچانک شہریار کے بلند قہقہے نے فلک کو اپنی سوچوں سے باہر نکالا۔ شہریار کی ایک ایک حرکت سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ کتنا مطمئن اور پرسکون ہے اپنی چاہت پا کر۔

"اللہ مالک ہے۔" شہریار کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کے فلک نے ساری فکریں نیلی چھتری والے کے سپرد کر کے ایک آسودہ سانس لی۔

☆☆☆

"جاؤ صنم! دیکھو ماموں جاگے یا نہیں۔"

شادی کے ایک ہفتے بعد بھی شہریار کی روٹین نارمل نہیں ہوئی تھی، اگر مہر النساء کی پسند کی شادی

ہوتی تو شاید ان کو یہ چیز نارمل لگتی لیکن اب موڈ خراب کرنے کے لیے یہ بات بھی کافی تھی کہ دس گیارہ بج گئے اور ابھی تک کمرے کا دروازہ بند ہے۔

''وہ ماما! میرا خیال ہے ابھی تک سو رہے ہیں۔ ورنہ خود ہی باہر آجاتے نا۔''

''یہ کیا چھن ہیں ان کے؟ چلو شہری کی تو پہلی شادی ہے لیکن بنو بی بی تو سب بھگتا کے آئی ہیں، ان کے ارمان نہیں پورے ہوئے۔'' مہرالنساء نے بڑبڑاتے ہوئے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کی، صنم ماں کی بات کچھ سمجھی نہ سمجھی لیکن ان کا خراب موڈ دیکھ کے فوراً کچن سے کھسکنے میں عافیت جانی۔

''السلام علیکم۔'' جھجکتے ہوئے فلک نے مہرالنساء کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، خیر سے آپ کی صبح ہو ہی گئی، اب ناشتے کا تو وقت نہیں، کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔''

''جی جی...... وہ......'' فلک نے گھبراتے ہوئے مہرالنسا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے اور کوئی جواب نہ بن پایا۔

''دیکھو فلک! اب تم ہمارے خاندان کا حصہ ہو تو یہ اتنی دیر سے کمرے سے نکلنا مناسب نہیں، ویسے بھی تم یہ سب نزاکتیں جانتی ہی ہوگی، کون سی پہلی شادی ہے بھلا۔''

فلک کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھ کر جو ایک گھٹیا سا سکون ملا۔ مہرالنساء کو اس کا جواب نہیں تھا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں نند بھاوج میں۔''

شہریار کی زندگی سے بھرپور آواز نے ایک دم کچن بھر دیا۔

''آہ ہاہ۔ میرا شہزادہ اٹھ گیا، فلک سے یہ ہی پوچھ رہی تھی، اب ناشتے کا وقت تو ہے نہیں کھانا ہی کھالینا ذرا رک جاؤ تو۔''

الفاظ بے شک وہی تھے لیکن کہنے والے کا انداز بدل چکا تھا۔

فلک نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ ''یا اللہ، حوصلہ دینا۔ زیرلب دعا کرتے ہوئے وہ یقیناً بے بسی کا ایک شاہکار ہی لگ رہی تھی۔

''جیسا ہماری بیگم اور آپی ڈیسائڈ کریں، ہم تو حکم کے غلام ٹھہرے۔''

شہریار نے ظاہری طور پہ فلک کے ساتھ کھڑی مہرالنساء کو دیکھ کے خوش فہمیوں کے محل کھڑے کر لیے کہ سب نارمل ہو چکا ہے۔

''فلک کتنے بجے جانا ہے بلال کو لینے؟''

جہاں مہرالنساء کو ایک جھٹکا لگا وہیں فلک نے بھی حیران نگاہوں سے شہریار کو دیکھا۔

''کک...... کیا مطلب شہری!'' مہرالنساء نے فوراً پوچھا۔

فلک نے بھی سوالیہ نظروں سے شہریار کو دیکھا، اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی وہ یہ سوال آپی کے سامنے ہی پوچھ لے گا، وہ بھی اتنی جلدی۔

''ہاں بھئی بولو۔'' شہریار نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ج...... ج...... جی، آپ کو جب ایزی ہو۔''

فلک نے دھیرے سے جواب دیا اور کن انکھیوں سے مہرالنساء کو دیکھا جو عجیب اسٹائل میں شہریار کو تک رہی تھیں۔

''بلال بھی اسی گھر میں آئے گا؟ پہلے تو کبھی تذکرہ نہیں کیا تم نے۔'' تیکھے لہجے میں پوچھتے ہوئے آپی نے فلک کو جی جان سے لرزا دیا تھا۔

''اس میں تذکرے کی کیا بات ہے آپی! ظاہر ہے فلک کا بیٹا اسی کے ساتھ رہے گا۔ ماں بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں یا نانی نانا کے گھر میں۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں، لگتا ہے بڈھی ہو رہی ہیں۔'' شہری نے ماحول کو ہلکا کرنے کی خاطر بات کو لاپروائی سے نمٹایا۔

''بڈھی تو واقعی ہو رہی ہوں جو تم جیسے جوانوں کو نظر آنا بھی بند ہو گیا کہ اجازت ہی لے لیتا ہے بندہ کوئی فیصلہ کرتے وقت۔'' فلک کھڑی اپنی انگلیوں کو چٹخاتی رہی، کتنا مشکل کام ہے اپنی اور اپنی اولاد

کی قسمت کا فیصلہ ہوتا دیکھنا۔
''او کم آن آپی! اتنا سوچنے کی کیا بات ہے، اب فلک اس گھر میں ہے تو اس کی اولاد بھی تو ادھر ہی ہو گی نا۔''
''لیکن......''
''اب چھوڑیں بھی اس ٹاپک کو یار! کچھ کھانا وانا دے دیں یا بھوکے ہی رکھیں گی ہمیں۔''
مہرالنساء نے بھی ایک تیکھی نظر فلک پہ ڈال کے بات ٹال دی۔
''ہاں چلو بیٹھو، میں دیکھتی ہوں۔''
☆☆☆
''شہری! کیا آپ نے پہلے آپی کو بلال کے بارے میں بتایا نہیں تھا؟''
گاڑی کی محدود فضا میں موتیے کے پھولوں کی دلفریب خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فلک اور شہریار، بلال کو لینے اس کے ننھیال کی طرف رواں تھے، موقع دیکھ کر فلک نے بات کرنا مناسب جانا۔
''فلک! میں نے خاموشی کو زیادہ افضل سمجھا کہ ابھی شادی ہو جائے پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''
''لیکن اب......'' ماں کے دل کو بہت خدشے لاحق تھے۔
''تم فکر نہ کرو، بلال اتنا پیارا بچہ ہے کہ کوئی اس سے بیر نہیں رکھ سکتا۔'' شہریار نے مسکراتے ہوئے فلک کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ تلے دباتے ہوئے تسلی دی۔
''مجھے نہیں لگتا آپی اتنی جلدی مجھے قبول کر پائیں گی کجا کہ بلال کو بھی۔'' فلک بالآخر اپنے دل کا ڈر زبان تک لے ہی آئی۔
''آپی تھوڑی سی سخت زبان کی ضرور ہیں فلک! لیکن دیکھو ہماری شادی بھی ہو ہی گئی نا، آگے بھی سب اچھا ہو جائے گا، اچھی امید رکھو بس۔''
''ہاں، اس وقت تک میری انا کتنی زخمی ہو جائے گی اس کا کوئی حساب نہیں ہو گا، لیکن مجھے یہ سب بلال اور شہری کی خاطر برداشت کرنا ہی ہو گا۔''
فلک نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی اور مسکراتے ہوئے شہریار کی طرف دیکھا۔
''ہاں بس ایسے مسکراتی رہو۔ تم میری آکسیجن ہو یار! چلو گھر آ گیا، ذرا جلدی نکلنے کی کرنا۔ کل سے آفس بھی شروع ہے، آئس کریم کھاتے گھر چلیں گے اگر ادھر سے جلدی اٹھو گی تو۔'' شہریار جیسے رشوت دیتے ہوئے بولا۔
ہارن کی آواز سے بلال مانو کسی قید سے آزاد ہوتے قیدی کی طرح بھاگتا ہوا آیا اور فلک کے گرد بانہوں کا گھیرا ڈال کے چپک گیا۔
''ماما...... ماما۔ آئی مس یو سو مچ ماما!''
فلک جو شہریار کی بات پہ مسکراتے ہوئے گاڑی سے اتر رہی تھی بلال کو اپنی طرف آتے دیکھ کے سب کچھ بھول بھال کے اسے سینے سے لگائے اندر کی جانب چل پڑی۔ شہریار نے گاڑی لاک کی اور دونوں ماں بیٹے کی تقلید میں قدم بڑھائے۔
☆☆☆
''دیکھو بیٹے، نئے گھر میں آپ مجھے زیادہ تنگ نہیں کرنا اچھا؟ وہاں ایک پھپھو ہیں آپ کی، خاص طور پہ ان کو آپ نے بالکل بھی تنگ نہیں کرنا۔ وہ جو بولیں بس آپ نے خاموشی سے سن لینا ہے جواب نہیں دینا۔''
فلک کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح بلال کو آگے کی ساری صورت حال سمجھا دے کہ وہ اس کی پریشانی کا باعث نہ بنے۔
''او کے ماما!''
بلال نے کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا لیکن ماں کے چہرے پہ پھیلی پریشانی دیکھ کے ایک یہ ہی لفظ سمجھ میں آیا کہ اسے خاموش رہنا ہے۔
یتیم بچے از خود ہی سمجھ دار ہو جاتے ہیں، جو تھوڑی بہت کمی رہ جاتی ہے وہ معاشرے میں پھیلے پڑھے لکھے لوگ انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ ان کے پیچھے باپ جیسی مضبوط دیوار نہیں ہے۔

☆☆☆

کچن میں چار کرسی والی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پہ گرم گرم پراٹھے کی دل فریب خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شہری خوش گوار موڈ میں چہلیں کر رہا تھا اور فلک چھرلی سے چائے کو دم دے رہی تھی کہ ایک دم مہر النساء کچن میں داخل ہوئیں

''کل کتنے بجے آئے شہری! ذرا خیال رکھا کرو شہر کے حالات ٹھیک نہیں اور تم پرائے بچے کو اتنی رات گئے آئس کریمیں کھلاتے پھر رہے ہو۔'' مہر النساء نے ناشتے کی میز پہ بیٹھتے ہی شہری سے پوچھا۔

فلک کے چہرے پہ جس تیزی سے مسکراہٹ سکڑی تھی وہ دیکھ کے شہری کو یقیناً حیرت ہوئی تھی۔

''آپی! پرایا کیوں؟ میرا بیٹا ہے وہ۔''

فلک کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ یقیناً کسی نیکی کا صلہ تھا شہری۔

''خیر' اللہ رکھے تمہاری اولاد بھی آجائے گی اب ایسی بھی کیا مصیبت آن پڑی جو کسی اور کی اولاد کو اپنی بولو اور جان کھپاؤ اس پہ۔'' مہر النساء نے نخوت سے جواب دیا۔

''پلیز آپی! میں ایک بار پھر آپ کو کلیئر کر دوں، بلال اور فلک ناز اس گھر کے فرد ہیں جیسے آپ اور صنم، آئندہ یہ پرایا پرایا لفظ نہیں بولیے گا۔ صنم میری بھانجی ہے تو بلال میرا بیٹا۔ دونوں ایک جیسے ہیں میرے لیے۔ فلک میری بیوی ہے، آپ بہن ہیں۔ سب میری ذمہ داری ہیں، مجھے اچھا نہیں لگے گا اگر آپ میں سے کسی کو کسی سے پرابلم ہو گی۔ چھوٹا سا خاندان ہے اسے بنا کے رکھنے میں ہم سب کا سکون ہے۔'' شہریار نے ساری لگی لپٹی ایک طرف رکھ کے آج صاف بات کر ہی دی۔

''فلک سارے ڈاکومنٹس مجھے دو بلال کا یڈمیشن کرانے کے لیے۔ آپی! آپ بھی فیس واؤچر ے دیں صنم کے، میں کل پرسوں اسلام آباد چلا جاؤں گا پھر یہ دونوں کام اگلے ہفتے پر چلے جائیں گے۔'' شہریار نے اپنی بات ختم کر کے دیدہ و دانستہ کسی کی طرف دیکھے بغیر اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

پیچھے دو لوگ اپنی اپنی سوچ کے دائرے میں گھومتے رہے، ایک شکر ادا کرتا ذہن تو دوسرا مقابلہ کرتا۔

☆☆☆

''شہریار! صنم کے لیے ایک رشتہ آیا ہے چھان بین کر لو تا کہ ہاں بول کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔'' مہر النساء کے لہجے میں برسوں کی تھکن امڈ آئی تھی۔

ان کو شہریار کی شادی کے بعد اپنا آپ کمزور اور الگ لگنے لگا تھا، ان کے خیال میں اب اس گھر میں ان کی جگہ نہیں رہی تھی۔ فلک نے ان کی پوزیشن ہلا دی تھی اور اب تو وہ ماں بھی بننے والی تھی اسی لیے شہریار کا بڑھتا ہوا احساس ان کو بری طرح کھلنے لگا تھا۔

پرانے محلے کے بھولے بسرے ایک پڑوسی ان کو سرِ راہ مل گئے تھے۔ صنم کو دیکھتے ہی وہ اپنے بھانجے کے لیے رشتہ لے آئیں، جو وہ شہریار کی رضامندی سے ہی کرنا چاہتی تھیں سو آج اتوار کے دن موقع دیکھ کے وہ یہ موضوع چھیڑ بیٹھیں۔

''لیکن آپی! ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔'' فلک جو شام کی چائے کی ٹرے سجائے ٹیرس پہ آئی ہی تھی بے ساختہ بولی۔ ''اس کی پڑھائی تو مکمل ہونے دیں۔''

مہر النساء نے ایک تیکھی لیکن بھرپور نظر فلک پہ ڈالی اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے سوالیہ انداز سے شہریار کو دیکھا۔

''آپی! فلک بالکل صحیح بول رہی ہے، وہ واقعی ابھی چھوٹی ہے۔'' شہریار نے بھی کچھ سوچتے ہوئے مہر النساء کو جواب دیا۔ ''ویسے میں سوچ رہا تھا کیوں نا آپ ایک بار ندیم بھائی کے کانوں میں بھی بات ڈال دیں تو مناسب نہیں ہو گا۔ آخر کو وہ صنم کے باپ ہیں۔'' شہریار نے جھجکتے ہوئے بات پوری کی۔

''تمہاری بیوی نے ہی یہ پٹی پڑھائی ہو گی شہری! آج تک تو تم نے کبھی نام نہیں لیا ندیم کا۔ آج جہیز کے ڈر سے صنم کے ابو یاد آ گئے۔'' مہر النساء

بدگمانی کی بہت اونچی چوٹی پہ کھڑی تھیں۔
''بخدا ایسی کوئی بات نہیں آپی!'' شہریار ایک دم بوکھلا گیا جو چیز وہم و گمان میں نہیں تھی آپی کے دل میں کیسے گھر گئی۔ اس کے خیال میں تو باپ کا حق تھا اس کی رضا بھی شامل ہوتی بیٹی کی شادی کے وقت۔
''پھر بس تم خرم کی جاب کی طرف سے مجھے اطمینان دلا دو، باقی اللہ مالک ہے۔'' مہرالنساء نے اپنی طرف سے گویا بات ختم کر دی۔
☆☆☆
آج مہرالنساء کے ساتھ اس چھوٹے سے گھر کے در و دیوار بہت خوش تھے، ایک طرف جہاں شہریار الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دیکھ کے خوش ہو رہا تھا تو دوسری طرف فلک بھی اپنی جڑواں بچوں کی مسرت بلال کے ساتھ شیئر کر رہی تھی۔ بلال بھی اپنے آنے والے بھائی بہن کے لیے بے حد ایکسائیٹڈ تھا۔ گھر میں کافی دنوں بعد ایک پرسکون فضا چھائی ہوئی تھی۔ صنم کی بھی تاریخ پکی ہو رہی تھی۔
شہریار کے بارہا سمجھانے اور اپنی طرف سے ہر ممکن تسلی دینے کے بعد شاید مہرالنساء کو بھی صنم کی اداس آنکھوں پہ ترس آ گیا تھا، اسی لیے وہ ندیم کو اس رشتے میں شامل کرنے پہ مجبوراً راضی ہو گئی تھیں۔ بالآخر شادی کی تاریخ پکی ہونے اور منگنی کی چھوٹی سی رسم کے لیے رکھی گئی ڈھول پہ پہلی تھاپ پڑنے تک احسن اور پروقار طریقے سے سارے کام ہوتے چلے گئے۔
☆☆☆
بڑی سی چادر سے ہر ممکن طریقے سے اپنے جسم کو چھپانے کی تگ و دو میں مصروف فلک ناز ہلکان ہو رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی صنم کے سسرال سے آنے والوں مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کمی رہ جائے۔
''آپ کی بھاوج فارغ ہو جائے گی کیا مہرالنساء؟'' صنم کی کسی سسرالی خاتون نے فلک کو بغور دیکھتے ہوئے سوال پوچھا۔
''نہیں بھی فارغ ہوئی تو کوئی مسئلہ نہیں ہے آپا! کون سا پہلا بچہ ہے اس کا۔'' مہرالنساء نے کوفت سے جواب دیا۔
جہاں ایک طرف خفت سے فلک کی پیشانی پہ چند قطرے ابھر آئے تو دوسری طرف مہمانوں کے ہاتھ ایک چٹ پٹا موضوع ہاتھ لگ گیا۔ جو صرف صنم کے کپڑوں اور جوتوں کا ناپ لینے آئی تھیں ان کے لیے اچھا ٹائم پاس لگ گیا تھا۔ فلک لڑکھڑاتے قدموں ڈرائنگ روم سے باہر نکلی۔ اسے معلوم تھا اب معاشرے کے یہ پڑھے لکھے لوگ اس کی ذات کا پوسٹ مارٹم کیے بغیر چائے کا مزا نہیں لے سکیں گے۔
دوسری طرف مہرالنساء کا من پسند ٹاپک چھڑے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں، ممکن نہیں تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی کا گھر بیٹھے، بنا کسی فکر کے اچھا رشتہ ہونے کے بعد ایک سر یا سا ان کی گردن میں آ چکا تھا۔
''کیا مطلب؟ شہریار کی شادی کو تو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا، تو کیا سائنس نے اتنی ترقی کر لی کہ چھ چھ ماہ میں ہی بچے ہونے لگیں اور ہمیں گھر بیٹھے معلوم بھی نہ ہو۔'' بہت بھونڈے طریقے سے مذاق کرتی کوئی خاتون اپنے ہی لطیفے سے انجوائے کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں لیتی رہیں۔
''ارے اس کی دوسری شادی ہے بھئی، پہلی شادی سے ایک لڑکا ہے اور خیر سے وہ بھی اسی گھر میں پایا جاتا ہے۔'' بالآخر مہرالنساء نے بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔
''اوہ ہو، تو کیا طلاق یافتہ ہے؟ ہے تو بڑی پیاری اور کم عمر بھی۔ پھر ایسا کیا ہوا جو پہلی شادی ختم ہو گئی۔'' چسکے تو اب شروع ہوئے تھے۔
''بیوہ ہے دراصل۔'' مہرالنساء نے اپنی طرف سے ہلکی آواز میں گویا شہریار کی قسمت پہ افسوس کیا۔
''اے لو، مہرالنساء! تمہیں ایسی کیا مجبوری آئی تھی جو اچھے بھلے بھائی کی شادی بیوہ سے کرا دی وہ بھی ایک بچے کی ماں سے۔ چچ چچ چچ......''
''اب ہم کیا کریں بہن! جب لڑکیاں اپنا بر خود ہی تلاش کرنے لگ جائیں۔ ساری لڑکیاں میری صنم کی طرح معصوم تھوڑی ہوتی ہیں جو گھر کی

چار دیواری سے نکلنا گناہ سمجھیں۔ خیر میں نے تو
بہت سمجھایا شہری کو لیکن ایسے موقع پہ تو لڑکے کی عقل
گھاس چرنے چلی جاتی ہے نا۔"

"ہاں یہ تو ہے ویسے۔ بڑی چلتر لڑکیاں ہوتی
ہیں۔"

"اب کیا فائدہ ایسی باتوں کا شادی تو ہو گئی اور
ماں بھی بننے والی ہے۔" مہر النساء نے فلک کی ذات
کے پرخچے اڑا کے سکون کی سانس لی۔ "ہم نے بھی
عزت سے گھر رکھا ہوا ہے، بیوہ ہے تو کیا کریں بھائی
کی پسند بھی تو ٹھہری۔"

"بڑا ظرف ہے تمہارا جو ایسی لڑکی کو بیاہ
لائیں۔ گھر کی عزت بنایا، اللہ اجر دے تم کو۔"

"ہاں بھئی، ورنہ ایسی خود سے آئی ہوئی
لڑکیوں کا تو کوئی تعارف نہیں کراتا اور تم نے سارے
کام اسی کے سپرد کر رکھے ہیں بیٹی کی شادی کے۔"

مہر النساء گردن اٹھائے سب کے تعریفی جملے
وصول کرتی رہیں اور کچن کی دیوار سے لگا ایک ہلتا
لرزتا ہوا وجود خاموش سسکیاں لیتا رہا۔

☆☆☆

وقت کا کام ہے گزرنا سو وہ گزرتا گیا۔ فلک
بھی مہر النساء کی نرم گرم طبیعت کی عادی ہو چلی تھی،
بلال بھی اس حقیقت کو مان چکا تھا مہر النساء صرف
اس کی آنٹی ہیں۔ پھپھو نہیں۔ پھر اللہ ایسے بچوں کو
روحانی طاقت دیتے ہیں جو وہ ہر قسم کے حالات کا
سامنا با آسانی کر لیتے ہیں۔ ان کو زیادہ سمجھانا نہیں
پڑتا نہ ہی وہ مشکل پسند ہوتے ہیں۔

شہریار کی شکل میں ایک سلجھا ہوا انسان باپ
ن کے ہر مشکل وقت میں ساتھ تھا۔ صنم کی صورت
ں بڑی باجی اور سب سے بڑھ کے اس کی ماں کے
رے پہ پھیلی سکون آمیز مسکراہٹ، یہ سب مل کے
ال کی شخصیت میں اچھا اور مثبت اثر رکھ چکے تھے۔
وراوی سکون ہی سکون لکھتا تھا۔ بلال کی زندگی میں
ں میں اگر ایک آنٹی کے نام پہ کوئی طعنے یا ٹیکھی
گاہوں سے اس پہ نظر رکھے تو برداشت کرنا مشکل

نہیں تھا۔ لیکن قدرت ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا
پسند کرتی ہے اور یہ بات بعد میں سمجھ میں آتی ہے
جب انصاف کرنے کا ترازو ہاتھ سے نکل چکا ہوتا
ہے۔

☆☆☆

مہر النساء جو بیٹی کے گھر آئے رشتے پہ بجائے
شکر ادا کرنے کے فلک ناز کے پیچھے پڑ چکی تھیں، ان
کے حساب سے یہ سب مہر النساء کے نیک اعمال تھے
جس کے بدلے اتنی چاہ سے بیٹی لے جانے والے
مل گئے تھے۔ وہ کھل کے فلک ناز کو تنگ کرتی تھیں،
جبکہ وہ اپنی زندگی کے ایسے وقت سے گزر رہی تھی
جب اسے بھی کوئی میٹھا بول سننے کی چاہ تھی۔ لیکن
مہر النساء بھول گئیں، ہر ایک انسان اللہ کے نزدیک
برابر ہے، سب اسی کی تخلیق کردہ ہیں۔ کسی کا دل
دکھانا آسان ہے لیکن اس کا حساب دینا بے حد مشکل
ہے، کیونکہ انسان تو ایک وقت خدا سے ملنے والی
نعمتوں کے بدلے ساری مشکلات بھول جاتا ہے،
خود کو تکلیف دینے والے کو بھی معاف کر دیتا ہے۔
لیکن اللہ کے انصاف کا اپنا حساب کتاب ہے۔ اس
کے لازوال انصاف کا تقاضہ ہے وہ عدل سے کام
لے اور وہ لیتا ہے لیکن انسان بھول جاتا ہے کہ اوپر
بیٹھا ہوا وہ ہر ایک پہ برابر نظر رکھے ہوئے ہے۔

فلک بے شک دوسری بار ماں بن رہی تھی لیکن وہ
احساسات پہلی بار وجود میں آئے تھے کہ کوئی خیال
رکھنے والا، کوئی مان دینے والا، کوئی کلینک بروقت لے
جانے والا ہر وقت حاضر تھا۔ راتوں کو بھی کسی تکلیف
کے آثار ہوں تو ساتھ کوئی تھا جو فلک کے اٹھنے سے پہلے
پانی کا گلاس سرہانے لیے موجود ہوتا تھا۔ ان سب
خوشیوں اور مان کے ساتھ اگر کچھ طنز برداشت بھی
کرنے پڑتے تو فلک کھلے دل سے ان کو سہہ لیتی تھی۔

جو پھر کیا ہوا کہ فلک بار بار متلیاں کرنے پہ سنتی
تھی کہ کون سا پہلا بچہ ہے بی بی، حوصلہ کرو۔ اب یہ
سب تو تم کو معلوم ہی ہوگا نا، تجربہ کار ہو خیر سے۔

جو پھر کیا ہوا جو فلک چکرانے کے باعث یہ سنتی

تھی کہ، ان حالات میں تو یہ سب ہوتا ہے۔ پہلے بچے کی دفعہ یاد نہیں کیا۔

جو پھر کیا ہوا کہ ہر ماہ چیک اپ کروانے پہ وہ یہ سنتی تھی دوسرے بچے کی بار تو عورت اتنی تجربہ کار ہو جاتی ہے کہ ایسے بھاگ بھاگ کے ڈاکٹر کو دکھائے، احساس کرو شوہر کی کمائی کا۔

ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سہنا آسان نہیں لیکن جب کوئی چارہ نہ ہو تو بندہ کیا کرے سوائے خاموش رہنے کے۔ فلک بھی خاموش تھی اور صبر سے وقت گزار رہی تھی۔

انہی حالات میں صنم کی بھی شادی شروع ہو گئی اور ساتھ خیریت سے نمٹ بھی گئی۔ شہریار نے کسی موقع پہ مہر النساء کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا، ہر چیز اپنی حیثیت سے بڑھ کے کی۔ صرف ایک شرط رکھی ندیم بھائی کو بھی بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھنے کی اجازت دے دیں اور اس موقع پہ بیٹی کی خاطر ایک بار پھر وہ مجبور ہو گئیں اور یوں بیٹی اپنے گھر کی ہوئی۔

لیکن......

لیکن انسان اپنے ہر بڑے بول کا کیا اسی دنیا میں رہ کے بھرتا ہے اور اب باری تھی مہر النساء کے بڑے بول کے حساب دینے کی۔

☆☆☆

صنم شادی کے دس پندرہ دن بعد مری اور سوات گھومنے کے لیے گئی اور واپس آتے ہوئے اس کی گاڑی خراب موسم کے باعث جس کھڈ میں جا گری، وہاں سے صرف صنم کو ہی زندہ نکالا جا سکا۔ خرم کی نعش اس قابل ہی نہیں تھی کہ صنم یا کسی اور گھر والے کو دکھائی جا سکتی، سو خاموشی سے دفنا دیا اور صنم اپنی عدت گزارنے واپس اپنی ماں کے گھر آ گئی۔

اسی گھر جہاں ابھی تک صنم کی شادی کی باقیات ہی پوری طرح نہیں نمٹی تھیں کہ بیوگی کی چادر تلے وہ دلہن خود آن موجود ہوئی۔ جس کے ہاتھوں پیروں کی مہندی بھی پوری طرح نہیں مٹی تھی، اس کی آنکھوں میں نمی چوبیس گھنٹے رہنے لگی تھی۔ جہاں کچھ ہی وقت پہلے سریلے اور شرماتے قہقہے گونج رہے تھے اب ہر سو خاموشی سسکیوں کی آہیں تھیں۔

مہر النساء جیسے ایک دم ڈھے گئی تھیں۔

''اللہ جانے کس کی بددعا لگی ہے یا مالک، ہم نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، پھر ہمارے ساتھ ایسا کیوں؟''

مہر النساء اٹھتے بیٹھتے اللہ سے شکوے کرتی رہتی تھیں اور ان کے سامنے فلک لبوں پہ خاموشی کا تالا لگائے کام میں مصروف رہتی۔

جہاں مہر النساء اپنے کیے گئے وہ گناہ کو یاد کرنے میں مصروف رہنے لگی تھیں جس کی پاداش بیٹی نے بھگتی، وہیں فلک ناز اس حال میں بھی پورے گھر کے ساتھ بیوگی کی چادر تلے چھوٹی سی لڑکی کو بھی حوصلہ دینے میں مگن تھی۔

فلک ناز کو صنم کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کے اپنا وہ وقت یاد آنے لگتا تھا جب وہ بیوہ ہونے کے بعد ایک کمرے میں رہتی تھی۔ اس کے پاس تو پھر بلال کی شکل میں زندگی گزارنے کا آسرا تھا لیکن صنم کے پاس وہ بھی نہیں تھا۔ فلک ناز اپنی عدت اور بلال کے ہونے کا اذیت ناک وقت کاٹتی تھی جبکہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اور بھائی بھابھی کے ساتھ رہتی تھی۔

لیکن اس کے مشکل وقت میں کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ ماں کو فلک کی بھری جوانی کی بیوگی کے دکھ نے بستر پہ ڈال دیا تھا تو بھاوج کو ہمیشہ کے لیے آنے والی نند سے خوف تھا، اب وہ اس گھر کی شراکت دار ہے۔ اسی لیے بلال کے ہوتے ہی فلک نے جاب کرنے کو ترجیح دی، ساتھ اپنی پڑھائی مکمل کی اور اللہ نے اس صبر کا انعام شہریار کی صورت میں اسے دے دیا۔

☆☆☆

''آپی! آپ صنم سے بولیں اپنی پڑھائی مکمل کر لے، باہر نکلے کمرے سے، ایسے تو وہ بیمار ہو جائے گی۔'' فلک کے بہت اصرار کرنے پہ آج شہریار، مہر النساء سے بات کرنے کی ہمت کر پایا تھا۔

''تم ہی بول کے دیکھ لو، میں تھک گئی اس سے ماتھا پیٹتے پیٹتے۔ کوئی عمر ہے کیا صنم کی، اس غم کو منانے

کی شہری؟" مہرالنساء نے بھیگی آواز سے شہریار سے پوچھا۔ "ابھی تو اس کے کھیلنے کے دن تھے، بیوہ بھی ہوگئی میری بچی، شہری کیوں ہوا ہمارے ساتھ ایسا؟"

"آپی! ہمت کریں، آپ ہمت ہار دیں گی تو ہمارا کیا ہوگا۔" شہریار کے لیے مہرالنساء کا یوں بکھر جانا خاصی حیرت لیے ہوئے تھا۔ وہ کیا جانے ماں کے دل کی حالت۔ مضبوط سے مضبوط عورت بھی ماں بننے کے بعد ایک دم حوصلہ ہار جاتی ہے جب اولاد درد رہی ہو۔

"فلک کی بھی حالت ایسی نہیں ورنہ وہ ہی صنم کو کہیں باہر لے جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے زیادہ چلنے سے منع کیا ہوا ہے نا، بہت سوجن ہے اس کے پاؤں میں۔" شہری نے جھجکتے ہوئے فلک کی کنڈیشن واضح کی۔ "آپریشن بتایا ہے۔"

مہرالنساء فلک کا نام سن کے ایک دم چونک سی گئیں۔

"ویسے وہ بھی کافی پریشان ہے صنم کو دیکھ کے۔ ایک دم ہی گم صم ہو کے رہ گئی ہے ہماری بچی۔" شہریار نے افسوس کرتے ہوئے سامنے بیٹھی ہوئی مہرالنساء کو دیکھا۔ "فلک نے ہی مشورہ دیا ہے آپ سے کہوں، صنم کو کسی اچھے کالج میں داخل کرا دیں تاکہ وہ زندگی کی طرف واپس لوٹے اور اپنے مستقبل کے لیے۔"

"شہری! جب فلک بیوہ ہوئی تھی تو میری صنم جتنی ہی عمر کی رہی ہوگی نا؟" مہرالنساء نے شہری کی بات کاٹ کے اس سے سوال پوچھا۔

شہریار ایک دم چونک گیا۔

"آپی۔"

"وہ بھی تو اسی عمر میں بیوہ ہوئی تھی نا اور اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔ اس میں فلک یا صنم کا کیا قصور کہ وہ چھوٹی عمر میں اتنا پہاڑ جیسا دکھ سہہ سکیں۔"

"آپی! کیا ہوگیا آپ کو، کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" شہریار نے مہرالنساء کو دیوانوں کی طرح خود سے باتیں کرتے دیکھا تو گھبرا گیا۔

"اب میری بیٹی، چھوٹی سی میری لاڈوں میں پالی ہوئی بچی جاب کرنے کہیں جائے گی تو وہ سب سنے گی جو فلک سنتی تھی۔ اگر میری صنم دکھوں کے انبار سے نکل کے زندگی کی طرف لوٹنا چاہے تو لوگ اس کی بھی کردار کشی کریں گے کیا...... صنم ڈر ڈر کے اپنی زندگی گزارے گی اور اگر کوئی زندگی کے کسی موڑ پہ اسے مجھ جیسی کم ظرف عورت مل گئی تو...... میری بچی کیسے جیے گی۔ وہ کیسے اس پہاڑ جیسی زندگی کا مقابلہ کرے گی اکیلی...... فلک کے پاس تو پھر بلال تھا۔" مہرالنساء خود ہی سوال جواب کرنے میں مصروف تھیں۔

"اوہ! اب سمجھ آیا۔ میری صنم نے فلک کی جگہ لے لی۔ میری بچی کے آگے میرے ہی بول آگئے۔ ہائے ماں کی کرنی آگئی اس کے سامنے۔ یا اللہ...... یا اللہ......" مہرالنساء لرز کے رہ گئی تھیں۔

"اب کیا ہوگا میری بچی کے ساتھ۔ خدایا نہیں، نہ کرنا ایسا نہ کرنا۔ میرے گناہ میری بچی کے آگے نہ لانا۔ مجھے معاف کردے مجھے معاف کردے۔" سسکیاں لیتی ہوئی مہرالنساء کو کس طرح چپ کرایا جائے گم صم شہریار کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا احتساب کا وقت بڑا کڑا ہوتا ہے۔

"ہاں یہ میری ہی کرنی کا پھل ہے جو میری معصوم بچی بھگت رہی ہے۔" بالآخر مہرالنساء نے پزل جوڑ ہی لیا۔ "میں نے ناحق کسی کا جینا حرام کیا بدلے میں میری کوکھ پہ ایسا وقت آن پڑا۔ اب میں کہاں جاؤں جنم جلی۔ فلک کو تو شہری جیسا انسان مل گیا، میری صنم کو نہ ملا تو وہ اکیلی کیسے اتنی لمبی زندگی گزارے گی۔ وہ تو بہت کم عمر ہے، کیسے رہے گی بھلا۔" مہرالنساء جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھیں کہ شہریار تک کی موجودگی فراموش کر گئی تھیں۔

اور......

اور ادھ کھلے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی فلک ناز کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتا چائے کا کپ لرز رہا تھا۔ وہ یہ ساری باتیں سنتے ہوئے دیوار کا سہارا لیتے نیچے بیٹھ گئی۔ ہاتھ منہ پہ رکھ کے اپنی سسکیوں کی آواز دباتے وہ صرف ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔

جس تن لاگے وہ تن جانے......!!

☆☆

فوزیہ سرور

ملکہ دل

"اپنا حلیہ دیکھو۔ تمہیں دیکھ کر ایک ہی تاثر دل وذہن میں ابھرتا ہے۔" سونیا نے مضحکہ خیز انداز میں مصباح کو جتلایا۔

"کیوں کیا ہوا ہے میرے حلیے کو، اور کیا تاثر ابھرتا ہے تمہارے ذہن ودل میں۔" مصباح نے نرم دھیمے لہجے میں خفگی کا تڑکا لگا کر استفسار کیا۔ اسے سونیا کا انداز بری طرح چبھا تھا۔

"بھئی برا مت ماننا۔ تمہیں دیکھ کر کام والی کا تاثر ہی ذہن میں آتا ہے۔ ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ لیے جب ہمہ وقت دوسروں کی خدمت پر کمربستہ رہو گی تو یہی لگو گی۔" سونیا نے اپنی ننھی سی ناک نخوت سے سکیڑی، ناک میں لونگ دمک اٹھی۔

مصباح اس کی لونگ کی چمک سے نگاہ چراتی ساکت ہوئی۔ اسی لمحے اس کی ساکت نگاہ نے سونیا کے سراپے تک اڑان بھری۔ سونیا کا جگمگاتا چہرہ، صاف ستھرا جدید تراش خراش کا لباس، اس کے ہاتھ پاؤں کی نزاکت اور گداز پن۔ اس کا دل سونیا کی باتوں کا قائل ہونے لگا۔ اسی پل اس کی نگاہ آئینے کے پار کھڑے اس کے اپنے سراپے سے جا الجھی۔ ملگجا حلیہ، بکھرے بال، سلوٹ زدہ لباس، ہاتھوں کا کھردرا پن، پاؤں کی پھٹی ایڑیاں، اپنا موازنہ سونیا کے ساتھ کر کے اس کا دل ڈوب سا گیا۔ کیا واقعی وہ کام والی ماسی لگتی ہے جبکہ سونیا مصباح کو مراقبے میں گم دیکھ کر نازو انداز سے چلتی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

سونیا اور مصباح پڑوسنیں تھیں۔ دونوں کے درمیان دوستی دو سال قبل سونیا کی کوشش سے ہوئی تھی۔ وہ آئے روز آدھمکتی۔ شروع شروع میں مصباح اس سے کھچی کھچی رہتی۔ وہ ہمیشہ مصباح کی خدمت گزاری کا مذاق اڑاتی تھی۔

سونیا کا شوہر سہیل جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ سونیا کی کوئی نند نہ تھی سہیل اکلوتا تھا۔ سسر کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ساس کا ساتھ تھا۔ اس کی سات سال کی ایک ہی بیٹی تھی اس پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ نہ تھا جتنا مصباح پر تھا۔

مصباح کا شوہر ہاشم پرائیویٹ ادارے میں جاب کرتا تھا۔ ساس سسر اس کے ساتھ رہتے تھے۔ پانچ مرلے کا گھر سسر نے اچھی طرز پر تعمیر کروایا تھا۔ ایک نند جو شادی شدہ اور دوسرے شہر میں مقیم تھی وہ بھی چھ مہینے بعد چکر لگا لیتی تھی۔ مصباح کا بیٹا سات سال کا اور ایک بیٹی تین سال کی تھی۔ ہاشم کی تنخواہ میں گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔ ملازمہ وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے سو ساری ذمہ داری مصباح کے کندھوں پر تھی جسے نبھانے میں وہ گھن چکر بنی رہتی۔ تین کمروں، کچن، دو باتھ روم، اسٹور روم، لاؤنج کی صفائی ڈسٹنگ کپڑوں کی دھلائی، کچن کے کام، بچوں کا ہوم ورک، ساس سسر کی ادویات کا خیال رکھنا، انہیں سارا دن مختلف اوقات میں چائے فراہم کرنا۔ مصباح کو حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ صبح سے رات تک وہ خود کو فراموش کیے کاموں میں مگن رہتی۔ سب کی ضروریات کا خیال رکھنا اس کی اولین ترجیح تھی۔

اس کا گھر جگمگاتا رہتا، اس کے کھانوں کی

تعریف کی جاتی۔ اس کے ہر کام کو سراہا جاتا لیکن خود اس کی اپنی ذات کہیں پس پشت چلی گئی تھی۔

جب کبھی شادی بیاہ اور عید پر وہ تیار ہوتی تب اسے اپنے وجود سے بے پروائی کا بری طرح احساس ہوتا۔ روکھے بال، ٹوٹے ناخنوں میں پھنسی دیگچیوں کی کالک، پھٹی ایڑیاں، خوب صورت جوتا پہننا ناگوار لگنے لگتا۔ تب وہ تہیہ کرتی کہ آئندہ وہ اپنا خیال رکھے گی لیکن خود سے کیا وعدہ کبھی ایفا نہ ہوا۔

سونیا جو اسے اکثر زبیشتر احساس دلاتی رہتی تھی وہ اسے ہاشم سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتی۔ کہ اس نے تمہیں بیوی نہیں ملازمہ بنا کر رکھا ہوا ہے کل کو تمہارے وجود کی بدصورتی سے اس کا دل بدل گیا تو کاموں کو چاٹتی رہنا۔ وہ دہل دہل جاتی۔ لیکن وہ کیا کرتی کام کرنا بھی ضروری تھے۔

آج تو سونیا نے حد ہی کر دی۔ اس کو کام والی کہہ دیا۔ سوچوں کے دھاگے اس کے دماغ کو



الجھانے لگے۔ اگر واقعی میں ہاشم کے دل سے اتر گئی تو' کیا ہاشم بھی ایسے ہی سوچتا ہوگا جو سونیا نے کہا۔ اس کا دل اندیشوں کی کھائیوں ڈوبنے لگا۔ وہ انہی سوچوں میں الجھی کمرے سے نکل کر کچن میں آگئی۔ اس نے مٹن بریانی پکائی تھی ہاشم بس آنے والا تھا۔ اس کے آتے ہی اس نے کھانا میز پر لگا دینا تھا۔ سونیا کے آنے سے پہلے وہ برتن میز پر لگا چکی تھی سونیا آئی تو اس کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سونیا کو کچھ کھانے کا پوچھتی وہ اس کی اوقات جتا کر اس کے دل کو ڈھیر کر کے چلی گئی۔ اس نے سر جھٹک کر اپنی توجہ رائتے کی جانب مبذول کی۔ اسے رائتے میں نمک ڈالنا تھا۔ ذہن تھا کہ بار بار سوچوں میں الجھ جاتا تھا۔ وہ رائتے کو گھور رہی تھی جب ہاشم کی قریب ابھرتی آواز پر چونک کر پلٹی تو بالکل پیچھے کھڑے ہاشم سے ٹکرا گئی۔ ہاشم نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کیا ہوا۔ اتنی حواس باختہ کیوں ہوں۔'' ہاشم نے اس کی اڑی اڑی رنگت کو بغور جانچا۔

''میں کیوں ہونے لگی حواس باختہ بس آپ اچانک آئے ہیں نا۔ اس لیے ڈر گئی۔'' مصباح سنبھل کر گویا ہوئی۔ ''آپ کو کوئی کام تھا کیا۔''

اسی پل مصباح کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی ہاشم کے صاف ستھرے سفید ہاتھوں میں اس کے ہاتھوں کا بدنما پن نمایاں تھا۔ خوف دامن گیر ہوگیا۔ کہیں ہاشم ہاتھوں کی بدنمائی محسوس نہ کر لے۔ غیر محسوس طریقے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیے۔

''سب کو بھوک لگی ہے۔ آپ بھی کھانے کی میز پر بیٹھیں میں کھانا لگاتی ہوں۔'' مصباح لہجے میں مصنوعی بشاشت سمو کر بولی۔

''او کے''۔

ہاشم کچن سے نکل گیا۔

پھر جھٹ پٹ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ گھر کے سب نفوس کھانے کی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ مصباح سب کی پلیٹوں میں بریانی سرو کرنے لگی کھانے کے بعد سب چائے پیتے تھے۔ اس لیے وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھ چکی تھی۔

ہاشم کی نظر مصباح پر تھی جو جلدی جلدی سب کی مطلوبہ چیزیں فراہم کر رہی تھی۔ ہاشم کی پلیٹ جوں کی توں پڑی ٹھنڈی ہوگئی۔ مصباح کو سب کے کھانے کی فکر تھی لیکن اپنے کھانے کی فکر نہ تھی۔ وہ ایک چمچہ منہ میں ڈالتی' بلال (بیٹا) پانی مانگ لیتا یا کسی کو رائتہ چاہیے ہوتا۔ امی سالن مانگ لیتیں کیونکہ امی کو بریانی پسند نہ تھی۔ مصباح نے ان کے لیے سالن اور پھلکے بنائے تھے۔

''ارے آپ کھا کیوں نہیں رہے کیا پسند نہیں آئی۔'' مصباح کی نظر ہاشم کی پلیٹ پر پڑی جس کو چھیڑا ابھی نہیں گیا تھا۔

ہاشم یہ نہ کہہ سکا تم بھی تو نہیں کھا رہی ہو۔ وہ جانتا تھا مصباح پر کاموں کا بہت بوجھ ہے۔ لیکن جس طرح سے وہ خود کو نظر انداز کر رہی تھی۔ ہاشم کا دل دکھتا تھا۔ وہ ملازمہ رکھنے کا متحمل تو ہو سکتا تھا۔ لیکن مصباح کو خوش تو رکھ سکتا تھا۔

''کیا سوچنے لگے۔ کھا کیوں نہیں رہے۔'' مصباح سر پر کھڑی بے چینی سے استفسار کر رہی تھی۔

''بریانی ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ ہاشم دھیمی آواز میں بولا۔

''تو کیا ہوا میں ابھی گرم گرم بریانی لا دیتی ہوں۔'' مصباح نے اس کی دوسری پلیٹ اٹھائی اور کچن میں چلی گئی۔ فوری واپسی اس کی گرم گرم بھاپ اڑاتی بریانی کی پلیٹ کے ساتھ ہوئی۔

''یہ لیں کھائیں۔'' مصباح محبت سے بولی۔

ہاشم نے بھی جواباً محبت بھری نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی جو اپنی خدمت اور اطاعت کے باعث اس کے دل کی ملکہ بن چکی تھی۔ مصباح نے اس کی ذات کو اتنا سکھ پہنچایا تھا کہ وہ اب ہر پل مصباح کی خوشی سوچتا تھا۔ وہ مزے سے بریانی کھانے لگا۔

بریانی واقعی مزے دار تھی۔ اس نے ستائشی نگاہ مصباح پر ڈالی جو اس کی پلیٹ کی ٹھنڈی بریانی کے

بڑے بڑے نوالے نگل رہی تھی۔ اسے ابھی چائے بھی سرو کرنا تھی۔ برتن اٹھانے تھے، دھو کر کچن صاف کرنا تھا۔ اتنا ڈھیر سارا کام اس کا منتظر تھا۔ ہاشم کے دل کو کچھ ہوا۔ اسے اب مصباح کے لیے واقعی کچھ کرنا تھا۔ کیا کرنا تھا یہ وہ سوچ چکا تھا۔ اب اس پر عمل درآمد کرنا تھا لیکن عمل کرنے کی شروعات میں بھی کافی دن یونہی گزر گئے۔ مصباح گھن چکر بنی گھر کے کاموں میں پستی رہی۔

☆☆☆

''سونیا، یہ شرٹ پریس کردو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' سہیل نے دن کے دس بجے خواب خرگوش کے مزے لیتی سونیا کو نرمی سے پکارا۔

سونیا کا نیند میں مدہوش وجود کسمسایا تک نہ تھا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی سینے تک کمبل اوڑھے لیٹی رہی۔ ''میری شرٹ پریس کردو۔ روزانہ دیر ہو جاتی ہے مجھے۔'' سہیل نے اس کو نیند میں ڈوبا دیکھ کر جھنجوڑ ڈالا۔

''افوہ! کیا مصیبت آگئی ہے۔ دو گھڑی سو بھی لینے دیا کرو۔ اگر دیر سے چلے جاتے تو کون سا قیامت آجانی تھی۔ جانا تو اسٹور پر ہی ہے کون سا آفس جانا ہے۔ جو دیر سویر کا حساب کتاب رکھتے ہو۔'' سونیا بری طرح جھنجوڑے جانے پر سلگ کر بدتمیزی سے بولی۔

سہیل اس کی بدزبانی اور بدتمیزی پر ضبط کر گیا۔ کام پر جانے سے پہلے وہ بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھوک سے اس کی آنتیں چیخ رہی تھیں۔ باہر لاؤنج میں اس کی ماں اور بیٹی سونیا کے بیدار ہونے کے منتظر تھے کہ وہ اٹھے اور کھانے کے نام پر کچھ دے لیکن وہ تو سہیل کے اٹھانے پر بھڑک اٹھی تھی۔ وہ سونیا کو ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر ضبط سے دیکھے گیا۔ اس کا ضبط تب جواب دے گیا جب اس نے سونیا کو دوبارہ کمبل لے کر لیٹتے دیکھا۔

''ہڈ حرام، کام چور عورت، کبھی جو تم نے اپنی ذات سے سکھ پہنچایا ہو۔ تمہیں صرف اپنا خیال ہے، بن ٹھن کر گھر سے نکل جاتی ہو۔ شوہر، ساس، بچی جائے بھاڑ میں، آخر تم چاہتی کیا ہو۔'' سہیل بولا نہیں دھاڑا تھا۔ دونوں کی بلند آواز لاؤنج میں بخوبی سنی جارہی تھی۔ جہاں مصباح کڑھی کا ڈونگا اور چاولوں کی ٹرے لیے منجمد کھڑی تھی۔

سونیا کی ساس نے بے ساختہ مصباح سے نگاہ چرائی تھی۔ ان کے چہرے پر ان دیکھا کرب تھا۔

مصباح جانتی تھی سونیا کو کڑھی چاول پسند ہے۔ سونیا نے کافی دن چکر نہ لگایا۔ تو ساس سے اجازت لے کر آج پہلی بار ان کے گھر چلی آئی۔ لیکن لاؤنج میں درو بام سے ٹکراتی بلند آوازیں اسے منجمد کر گئیں۔ جو کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نکل کر چہار سو کھیل رہی تھیں۔ اب سونیا کی آواز نے سماعتوں کے پردے لرزائے۔

''ہو گیا شروع تمہارا بھونپو، میں بیوی ہوں تمہاری، نوکرانی نہیں۔ مجھ سے کام والیوں والے کام نہ لیا کرو۔ اتنا نہیں ہوتا۔ ایک کام والی رکھ دو۔ کنجوس کہیں کا۔ اب مہربانی فرما کر جاؤ یہاں سے۔ خود شرٹ پریس کرلو۔ میری نیند خراب مت کرو۔ اور ہاں اپنی ماں سے کہہ دینا خود بھی ہاتھ پیر ہلا لیا کریں۔ بہو پر تکیہ کر کے نہ بیٹھی رہا کریں۔ میں خود کو کام والی ماسی بنا کر خدمتیں نہیں کرسکتی۔'' جواباً سونیا نے بدتمیزی اور بدلحاظی کی انتہا کردی۔

سہیل کی کنپٹیاں احساس توہین سے سلگنے لگیں۔ چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ کچھ دیر غیض و غضب سے لہو رنگ آنکھوں سے اکڑی ہوئی بدتمیز عورت کو دیکھتا رہا۔ اس عورت نے اس کی زندگی کانٹوں کی راہ گزر بنادی تھی۔ سہیل کی والدہ جوڑوں کے عارضے میں مبتلا کام کاج کرنے سے قاصر تھیں۔ گھر میں پھیلی بدنظمی اور ابتری سہیل کا دل جلا کر راکھ کردیتی۔ نہ ناشتا وقت پر ملتا نہ ڈنر اور آج تو حد ہی کردی تھی سونیا نے بدزبانی کی۔ وہ خود کو ضبط کی تلقین کرتا کرسی کو ٹھوکر مارتا کمرے سے نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح سونیا نے سہیل کے ردعمل پر تنفر سے سر جھٹکا اور بڑبڑاتے ہوئے خود پر کمبل سیٹ کرنے لگی۔

''اونہہ! مجھے اپنی خادمہ سمجھتا ہے۔'' اسی پل مصباح کا تھکن سے اٹا وجود اس کے تصور میں گھوم گیا۔

بے اختیار جھرجھری لے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔
اس پل جب سونیا نے آنکھیں موندیں باہر لاؤنج میں پتھر بنی مصباح کی آنکھیں پوری شدت سے کھل گئیں۔ سونیا کا اتنا بھیانک روپ۔ وہ پوری جان سے ہل گئی تھی۔ سہیل بھائی کا ضبط کمال تھا وہ جس طرح بنا ادھر ادھر دیکھے لاؤنج سے نکل گئے تھے۔ مصباح کو سونیا پر خوب تپ چڑھی۔ مصباح نے ڈونگا اور ٹرے سونیا کی ساس اور بیٹی کے سامنے رکھی۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں تشکر چمکا۔ مصباح کا دل ان کی بے بسی پر لرز گیا۔ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔ ایسا سجنا سنورنا کس کام کا جو شوہر کے دل کو سکون آشنا نہ کرے۔ وہ اگر اپنے گھر کے افراد کی خدمت میں خود کو بھلائے بیٹھی تھی تو اس کے پیارے رشتے اس سے خوش تو تھے نا ان سب کو مصباح کی عادت ہو چکی تھی۔ وہ ان سب کی محبت ضرورت اور عادت بن چکی تھی۔ اور محبت کے بغیر کب کوئی خوش رہا ہے۔
''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' مصباح سونیا کے گھر سے لوٹی تو کچن میں ہاشم کو برتن صاف کرتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔
''میری سویٹ ہارٹ۔ بندہ آپ کی ہیلپ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کر رہا ہے۔'' ہاشم کے لہجے میں مصباح کے لیے محبت کا سمندر موج زن تھا۔
''آپ ہٹیں میں کر لیتی ہوں۔'' مصباح کو کب گوارا تھا ہاشم کا گھر کے کام کرنا۔ اس نے بازو تھام کر ہٹانا چاہا۔
''نو نو مسز ہاشم، مانا کہ میں فی الحال ملازم افورڈ نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہیں ملازمہ بنا کر بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ یار بیوی ہو تم میری۔ مجھے احساس ہے۔ تم پر کاموں کا بہت بوجھ ہے اسی بوجھ نے تمہیں خود سے غافل کر دیا ہے اور میں نے یہی سوچا ہے کہ آج سے گھر کے کاموں میں مدد کروں گا اور تمہیں کوئی اعتراض نہیں کرنا۔'' ہاشم نے انگشت شہادت اٹھا کر وارننگ دی۔
مصباح نے محبت سے اپنے ہمسفر کو دیکھا جس کی محبت اور احساس نے اس کے چہار سو خوشیوں کے پھول کھلا دیے تھے۔ مصباح نے ہولے سے اس کی انگشت شہادت نیچے کی اور اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔
''مل کر دھوئیں گے۔'' مصباح پر سکون سا مسکرائی۔
''ٹھیک کہا تم نے۔ مل کر ایک دوسرے کا بوجھ بانٹیں گے۔'' ہاشم نے محبت سے اپنا سر مصباح کے سر سے ٹکرایا تو مصباح کھل کر مسکرا دی۔ سارے وہم، خدشے اپنی موت آپ مر گئے تھے دونوں ہنستے مسکراتے باتیں کرتے برتن دھونے لگے۔ آج ہاشم نے مصباح کی خاطر آفس سے چھٹی لی تھی۔

☆☆☆

''بہت فریش لگ رہی ہو مصباح کیا ملازمہ رکھ لی ہے۔'' سونیا نے حیرت سے نکھری نکھری مصباح کو دیکھ کر استفسار کیا۔ کچھ پل کے لیے مصباح خاموش رہی اور بغور سونیا کا جائزہ لیا۔ ستا ہوا چہرہ۔ مضمحل وجود، ملگجا سلوٹ زدہ لباس، شکستہ لہجہ وہ اچھی طرح جانتی تھی سونیا میں در آنے والی تبدیلی کی وجہ۔ لیکن کریدنا اور جتانا اس کی فطرت نہ تھی۔ لیکن اس کے سوال پر مسکرا کر فقط اتنا کہا۔
''ملازمہ تو نہیں رکھی۔ بس ہم دونوں نے بوجھ بانٹ لیا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' سونیا ناسمجھی سے دلکش مسکراہٹ چہرے پر سجائے مصباح کو دیکھ کر رہ گئی۔
''مطلب یہ، میری پیاری دوست کہ گھر کے کام کاج اور شوہر کے عزیز رشتوں کا خیال کرنے سے میں ہاشم کے دل تک اتنی گہری رسائی پا گئی کہ ملکۂ دل بن گئی۔ میں ہاشم کی ملکۂ دل ہوں۔ وہ میرا ایسے ہی خیال رکھتے ہیں جیسے بادشاہ سلطنت کی ملکہ کا رکھتا ہے۔ وہ میرے بوجھ بانٹنے میرے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنا آپ فراموش کر کے ان کا دل جیت لیا تو ان کی محبت ٹھہری۔ محبت بنی تو عادت بننے لگی۔ اب وہ میرے بنا ایک پل نہیں رہ سکتے بلکہ رہ ہی نہیں پاتے۔ بھلا محبت کے بغیر بھی کسی کا گزارا

ہوا ہے۔ اب تم خود کو دیکھو سہیل بھائی نے کیا کیا تمہارے ساتھ۔" وہ سونیا کے زخم ادھیڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں پھسل گیا زبان سے۔

سونیا جو مصباح کے دلکش رنگوں سے سجے چہرے کو رشک سے دیکھ رہی تھی۔ مصباح کی باتیں اسے ملامت کے سمندر میں دھکیل چکی تھیں۔ وہ کتنی غلط تھی۔ مصباح نے سہیل کا حوالہ دیا وہ کیوں برا مناتی۔ مصباح نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ مصباح نے اپنا آپ ہاشم کی خوشی کے لیے فنا کر ڈالا تھا اور اس کی ملکہ دل بن بیٹھی اور وہ خود ہی تو ذمہ دار تھی اپنی برباد زندگی کی۔

سہیل جسے اس نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا ہمیشہ اس کے سامنے زبان چلائی تھی۔ جس کا بڑا پن تھا اس نے اس کی زبان درازی کے باوجود آٹھ سال سونیا کو برداشت کیا تھا لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے بیوی کی ضرورت تھی جو اس کے جسم اور روح کو سکون پہنچائے۔ سونیا ہر روز اس کی روح پر اپنی بدزبانی کے گھاؤ لگاتی تھی۔ وہ اس کی محبت جیتنے کے بجائے اس کے دل سے اتر گئی۔ وہ ملکہ دل تو کیا بنتی اس نے اسے اپنی زندگی سے کاٹ پھینکا تھا۔ اسے نہ سونیا سے محبت تھی نہ سونیا کی ضرورت تھی۔ محبت اور ضرورت کے بغیر بھی بھلا کوئی رہا ہے۔ یہ سونیا نے اب جانا تھا جب سہیل دوسری شادی رچا چکا تھا اور اپنی والدہ کو بھی دوسری بیوی کے پاس لے گیا تھا۔ سونیا کو اس گھر میں صرف اپنی بیٹی کی وجہ سے رہنے کی اجازت دی تھی۔ صرف اپنی بیٹی کی خاطر اس کو طلاق نہ دی تھی۔ اب سونیا کو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیواؤں کی سی زندگی گزارنی تھی۔ یہ اس کی اپنی بوئی ہوئی فصل تھی۔ جس کی کٹائی اب جان گسل تھی۔ اب وہ بری طرح پچھتاتی تھی لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

سونیا آنکھوں میں آنسوؤں کی مالا پروئے سوچتی رہ گئی۔

"مصباح۔" ہاشم کی محبت بھری پکار پر مصباح کی آنکھیں محبت سے لو دینے لگیں۔ اس کی چمکتی لو دیتی آنکھوں نے سونیا کو رشک میں مبتلا کیا تھا۔

"سونیا میں ہاشم کی بات سن لوں۔" مصباح بنا سونیا کا جواب سنے کمرے سے نکل گئی۔

سونیا کو اپنا مزید بیٹھنا بے کار لگا تو سرد آہ بھر کر سانس فضا برد کی اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ ہاشم اور مصباح کو لاؤنج کے وسط میں کھڑے باتوں میں مگن دیکھا تو بنا قدموں کی چاپ پیدا کیے لاؤنج سے نکل گئی۔ مصباح نے تاسف و دکھ سے لاؤنج سے نکلتی سونیا کو دیکھا۔

ہاشم صرف مصباح کی جانب متوجہ تھا اسے سونیا کے جانے کی خبر تک نہ ہوئی ویسے بھی اسے سونیا کی ہسٹری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے صرف اپنی بیوی کی پروا تھی۔ جو اس کے دل کی ملکہ تھی۔

"ہاں تو آپ کیا کہنے والے تھے۔" مصباح نے سونیا کے جانے کے بعد روئے سخن ہاشم کی جانب کر کے استفسار کیا۔

"بتا تو چکا ہوں۔ دھیان کدھر ہے تمہارا۔" ہاشم نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"میرا دھیان کدھر ہوتا ہے۔ میرے دھیان کی ساری ڈوریں تو آپ کے ساتھ بندھی ہیں۔" مصباح ہاشم کے کندھے پر سر رکھ کر انداز دلربائی سے بولی۔

ہاشم اس کی ادا پر نہال ہو گیا۔

"میں کہنے والا تھا سوئٹ ہارٹ کہ میری پروموشن ہو گئی ہے۔ اگلے ماہ ایک عدد ملازمہ ہم آپ کو گفٹ کر دیں گے۔ لیکن آپ کی ہیلپ کے لیے بندہ چوبیس گھنٹے ہمہ وقت حاضر رہے گا۔"

"تو آفس کب جائیں گے جب چوبیس گھنٹے مجھے سروس مہیا کریں گے۔" مصباح کھلکھلائی۔

"چلو بارہ گھنٹے کر لو۔"

مصباح ایک ٹک ہاشم کو محبت سے دیکھے گئی۔ خوشی کا انمول آنسو اس کی آنکھ میں چمکا تھا۔ دل پر برستی سکون کی پھوار میں وہ اپنا ہاتھ ہاشم کے ہاتھ میں دے گئی جو اس کی انگلی میں اب گولڈ کی رنگ پہنا رہا تھا۔ مصباح خوش تھی بے انتہا خوش۔

☆☆

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

عدل وانصاف

☆ اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو (اور وقت آنے پر) اللہ کی طرف گواہی دو اگرچہ خود پر ہو یا اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں پر اگر کوئی مال دار یا فقیر ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تم انصاف کرنے میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے
(سورۃ النسا 135)

☆ اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل چھوڑ دو، عدل کیا کرو یہی تقویٰ کے قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔"
(سورۃ المائدہ۔8)

تہمت لگانا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
جو کسی مسلمان کی برائی بیان کرے جو اس میں نہیں پائی جاتی تو اس کو اللہ عزوجل اس وقت تک ردغۃ الخبال (یعنی جہنم میں وہ جگہ جہاں دوزخیوں کی پیپ اور خون جمع ہوگا اس) میں رکھے جب تک اس کے گناہ کی سزا پوری نہ ہو جائے (ابوداؤد ج 3 ص 427 حدیث 3597)

☆ انسان کے جھوٹ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے، بیان کرتا پھرے (صحیح مسلم)۔

ریاست مدینہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست مدینہ میں عدل وانصاف کا مثالی نمونہ پیش کیا۔
خیبر کی فتح کے بعد مفتوحہ زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہود نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ چونکہ زمین پر بہتر کاشت کر سکتے ہیں لہٰذا زمینیں ان کے پاس ہی رہنے دی جائیں اور وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ بٹائی کا وقت آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجتے جو فصل کے دو حصے کرتے اور یہود سے کہتے کہ اس میں سے جو حصہ چاہے لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے کہ زمین اور آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔
(بلاذری)

افشاں سمیع...... کراچی

اقوال حضرت علیؓ

☆ اگر کوئی آپ کی فکر کرتا ہے تو اس کی قدر کرو کیونکہ دنیا میں تماشائی زیادہ اور فکر کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

☆ دوست کی غلطی ریت پر لکھو تاکہ اسے پانی مٹا دے اور دوست کے احساس پتھر پر لکھو تاکہ کوئی اسے مٹا نہ سکے۔

☆ جو شخص تمہارا غصہ برداشت کر لے اور ثابت قدم رہے تو وہ تمہارا سچا دوست ہے۔

☆ گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کر دیتا ہے۔

☆ اگر میری زندگی میں دکھ نہ ہوتے تو میں اپنے رب کے ساتھ دعا کا رشتہ کیسے نبھاتا۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

مسکراہٹ

☆ مسکراہٹ زندگی کی نشانی ہے۔

☆ مسکراہٹ والے کا دل نفرت سے پاک ہوتا ہے۔

☆ مسکراہٹ تاریکی کے بادلوں میں امید کی کرن ہے۔

☆ مسکراہٹ ایک ایسی بوند ہے جو پتھر میں بھی

چھید کر دیتی ہے۔

☆ مسکراہٹ دنیا کے دکھوں کو دور بھگاتی ہے۔

☆ مسکراہٹ دوستی کی ابتدا ہے۔

☆ مسکراہٹ پتھروں کو موم کر دیتی ہے۔

قاضی صبا ایوب......اٹک

ناواقف

ایک کسان نے دوسرے کسان سے پوچھا: ''وہ جو تم کھیتوں کے کام وغیرہ میں ہاتھ بٹانے کے لیے شہر سے ایک کارندہ ساتھ لائے تھے۔ وہ آج کل نظر نہیں آ رہا...... کہاں گیا وہ؟''

''تمہیں نہیں معلوم......؟ اس کا تو انتقال ہو گیا۔'' پہلے کسان نے بتایا۔

''انتقال......؟ مگر کیسے......؟ وہ تو اچھا بھلا صحت مند دکھائی دیتا تھا۔'' دوسرے کسان نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......صحت مند تو تھا......لیکن آخر شہری تھا!'' پہلے کسان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''لیکن ہوا کیا؟'' دوسرے کسان نے تجسس سے پوچھا۔

''تمہیں تو معلوم ہے شہر میں جب گاڑیاں خراب ہو جاتی ہیں تو مکینک ان کے نیچے گھس کر لیٹ جاتے ہیں اور دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں چل رہی۔''

''ہاں......وہ تو ٹھیک ہے......مگر اس سے تمہارے کارندے کی موت کا کیا تعلق ہے؟'' دوسرے کسان نے حیرت سے کہا۔

''ایک روز میرا گھوڑا چلتے چلتے راستے میں اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کارندہ یہ دیکھنے کے لیے اس کے نیچے گھس گیا کہ وہ کیوں نہیں چل رہا......؟''

ادیبہ ظفر......فیصل آباد

ڈرامہ دیکھ کر جاؤں گا

جارج برنارڈ شا کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی ایک بار انہیں ایک دوسری ڈرامہ نگار خاتون نے بہت اصرار کرتے ہوئے بلایا تاکہ خاتون کا لکھا ہوا ڈرامہ جو اسٹیج پر ہو رہا تھا برنارڈ شاہ بھی دیکھیں۔ برنارڈ شاہ بڑی مشکل کے بعد تیار ہو گئے۔ تھیٹر میں وہ خاتون برنارڈ شاہ کے پاس بیٹھ گئیں۔ ڈرامہ کے دوران وہ بار بار اپنے بال سمیٹ سمیٹ کر کلپ کر رہی تھیں۔ یہ شاید ان کی عادت تھی۔ ایسے اسی لمحے برنارڈ شاہ کو اپنی ڈاڑھی میں کھجلی ہوئی تو انہوں نے ہاتھ لگایا تو پتا چلا کہ ان کی ڈاڑھی کے چند بال ان خاتون نے اپنے بالوں کے ساتھ ہی کلپ کر لیے ہیں۔ شاہ مسکرائے اور خاتون سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پورا ڈرامہ دیکھ کر جاؤں گا۔ میری ڈاڑھی کے بالوں کو کلپ کرنے کی آپ خواہ مخواہ زحمت کر رہی ہیں بعدازاں یہی خاتون ان کی اہلیہ بنیں۔

منزہ بھٹی......کراچی

دیس دیس کی کہاوتیں

☆ سفید بال عمر کی نشان دہی کرتے ہیں عقل کی نہیں (یونانی کہاوت)

☆ جس کے سب ہی دوست ہوں اس سے تعلق پر نظر ثانی کرو (عربی کہاوت)

☆ ہر آدمی کے تین چہرے ہوتے ہیں پہلا چہرہ دنیا کو دکھانے کے لیے، دوسرا چہرہ اپنے خاندان کو دکھانے کے لیے۔ تیسرا چہرہ جو آپ کسی کو نہیں دکھاتے (جاپانی کہاوت)

☆ کل کے دو سے آج کا ایک بہتر ہے (انگلینڈ کی کہاوت)

☆ آوارہ کتوں کا غول شیروں کا شکار نہیں کرتے (چینی کہاوت)

حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ

دلیل

آمین اور مامون خلیفہ ہارون الرشید کے دو بیٹے تھے۔ آمین ملکہ زبیدہ کا بڑا لاڈلا تھا اور مامون ہارون الرشید کا۔ ایک دن زبیدہ نے طنزاً پوچھا۔

''امیر المومنین! آمین مامون سے بدرجہا شائستہ

ہے لیکن آپ پھر بھی مامون کو اچھا سمجھتے اور زیادہ پیار کرتے ہیں۔"

"ہارون الرشید نے کہا۔ "ٹھہرو، میں ابھی جواب دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک مقرب کو بلایا اور کہا کہ شہزادہ آمین کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو۔ "اگر آپ خلیفہ ہو جائیں تو مجھے کیا دیں گے؟"

مقرب نے آمین کے پاس پہنچ کر یہی سوال کیا۔ اس کو جواب ملا۔ مصر کی حکومت تمہاری ہو گی۔"

" مقرب نے بارگاہ خلافت میں آکر آمین کا جواب پہنچا دیا۔

ہارون الرشید نے مقرب سے کہا۔ "اب یہی بات جا کر مامون سے پوچھو اور جواب ملنے پر مطلع کرو۔"

" مقرب نے مامون سے بھی یہی سوال کیا۔ مامون اس وقت کچھ لکھ رہا تھا۔ سوال سنتے ہی دوات اٹھا کر مقرب کے منہ پر دے ماری اور کہا۔

" او بدبخت! مجھ سے میرے باپ کی موت کی بات کرتا ہے۔ اللہ نہ کرے۔ میں اس کے بعد بھی زندہ رہوں۔"

مقرب نے یہ قصہ خلیفہ کے روبرو عرض کر دیا۔ خلیفہ نے ملکہ زبیدہ کی طرف دیکھا۔ زبیدہ نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں۔

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

شکر ہے

مجاز سخت بیمار تھے۔ ہسپتال میں دوستوں کا ایک گروہ عیادت کے لیے پہنچا۔ ایک نے کہا۔ "مجاز زندہ باد۔ اب تم ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہو۔"

دوسرے نے کہا۔ "تمہارے چہرے پر سرخی جھلک رہی ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آنکھوں میں پرانی چمک عود کر آئی ہے۔ اب تم بالکل صحت مند دکھائی دیتے ہو۔

مجاز نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا "مسرت ہے کہ میں تندرستی کی حالت میں مر رہا ہوں۔"

حریم سلمان...... کراچی

ازدواجیات

عورتوں کے ایک گروپ سے پوچھا گیا کہ کون کون اپنے شوہر سے پیار کرتی ہے؟ سب نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ ان سب کو ایک پیغام دیا گیا کہ اپنے شوہر کو ایس ایم ایس کر دو۔ "آئی لو یو"

تو ان کے شوہروں کے جواب کچھ یوں آئے۔

1۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔
2۔ اب کیا ہو گیا؟
3۔ پھر سے کار کہیں مار دی کیا؟
4۔ ایکسکیوز می۔
5۔ صرف اتنا بتاؤ پیسے کتنے چاہئیں؟
6۔ نشہ تو نہیں کیا؟
7۔ اب کیا کر دیا تم نے؟ اس بار معاف نہیں کروں گا۔

اور سب سے اچھا جواب یہ تھا۔

8۔ آپ کون ہیں؟

ہانیہ عمران...... گجرات

عبداللہ سندھی کہتے ہیں

جب طالب علم کو بغیر سمجھے کسی بات ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے تو اس طرح کی مجبوری اس کی عادت بن جاتی ہے اور وہ زندگی میں ہر چیز بغیر سمجھے قبول کرنے لگتا ہے جو ذہنی غلامی اور ذلت کا باعث بنتا ہے۔ جو استاد اپنے شاگردوں کو مذہبی حقائق سمجھا نہیں سکتا، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ انہیں مذہبی تعلیم دے۔

سنگم

میں نے اس سے کہا
کیا دھوپ میں بارش ہوتی ہے
وہ روتے روتے ہنسنے لگی
اور دھوپ میں بارش ہونے لگی

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

خوشی سرانوالی، کی ڈائری میں تحریر
ایک خوبصورت نظم

یہ جو زیست کا سفر ہے
یہ جو راستہ ہے میرا
تم اگر ساتھ نہ دو گے تو
یہ کس طرح کٹے گا؟
میری سوچ کی حدوں تک
یہ گمان بھی کیسے آئے
کوئی پل بنا تمہارے
بھلا کیسے بیت جائے
میرے پاس تم نہیں ہو
میرے پاس کب نہیں ہو
میری یاد کے نگر میں
میرے خواب کے سفر میں
میری سوچ کی تہوں تک
میری آنکھ کے بھنور میں
میرے دل میں، جاں میں، تن میں
میری حسرتوں کے بن میں
میرے دل کی تیرگی میں
میری شب کی روشنی میں
ہاں تم ہی ہو، ہر کہیں ہو
میرے پاس تم نہیں ہو
میرے پاس کب نہیں ہو
میری ہر دعا کا محور
بس آرزو تمہاری
کوئی راستہ نہیں ہے
تمہیں کس قدر ہے چاہا
یہ تمہیں پتا نہیں ہے

فائزہ بھٹی، کی ڈائری میں تحریر
امیر مینائی کی غزل

ہنس کے فرماتے ہیں وہ دیکھ کے حالت میری
کیوں تم آسان سمجھتے تھے محبت میری

بعد مرنے کے بھی چھوڑی نہ رفاقت میری
میری تربت سے لگی بیٹھی ہے حسرت میری

میں نے آغوش تصور میں بھی کھینچا تو کہا
پس گئی پس گئی بے درد نزاکت میری

آئینہ صبح شب وصل جو دیکھا تو کہا
دیکھ ظالم یہ تھی شام کو صورت میری

یار پہلو میں ہے تنہائی ہے کہہ دو نکلے
آج کیوں دل میں چھپی بیٹھی ہے حسرت میری

حسن اور عشق ہم آغوش نظر آ جاتے
تیری تصویر میں کھنچ جاتی جو حیرت میری

کس ڈھٹائی سے وہ دل چھین کے کہتے ہیں امیر
وہ مرا گھر ہے رہے جس میں محبت میری

زرینہ خانم، کی ڈائری میں تحریر
بھائی کی یاد میں ایک

رنج جتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے

کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

ایک پل چھین کے انسان کو لے جاتا ہے
پیچھے رہ جاتے ہیں سب ساتھ نبھانے والے

لوگ کہتے ہیں تو دور اُفق پار گیا
کیا کہوں اے مرے دل میں اتر آنے والے

جانے والے تیری مرقد پہ کھڑا سوچتا ہوں
خواب ہی ہو گئے تعبیر بتانے والے

ہر نیا زخم کسی اور کے سینے کا مسعود
چھیڑ جاتا ہے مرے زخم پرانے والے

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
عبیداللہ علیم کی نظم

'یاد'

کبھی کبھی کوئی یاد
کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر
ایسے دستک دیتی ہے
شام کو جیسے تارا نکلے
صبح کو جیسے پھول
جیسے زمیں پر دھیرے دھیرے
رشتوں کا نزول
جیسے روتے روتے اچانک
ہنس دے کوئی ملول
کبھی کبھی کوئی یاد، کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر ایسے دستک دیتی ہے

بشریٰ یامین ملک، کی ڈائری میں تحریر
اتباف ابرک کی غزل

غیر کی خاک جستجو کرتے
آپ ہوتے تو آرزو کرتے

وقت منت کرے مداوا کرے
اور پھر سے ہو بہو کرتے

حل مسائل جو بات سے ہوتے
عمر بھر خود سے گفتگو کرتے

یاد آتی ہے بن کے نالہ بر
تھا گلہ گر تو رو برو کرتے

جب رگ و جاں میں کوئی بستا ہو
اور کو کیسے تم سے تو کرتے

کس کو فرصت ہے اس مشقت کی
آپ ہوتے تو دل رفو کرتے

اب سہارا ہیں شعر ہی میرے
ہم کو لکھ لکھ کے سرخرو کرتے

تنگ ان آنسوؤں سے ہوں ابرک
جو خبر تیری چار سو کرتے

ادیبہ ظفر، کی ڈائری میں تحریر
حبیب جالب کی غزل

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پرنور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذروں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غم جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... فہیما اعوان
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

شکر گزاری

بندے کو اپنے کسی عمل پر پھولنا نہیں چاہیے، اس لیے کہ وہ اس کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ توفیق بھی وہی دیتا ہے، قوت عمل بھی اس کی دی ہوئی ہے۔ راستہ بھی وہی بناتا ہے اور بندے کے اندر عمل کی تلقین بھی وہی ڈالتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اچھا عمل کر کے خود پر فخر کر لیا تو سب کچھ تباہ کر لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے لیے کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، افسوس کیا، غم کیا تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ اللہ کے عام بندوں میں اور خاص بندوں میں یہ ہی فرق ہے۔

(علیم الحق حقی...... عشق کا شین)

اقراء سرور...... ڈی جی خان

سچ

اماں کو میری بات ٹھیک سے سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کیے بغیر نئی روٹی بیلتے ہوئے پوچھا۔

''تو اپنی کتابوں میں کیا پیش کرے گا؟''

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میں سچ لکھوں گا اماں، اور سچ کا پرچار کروں گا۔ لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں اور سچ کی تلقین کروں گا۔''

میری ماں فکر مندسی ہو گئی۔ اس نے بڑی درد مند سے مجھے غور سے دیکھا اور کوئلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تو نے سچ بولنا ہے تو اپنے بارے میں بولنا، دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر ان کی زندگی عذاب میں نہ ڈال دینا۔ ایسا فعل جھوٹ سے بھی برا ہوتا ہے۔''

(اشفاق احمد...... صبحانے افسانے)

ادیبہ ظفر...... فیصل آباد

قسمت

اللہ خود پر کوئی احسان نہیں رکھتا، اگر آپ نے اس کے لیے کوئی چیز چھوڑی ہے تو وہ آپ کو اس سے بہتر شے سے نواز دے گا انسان کی خواہشات سے اللہ کو دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس کی تقدیر اپنی مرضی سے بناتا ہے، اسے کیا ملنا ہے اور کیا نہیں ملنا اس کا فیصلہ وہ خود کرتا ہے۔ جو چیز آپ کو ملنا ہے، آپ اس کی خواہش کریں یا نہ کریں، وہ آپ ہی کی ہے۔ وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں آئے گی۔ انسان کا مسئلہ ہے کہ وہ جانے والی چیز کے ملال میں مبتلا رہتا ہے، آنے والی چیز کی خوشی اسے مسرور نہیں کرتی۔

(عمیرہ احمد...... ایمان، امید اور محبت)

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

اداسی کا سبب

میری اداسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو نہ سوچتے ہوں اور نہ اداس ہوتے ہوں۔ یہاں میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ جو لوگ نہ سوچتے ہیں اور نہ اداس ہوتے ہیں، وہ فقط اپنی صورت اور ہیت کے اعتبار سے انسان ہوتے ہیں۔

(جون ایلیا)

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

بے دردی بالما

جتنی دیر ہماری شادی رہی انہوں نے کبھی میرے احساسات کو نہیں سمجھا۔ ایک دفعہ میں نے کہا کہ مجھے چوڑیاں لا دیں۔ اگلے دن سید نور کی فلم ''چوڑیاں'' اٹھا لائے۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ گھر کے گراؤنڈ میں دوڑ لگا رہے تھے۔ اسٹاپ واچ میرے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے کم سے کم وقت میں دوڑ کر ایک درخت کو ہاتھ لگانا تھا۔ جیسے ہی وہ دوڑے، میں پرجوش ہو کر چلائی۔

''گو جان گو۔''

بس اتنا سننا تھا کہ وہیں اسٹاپ ہو گئے اور شدید برہم ہونے لگے۔

''تم مخالفین کے ساتھ مل گئی ہو۔''

(گل نوخیز اختر...... خاتون کی ڈائری)

قاضی صبا ایوب...... اٹک

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

اقراء سرور......ڈی جی خان

2020ء کا اگست میرے لیے بہت خوشیاں لے کر آیا۔ میری سالگرہ تھی میرے وطن پاکستان کی سالگرہ تھی۔ تینوں شماروں شعاع، خواتین اور کرن میں میرا خط شامل تھا۔ سب سے بڑی خوشی منعم ملک کا ''بالوشے'' دیکھ کر ہوئی، پڑھ کر تو دنگ اور گنگ رہ گئی۔ سبحان اللہ، منعم ملک آپ نے کمال کا حق ادا کر دیا وطن سے محبت کا۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ نے ڈی جی خان کو منعم ملک سے نوازا۔ منعم ملک میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگست کا شمارہ 2020 کا بہترین اور نمبرون شمارہ ٹھہرا میری نظر میں۔ مصباح علی سید کا ''کانچ کے سائباں'' سبق آموز موضوع، منفرد ناموں، دلچسپ، سسپنس اور رومینس کے ساتھ بہت بہت زیادہ پسند آیا۔ مسکان احزم نے ماسکو کی سیر کروائی زوناشے اور ریان نے اپنی محبت کی کہانی کی تکمیل کی ماسکو نے نہیں رب نے ان کو ملا دیا۔ زبردست مسکان بہت زبردست ناولٹ تھا۔ شکر نگہت آپی نے حمزہ کی ربیکا سے جان چھڑائی اب ایسا کریں شہر بینہ کی جہانداد سے بھی جان چھڑا دیں۔

ارسلہ کی لالچ عروج پر ہے زوال آئے گا تو سکندر کے قدموں میں جا گرے گی۔ سکندر کی قسمت ہے سکندر کے پاس لوٹ آئے گی دیکھیے ہوتا ہی کیا۔ ''زندگی کے رنگ'' بہت ہیں زندگی کا ہر رنگ نرالا اور ہر موڑ کٹھن ہے۔ مشکل ہے۔ ہر موڑ کا توڑ بھی نہیں۔

''کنار خواب جو'' سوار بڑا چھپا رستم نکلا۔ ہماری کنعان کو پہلے دن سے پسند کرتا تھا اور ہم جیسے ذہینوں کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ ہاہاہا۔

''پریت بدلے ریت'' بھابھی کا اعلا کردار متاثر کر گیا۔ اسفند نے اگر نکاح کر لیا تھا تو پہلے کوئی بڑا اسٹینڈ لیتا نہ کہ تعلق۔ نتیجتاً بے چاری لڑکی کو اتنا بڑا دکھ اٹھانا پڑا۔ شکر کہ ایک بھائی عفرا جیسی اعلیٰ ظرف عورت کی وجہ سے بدنامی کے دکھ سے بچ گیا۔ عطیہ خالد کی ''مٹن'' نے رلا دیا۔ زارا ہنجرا کی عید اسٹوری مزا دے گئی۔ ''اف یہ موسم'' والدین کی یہ ضد بڑی بھیانک ہوتی ہے کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے میرے بھانجے انس کے دوست نے اپنے والدین کی ضد میں آ کر پتا ہے کیا کیا؟ اس کم عمر لڑکے نے اپنی جان لے لی۔ ماں کہتی تھی میری مرضی پر شادی کرو۔ باپ کہتا میری مرضی پر۔ اس نے جا کر خودکشی کر لی۔ خود میں بھی کچھ اسی طرح کی والدین کی ضد کی بھینٹ چڑھنے لگی ہوں۔ تمام قاری بہنوں سے گزارش ہے اگر کبھی میں بنت سحر کی طرح اچانک گم ہو جاؤں تو میری واپسی کی دعا ضرور کیجیے گا۔

ج: اقراء جی! ایسا نہ کہیں گم ہو جاؤں گی۔ ان شاء اللہ کرن اور آپ کا ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے والدین اپنی اپنی ضد چھوڑ دیں اور وہ فیصلہ کریں جس میں آپ کی بہتری ہو اور اللہ تعالیٰ بھی وہ فیصلہ آپ کے حق میں اچھا کرے۔ آمین

حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ

کرن کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ چند روز قبل مارکیٹ جانا ہوا جیسے ہی کرن نظروں سے گزرا اسے خرید کر گھر لے آئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے پہلے میں نے کرن کو نہیں پڑھا۔ کرن کا مطالعہ کیا تو منفرد نوعیت کا معیاری رسالہ پایا تو قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئی کرن کی تحریریں اچھی تھیں مختلف موضوعات پڑھنے کو ملے۔ پھلوں کی افادیت کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ اس بار خوبانی کے بارے میں جانا۔ کرن کے دسترخوان میں اچھے اچھے کھانے بنانے کو موجود تھے۔ نفسیاتی مسائل میں سب سے اہم موضوع ''احساس کمتری'' پڑھنے کو ملا۔ یہ حقیقت ہے جو لوگ خوش رہتے ہیں اور دوسروں کی خوشی کا باعث

بنتے ہیں۔ ان میں احساس کمتری کم پایا جاتا ہے۔ ''نام میرے نام'' پڑھ کر بہت خوش ہوئی ایک گھر کے جیسا ماحول پایا۔ ''کرن کرن خوشبو'' پڑھ کے بہت زیادہ معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند آیا۔ ساجدہ جاوید سندیلو کو پڑھ کر مزا آ گیا۔ آپ کے سوال جواب پڑھ کر تو ذہن کو تفریح ملنے کے ساتھ ساتھ ایک قدرتی خوشی ملی بہت اچھا لکھا آپ نے۔ اجازت چاہتی ہوں اس بات کے ساتھ کہ دوسروں کے لیے خوشی کا باعث بنیں نہ کہ پریشانی کا۔

ج: حمیرا انجم جی! آپ کو ماہنامہ کرن پسند آیا بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ماہ آپ ''کرن'' کی کہانیوں کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں گی۔

طوبیٰ ممتاز......فاضل شاہ ضلع خانیوال

اگست 2020ء کا شمارہ ہاتھ میں ہے ٹائٹل گرل اچھی لگ رہی ہے۔ اداریہ پڑھا واقعی دل خون کے آنسو روتا اگر پاکستان کے قائد آج حالات اور مسلمانوں کے ریزہ ریزہ ہوتے اتحاد کو دیکھ لیتے تو ...... خیر اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم و کرم فرمائے۔ آمین۔

''مقابل ہے آئینہ'' اقراء سرور نے بہت پیارے پیارے نیچرل جوابات دیے پڑھ کے مزا آیا۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' ناول کمال کا ہے لیکن ارسلہ کو تو دل کرتا ہے دو چار لگا دوں اتنی سیلفش اور ہوس مال و زر کی۔ اس نے تو مڈل کلاس لڑکیوں کو ہی بدنام کر دیا ہے۔ آبص بے چارہ......! اور اریبہ کا دماغ بھی خراب ہو رہا ہے کیا؟ بھائی پہ ہی عاشق ہوئی جا رہی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں مرضی ہے اس کی۔ وہ بھائی نہیں مانتی تو ہم کیوں زبردستی کریں۔

''پریت بدلے ریت'' گل ارباب ہمیشہ کی طرح لاجواب لکھا لیکن رلا رلا کے برا حال کر دیا آپ نے۔ بھابھی ہوں تو ایسی جیسی ہانیہ کی تھی۔ ویسے ہماری بھابھیاں بھی کسی سے کم اچھی نہیں ہیں۔ یہ جملہ بہت پسند آیا۔ ''عورت کی ذرا سی لغزش تمام عمر ماتھے کی کالک بن کر اسے ہزاروں میں الگ سے پہچان دے دیتی ہے۔'' اب آتے ہیں موسٹ فیورٹ کہانی کی طرف ''کنار خواب جو'' فرح بخاری بڑے دل سے لکھتی ہیں۔ کیا منظر نگاری کرتی ہیں کہ قاری ڈوب جاتا ہے۔ پلیز سوار علی کو کنعان کا ہی رہنے دیں۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ وقاص اور سوار علی کا ایک ہی خاندان ہے۔ دونوں ہی مشکوک لگتے ہیں۔ (ہاہاہاہا)۔ ''کانچ سے سائبان'' ابھی تبصرہ نہیں کر سکتی کردار کھلیں گے منظر واضح ہوگا تو کروں گی۔ (معذرت)

''بالوشے'' منعم ملک کا ایک ایسا لازوال ناول جو تا حیات خلق خدا کے اذہان پہ حاوی رہنے والا ہے۔ حاجرہ کی قربانی اور سرزمین کی شہادت کا پڑھ کے تو میں رونے ہی بیٹھ گئی۔ ''تیری راہ ہے میری منزل'' یہ بھی اپنی طرز کی ایک لاجواب تحریر تھی۔ بلکہ ہے۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی فرسٹ آف آل تھا ''مٹن''، ''چابی کی گڑیا'' بھی اچھی تحریر تھی آج کل ہر گھر کی کہانی۔ ''عہد رفتہ'' بس ٹھیک تھی۔ ''تیری دید میری عید'' اف جلد بازی میں ہمیشہ بدگمانیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ البتہ اچھی تحریر ہے۔ ''ڈگڈگی کا بندر'' بھی ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی تحریر ہے کہ عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ''اف یہ موسم'' مکافات عمل بھی موزوں عنوان ہو سکتا تھا۔ ''زندگی کے رنگ'' واقعی اسفند جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو ہم ''کنواروں'' کو شادی سے متنفر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چلو دیر آید درست آید۔ ''کرن کرن خوشبو'' بہترین سلسلہ ہے۔ ''بدنامی'' پڑھ کے مسکراتے مسکراتے ہنسی چھوٹ گئی۔ ڈاڑھی واقعی گویا ڈاڑھی نہ ہوئی اسلحہ ہو گیا۔ مجھے ڈاڑھی والے لوگ بہت پسند ہیں۔

''یادوں کے دریچے سے'' ساغر صدیقی کی غزل دل کو چھو گئی۔ باقی بھی اچھی ہیں۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' ''جوانی کے دن'' اقتباس بہت اچھا لگا۔ خطوط سارے ہی اچھے تھے۔

''گھر کی خوب صورتی اور رنگ برنگی پوٹلی بہترین تجاویز تھیں۔ خوبانی واقعی ایک فائدہ مند پھل ہے۔ لیکن اس کے اتنے فائدے پہلی مرتبہ پڑھے ہیں۔ احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بہت اچھے طریقے

بتائے گئے۔ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ "کچن اور آپ" ساجدہ جاوید سندیلو کے جوابات پسند آئے اور گاجر کا حلوہ اف منہ میں پانی آ گیا۔ "کرن کا دسترخوان" اف ابھی ہم اتنے ہیوی کھانے بنانے کے قابل نہیں ہوئے۔

ج: طوبیٰ جی! اگست کا شمارہ آپ کو پسند آیا ہم بہت مشکور ہیں۔ پچھلے دنوں بارش کی وجہ سے کچھ خرابی تھی فون کی لائنوں میں آپ اب اپنی کہانیوں کے بارے میں کرن کے آفس فون کر کے معلوم کر سکتی ہیں۔

بشریٰ یامین ملک...... دریا خان ضلع بھکر

بھوری چڑیاں گل سٹوفہ کے خوب صورت پتوں کی آغوش میں چھپ کر چلچلاتی دھوپ سے بچاؤ کر رہی ہیں اور سٹوفہ کی سرخ ننھی کلیاں خوشنمائی میں اضافہ کر رہی ہیں اور ہیلی کاپٹر کی گڑگڑ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے۔ ٹائٹل پر براجمان ایلف خان! مسکراتے ہوئے سر میں خارش کر رہی تھیں، ہاہاہا۔ بھئی واہ اتنی دیدہ دلیری۔ قہقہے لگا کر عرفان کھوسٹ سے ملاقات کی پھر ماہ نور خان کا انٹرویو پڑھا اچھا تھا۔ "مقابل ہے آئینہ" میں شکیلہ سہیل حسن کے تفصیلی جواب پڑھے بہت اچھے تھے۔ چلو خیر ہے پھر فائزہ بھٹی کا خط پڑھا۔ لڑکے جو لڑکیوں پر شرط لگاتے ہیں بالکل میرا بھی دل کرتا ہے کہ سیدھے ہاتھ کا دوں۔ آپ الٹے ہاتھ کا اور میں سیدھے کا جسے بھی پڑ گیا وہ ہمیشہ یاد رکھے گا رانجھے کا باپ نہ ہو تو ہاہاہا۔ پھر "کرن کتاب" کا رخ کیا یار کرن کتاب کا نام چینج ہونا چاہیے کیونکہ کرن کتاب کا حجم ہرگز کتاب والا نہیں ہے۔ افغان جیولری پسند آئی پھر مہکتے شیریں اور خوشبودار گرمے پر نظر دوڑائی شکر! کہ آپ نے مزیدار گرمے نہیں لکھا کیونکہ مجھے پسند نہیں۔ "کچن کو صاف رکھیں مگر کیسے؟" بھئی ہاتھوں سے صفائی کر کے اور کیسے ہاہاہا ٹپس اچھی تھیں سلسلہ بھی بہترین ہے۔ "ہمیشہ ساس ہی کیوں غلط ہوتی ہے؟" کیونکہ وہ سانپ میرا مطلب ہے ساس جو ہوتی ہے۔ زرتاشیہ نعمان کچن میں کھڑی نظر آئیں چلیں بیٹھ جائیں ورنہ تھک جائیں گی جواب مزیدار تھے۔ اور مزیدار ہو سکتے تھے اگر آپ بریانی کی ریسپی بتانے کے ساتھ بنا کر کھلا بھی دیتیں ہاہاہا۔ کرن کے دسترخوان پر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا لیکن ہر ڈونگے اور ڈش کا ڈھکن ہٹا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ صرف ریسپی لکھی ہے "کچھ موتی چنے ہیں" اس بار صرف چار موتی تھے پھر میں نے منزہ بھٹی، ماریہ نذیر اور اریبہ ظفر کی نظر بچا کر تبسم بشیر کا موتی اٹھا لیا جو سب سے زیادہ چمکدار و سفید تھا۔ ثمینہ اکرم! میں نے عشق نہیں کیا گویا میں پیدا ہی نہیں ہوئی اور آسمان سے خط لکھ رہی ہوں ڈریں نہیں میں انسان ہی ہوں۔ سحر وقاص کی تبدیلی حقیقی تھی۔ افسانوں میں "دو اور دو پانچ" امیمہ نے کب دو اور دو کو پانچ بنایا پتا ہی نہیں چلا ناول میں "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" ارسلہ گھامڑ پیسے کی بھوکی، اس کی بھوک آخر کب ختم ہوگی۔ یا اللہ! دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ ارسلہ، سب کچھ پیسہ نہیں ہوتا اپنی عیاری کو استعمال میں لانا بند کر دو بس...... باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے اور ہاں کرن میں اشتہارات کی کمی بہت اچھی بات ہے۔

بشریٰ یامین جی: آپ کا تفصیلی اور دلچسپ بڑھ کر مزا آیا۔ "کرن کتاب" کرن کی پہچان ہے۔ اس لیے کوئی اور نام نہیں ہو سکتا۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹا نوالہ

مدت بعد آج قلم اٹھایا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا لکھوں۔ دل اداس ہے۔ کورونا کا بھلا ہو کیا کر دیا۔ ہم مستقل قاری کو اتنی چھٹیاں کروا دیں ورنہ میں خط لکھنے سے ناغہ کروں؟ ایسا ہو سکتا بھلا؟ اگست کا ٹائٹل بہت عمدہ رہا۔ "اداریہ" لفظ لفظ موتی۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہمیشہ ایسے ہی قائم دائم رکھے (آمین) اور حکمرانوں عوام کو ہدایت دے۔ آپ نے شمارے میں جو تبدیلیاں کی ہیں میں سو فیصد متفق ہوں۔ "مقابل ہے آئینہ"، "اقراء سرور" زبردست۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" کیا بنے گا ارسلہ کا؟ یقیناً گہری کھائی میں گرنے والی ہے۔ نادیہ اور آبص کو ضرور ملا یے گا۔ اگلی قسط کا بے تابی سے انتظار۔ (چابی کی گڑیا) عمارہ جہاں شاندار۔ دنیا مکافات عمل کا نام ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے بھی۔ جیسا سلوک تم بہو سے کر رہی تھیں ویسا ہی بیٹی کے سسرال میں

ہو رہا تھا۔ لیکن کوئی سمجھے تب ناں؟ بعض لوگ ٹھوکر کھا کے بھی نہیں سنبھلتے۔ (پریت بدلے ریت) گل ارباب کا ناولٹ اچھا لگا۔ اچھا ویسے اک راز کی بتاؤں بات؟ ہانیہ کی بھابھی جیسی بھابھی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لیکن اک بات تو طے ہے دنیا میں ابھی بہت سے اچھے لگ باقی ہیں۔ تبھی تو دنیا قائم ہے۔ لاسٹ میں اینڈ اچھا ہوا۔ زبردست۔ (عہد رفتہ) شمائلہ العباد نے پرانے زمانے کی یاد دلا دی۔ ایسا پہلے ہوتا تھا سب ہنسی خوشی ساتھ رہتے تھے اب تو ساتھ رہتے ہوئے بھی دلوں میں فاصلے ہیں۔ بہر حال تحریر اچھی لگی (کنار خواب جو) فرح بخاری آپ تو ہیں ہی گریٹ۔ تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں۔ یہ قسط شاندار رہی (اف یہ موسم) عنبرین ابدال کا ہلکا پھلکا افسانہ سبق آموز تھا۔ اولاد کو حق دینا چاہیے کہ وہ اپنی عقل کے بل بوتے فیصلہ کرے ورنہ بعد میں کوئی غلط قدم اٹھا لے تو رسوائی مقدر میں ہوگی۔ نائس عنبرین۔ (کانچ سے سائبان) مصباح علی سید آپ کا تو نام ہی کافی ہے۔ آپ کی وجہ سے کرن ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا اور آج تک ''کرن'' کی اک بھی کہانی نے بور نہیں کیا۔ دونوں اقساط پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ ان شاء اللہ (مٹن) عطیہ خالد کا افسانہ بھی سبق آموز تھا۔ ساری زندگی خدمتیں کرتے گزر گئی اور آخر میں صلہ مل ہی گیا۔ (بالوشے) تحریک پاکستان کے حالات واقعات پر مبنی منعم ملک زبردست۔ ثابت قدمی بہت اچھی بات ہے آخر کار صلہ مل ہی جاتا ہے۔ جیسے حاجرہ کو ملا۔ ویل ڈن (تیری دید میری عید) زارا ہنجرا کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ (ہوائیں رخ بدل گئیں) ربیکا کو طلاق......؟ افف......؟ اب حمزہ کی ہوا شہرینہ کی جانب جائے گی تو سر جہانداد کا کیا بنے گا؟ اب لاسٹ کر دیں جلدی سے۔ باقی پوری قسط شاندار رہی نگہت آپی بہت اچھا لکھا آپ نے۔ خوش رہیں اور اینڈ کر دیں (ہاہاہا)۔ (ڈگڈگی کا بندر) فہمیدہ فرید خان کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ ماں باپ جو بھی کر لیں اولاد پھر بھی وفا نہیں کرتی۔ پھر بھی جب خود پر وقت آتا ہے تو سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اللہ ہی ہدایت دے سب کو (آمین) افسانہ اچھا تھا سبق آموز (تیری راہ ہے میری منزل) مسکان احزم کا ناول بہت اچھا لگا۔ کبھی میں نے بھی ایف بی پر ''وائٹ سوان'' کے نام سے آئی ڈی بنائی تھی (ہاہاہا)۔ زونا شے نام بہت اچھا لگا۔ اب زونا شے گل کے نام سے بناؤں گی (ہاہاہا) شکر ہے ریان کو بھی بروقت پتا چل گیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی۔ آخر زونا شے کی محبت رنگ لے ہی آئی۔ ویل ڈن مسکان۔ (زندگی کے رنگ) حوریہ بتول واہ۔ کیا بات ہے آپ کی۔ مجھے زہر لگتے وہ مرد جو تنہائی میں محبت جتاتے ہوں اور گھر والوں کے سامنے بے عزتی۔ نائس سو نائس (کرن کرن خوشبو) سارے کا سارا لاجواب۔ (یادوں کے دریچے) ہائے میری غزل شائع ہو گئی۔ پتا نہیں کب کی لکھ کے بھیجی ہوئی تھی۔ بہر حال بہت بہت شکریہ بشریٰ محمود۔ باقی سب کی غزلیات لاجواب (کچھ موتی چنے ہیں) سارے موتی چن لیے۔ بہت اچھا سلسلہ ہے یہ اس کو ختم نہ کیا کیجیے گا۔ (نامے میرا نام) خط سب کے بہت اچھے لگے۔ ساجدہ جاوید سندیلو پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ سحر وقاص راجپوت بس کچھ نہ پوچھو میرے قلم کی سیاہی ختم نہیں ہوئی بس ڈائجسٹ بہت لیٹ ملتا تھا۔ جب ملتا تھا تب تبصرے کا ٹائم گزر جاتا تھا اور دیکھ لیں آپ نے بلایا اور میں قلم میں سیاہی ڈال کے حاضر (ہاہاہا) بہت شکریہ پیاری آپ نے یاد رکھا۔ شکیلہ سہیل حسن تبصرہ پسند کرنے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ باقی ثنا، شہزاد، ماہا، تبسم، فائزہ بھٹی، فوزیہ ثمر، ارم کمال آپی کیسی ہیں آپ سب؟ مجھے بھول تو نہیں گئیں آپ لوگ کیونکہ مارچ سے لے کر اب تک میں نے کسی بھی ڈائجسٹ میں نہیں لکھا۔ سب کو سلام اور دعائیں۔ آپ سب میرے لیے بھی دعا کیجیے گا کہ میرا PPSC کا ٹیسٹ کلیئر ہو جائے اور جاب مل جائے جو جو بھی کرن پڑھتا ہے ان سب کو سلام۔ ثناء وقاص آپی آپ کیسی ہیں اور وقاص بھائی کیسے ہیں؟ عروہ گولڈن ڈول کیا کر رہی ہے آج کل۔ میری طرف سے بہت زیادہ پیار دیجیے گا۔ اور آپ تو ہر ماہ کرن پڑھتی ہیں پھر لکھتی نہیں؟ رنگ برنگی کرن کتاب لاجواب۔ ہر چیز زبردست (کچن اور آپ) ساجدہ آپی مجھے سوجی کا حلوہ کھانا ہے کب آؤں لازمی بتایئے گا۔

ج: ماریہ جی۔ ہمیں آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ یقیناً قارئین کو بھی ہوئی ہوگی۔ خط لکھا کریں اگر دیر سے موصول ہوگا تو اگلے ماہ شائع ہو جائے گا ہمیں نہیں ہماری رائٹرز کو بھی اپنی تحریر کے بارے میں قارئین کی رائے کا انتظار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے تمام امتحانات میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔

فرحت جبین......راولپنڈی

کرن ستمبر بہت دیر سے ملا لیکن دو دن میں پڑھ کر ختم بھی کر لیا۔ خط جو لکھنا تھا۔ سلسلے وار دونوں ناولز خاصے سست رفتار ہیں ان کی رفتار بڑھائی جائے۔ ٹی وی ڈراموں کی طرح مت کھینچیں کہ بندہ بور ہو جائے۔ مکمل ناول میں ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں'' پڑھ کر مزا آیا۔ فوزیہ احسان نے شاید پہلی بار کوئی مکمل ناول لکھا ہے۔ مزید بھی لکھیں اچھا لکھ سکتی ہیں۔ ''کنار خواب جو'' بہت اچھا جا رہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا فرح جی۔ ''ہجر اثاثہ'' رہ جاتا ہے۔ قرۃ العین جی اچھا لکھا۔ لیکن نجانے کیوں کچھ ادھورا پن محسوس ہوا۔ ''کانچ سے سائبان'' اچھا جا رہا ہے۔ لیکن پلیز غیر ضروری طوالت سے اجتناب کیجیے گا کہ کہانی کا مزا خراب نہ ہو۔ کرداروں کی کڑیاں جڑ رہی ہیں۔ ''جاہل'' ناولٹ اس بار رسالے کی جان رہا۔ بہت خوب صورت مرکزی خیال اور ڈائیلاگز تو کمال تھے۔ میمونہ جی ہمیشہ چھا جاتی ہیں۔ اب کوئی قسط وار بھی لکھ دیں۔ انتظار ہے۔ افسانے اچھے تھے لیکن ''بیسن کی روٹی'' کا نام یہ کیوں تھا کہ افسانے میں 'بیسن کی روٹی' کا عمل دخل تو تھا نہیں۔ ''کہاں پر آ کر لٹے'' کا آخری جملہ مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ ''غیر ضروری سچ'' بہت اچھا موضوع تھا۔

ج: فرحت جی۔ آپ کی رائے رائٹرز تک پہنچا دی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ کہانی کو بے جا طول نہ دیا جائے۔ لیکن اگر ناول میں کردار زیادہ ہوں تو کہانی ختم ہوتے ہوتے بھی طول پکڑ لیتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس، حریم فاطمہ......گجرات

ٹائٹل سو سو ہی لگا۔ دانتوں کی وِنڈو بند ہی ٹھیک تھی۔ ''اداریہ'' سب سے پہلے پڑھا ساری باتوں بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ ساری تباہی کا نچوڑ یہی ہے کہ اسی کلے ئیں خراب۔ ہاں ناں اے تباہی اے گندگی کلے بندہ دا کام نہیں۔

عرفان کھوسٹ صاحب لیجنڈ ہیرو اللہ پاک خوشیوں سے نوازے انہیں۔ آپ ہر ماہ سینئر اداکار کے شب و روز شائع کریں۔ نئی نسل کو پتا چلنا چاہیے کہ ایویں نہیں کوئی اعلا مقام اور شہرت حاصل کر لیتا۔ اس کے لیے سخت محنت ضروری ہوتی ہے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' شکیلہ شہزادی کا کھلا کھلا رومینس وہ بھی ہونے والے شوہر نامدار سے لکھ پلے نہیں پڑا سمجھ میں نہیں آیا آپ میریڈ ہیں یا ان میریڈ کی یہ داستان سنا رہی ہیں۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' ارسلہ دبئی سے ہو آئی۔ توبہ ہے۔ بندی کتنی شودی ہے مل گیا تو شکر کرو۔ مگر ایسے لوگ اپنا ماضی بھول جاتے ہیں کہ کیا اوقات تھی۔ اگلے کو مجبور کر دیتے ہیں کہ ان جیسوں کو ان کی اوقات یاد دلائی جائے۔ مکمل ناول ہجر ''اثاثہ رہ جاتا ہے'' حیدر علی شاہ کا کردار پسند آیا۔ عرشان جیسے جنہیں غرور و تکبر میں انسانیت بھول جاتی ہے۔ ایسے لوگ وقت کے کٹہرے میں ضرور آتے ہیں۔ ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں'' فوزیہ احسان نے ہم پر بہت احسان کیا اینڈنگ نے رلایا ہی تھا۔ دادو کی یہ کس قسم سے ملاقات کروائی ہے۔ رائٹر جی۔ ثانیہ پڑھی لکھی تھی۔ اسے اتنا دبنا نہیں چاہیے تھا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ جو دوسرے کا حق چھیننا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ زونی کے اقرار محبت نے ارباز کے دل میں خلش نہیں رہنے دی کہ وہ اکیلا محبت کا مسافر نہیں تھا۔ زونی بھی اس کی ہم سفر تھی۔

اب بات ہو جائے 'کانچ سے سائباں' کی۔ تحریر کے نام سے ہی ظاہر ہے کرچیاں تو بکھری ہیں۔ شاید روابہ کے دل کی۔ روابہ کو ویسے ہی ہائم کی بات ماننی چاہیے تھی۔ اسے کا ہے کا ڈر جب اسے شوہر کی دست پرستی حاصل تھی پھر اتنی نیک پروین بہو بننے کی کیا ضرورت تھی۔ منہل اتنی ڈرپوک کیوں ہے۔ ''ہوائیں

رخ بدل گئیں'' تحریر اویں ایک ماہ آگے لے گئیں اینڈ تو سامنے نظر آرہا ہے اور ہاں غزنی کی پہلی بیوی سارہ کے تاثرات ضرور بتائیے گا اب یہ تو نہیں کہ اسے ساری عمر خبر نہیں ہوئی۔ شوہر نامدار دوسری شادی کی عیاشیاں فرما چکے ہیں اور ایک عیش ان کی گود میں بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ فرح بخاری کا ''کنار خواب جو'' چلیں جی۔ اب سوار کی گزشتہ زندگی منظر عام پر آنے لگی اور مجھے لگتا ہے کنعان کی فیملی میں بھی کوئی اشو ہے۔ ثماشہ کھلے عام دعوت محبت دے رہی ہے مگر سوار لگتا تو نہیں۔ مفت کی شراب تو ملا بھی نا چھوڑنے والا بندہ۔ شازمہ کے ساتھ وقاص نے اچھا نہیں کی اتنا سخت رویہ شازمہ کو قاص کو معاف نہیں کرنا چاہیے۔ اچھا ہوتا وقاص کی بیوی کو بتا کر آتی کہ وہ بھی وقاص کی بیوی ہے۔ مری کے اچھے مقامات کی منظر کشی اچھی لگتی ہے۔

ناولٹ 'جاہل' بھی پسند آیا ہوتے ہیں کچھ انسان ڈگریاں یافتہ جاہل جنہیں تعلیم بھی سنوار نہیں سکتی۔ ''بیسن کی روٹی'' دونوں سویٹ سے ہیرو ہیروئن چھا گئے۔ دونوں نام بھی کیوٹ۔ آیت اور سمیع اللہ۔ مجھے ایسی بہویں بہت پسند ہیں جو سسرالی گھر اور رشتوں کا مان رکھتی ہیں بے وجہ بلائیں بن کر خون نہیں چوستیں۔ چالاکو ماسی امیمہ نے آخر شوہر کو سمجھا ہی دیا ہے وہ پرفیکٹ ہی ہے۔ ''غیر ضروری سچ'' بھی اچھا میسج تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے دوسرے کے احساسات کا خیال کیے بغیر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں کہ ایسے تبصرے شریف دوسروں کے لیے کتنی ذہنی اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ ''کہاں پر آکر لٹے تھے'' تابندہ حیات زندہ باد پورے کرن میں کہیں بھی مزاح نہیں تھا۔ بس تمہارے اس جملے نے ساری ٹینشن 'ہوا دوش کر دی۔

''کیوں تیرے ماں پیووی مٹی کھاندے نے۔''

''قبول ہے'' ڈرامائی طرز کی تحریر اچھی تھی۔ سلسلے سارے اچھے تھے۔ ''کچن اور آپ'' زرتاشیہ نعمان باقی سب تو ٹھیک ہی تھا۔ یہ بریانی کو دم لانے کے کور سے نانی دادی کا زمانہ یاد دلا دیا۔ اب کہاں ایسا ہوتا ہے ایک تو کا ہلی اور پھر آٹے کے تسلے کو بریانی پر الٹا رکھو۔ اور دم لگ گیا۔

اب آتے ہیں کرن کی ''جان جاناں'' محفل ''نامے میرے نام'' کی طرف۔ پہلے تو بہت سارا شکریہ اتنے مہینوں بعد میرا بھی خط لگایا۔

پہلا خط مریم خان لگا ہے ان کی صورت میں ایک اور اچھی سی مصنفہ مل رہی ہیں پیشگی مبارک۔ سب بہنوں نے بہت اچھا لکھا۔ فائزہ بھٹی تمہارا طرز بیاں مرزا غالب سے ملتا جلتا لگتا ہے کہیں ان سے ٹیوشن نہیں لیتی رہی ہیں۔ پلیز، مائنڈ مت کرنا دل وسعت رکھنا۔ ناٹ بیڈ ہمیں یہ طرز بیاں دل وجان سے پسند ہیں اور سویٹ بھی تمہیں کرتا ہے۔ ساجدہ جاوید دونوں شعر بہت پسند آئے۔ فہمیدہ جاوید سے میں بھی متفق ہوں۔ کہ ایسا سلسلہ ہونا چاہیے ہم اپنے لیجنڈ ہیرو کو تو بھول ہی چکے ہیں۔ وحید مراد۔ محمد علی...... ایسا کوئی سلسلہ کرن کو اور خوب صورت بنا دے گا۔ ''مقابل ہے آئینہ'' تھوڑے سے سوالوں کی تبدیلی کے ساتھ یہ سلسلہ ابھی چلنا چاہیے۔ اور جیسے پہلے بھی کہانی سے پہلے رائٹر کا تعارف شائع ہوتا تھا یا تحریر کے بارے میں رائٹر کے ذاتی کمنٹس ایسا بھی ہونا چاہیے۔ اقرا ممتاز بہن یہ آخری خط سے مراد وضاحت کر دینی تھی، ہمیں تشویش لگ گئی۔ مطلب مجھے بھی آخری ایڈوانس ہیپی برتھ ڈے، فائزہ بھٹی اور ماریہ نذیر کو بھی۔ اللہ کیا ماجرا ہے ہمیں کس مشکل میں ڈال کے جا رہے ہو، کہیں عالم بالا سے شاپنگ کا دل تو نہیں کر لیا۔

فوزیہ جی: آپ پھر سے اس محفل میں شریک ہونے لگیں ہمیں بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہماری سب قاری بہنوں کو چین وسکون اور خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

وشمہ جمال...... بھٹی ٹاؤن

منعم ملک کا مکمل ناول ''بالوشے'' پڑھا قیام پاکستان پر لکھی ہوئی کہانی اس موضوع پر خود بخود دل چاہتا ہے پڑھنے کو۔ کیونکہ منعم ملک نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ''فرح بخاری'' منظر نگاری بہت اچھی کرتی ہیں کہ بندہ اس میں کھو جاتا ہے اس کے بعد ''مصباح علی

سید'' کا ناولٹ ایک لمبے عرصے بعد دیکھا۔ اس میں ہائم کا کردار بہت مضبوط ہو جائے گا اور ردابہ اور ہائم کا کھیل مجھے اچھا لگا۔ پلیز مصباح جی ان کے کپل کا ہیپی اینڈ کرنا۔ اگلی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے اور مصباح نے اس میں کوئی آفس کا ذکر کیا ہے لگ رہا ہے کہ کہانی کہیں نہ کہیں کسی آفس کے گرد گھوم رہی ہے جسے انہوں نے کسی چھپے ہوئے انداز میں ہائی لائٹ کیا ہے۔ عطیہ خالد نے ''متن'' کے عنوان سے بہت اچھا لکھا۔ زارا ابجز ا کا افسانہ ''تیری دید میری عید بھی اچھا لگا۔ عمارہ جہاں کا افسانہ ''چابی کی گڑیا'' واقعی ہم بیٹیوں کو بہت نازوں سے پالتے ہیں۔ لیکن ہماری بہوئیں بھی کسی کے گھر سے نازوں میں پلی آتی ہیں۔ لیکن ہم انہیں چابی کی گڑیا سمجھتے ہیں۔ سلسلے وار ناول دونوں ہی اچھی جا رہے ہیں۔ مستقل سلسلے سارے ہی اچھے ہیں۔ فہمیدہ فریاد خان کی ''ڈگڈگی کا بندر'' کا میں بہت اچھا سبق موجود ہے کہ والدین ساری زندگی اولاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں لیکن جب بڑھاپے میں ان کی خدمت کا وقت آتا ہے تو انہیں وہ عزت واحترام نہیں دیا جاتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ مسکان احزم کا ناولٹ ''تیری راہ میری منزل'' میں رائٹر نے ہمیں گھر بیٹھے ہی ماسکو کی سیر کروا دی۔

ج: وشمہ جی۔ آپ کو اگست کا کرن ''پسند آیا'' اس کے لیے ہم آپ کے بہت مشکور ہیں۔

ثناء شہزاد......کراچی

ستمبر کا شمارہ 17 تاریخ کو ملا۔ کرن کی محفل میں تین مہینے بعد حاضری دے رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ آپ لوگ مجھ ناچیز کو بھولیں میں اپنی یاد دلانے آگئی ہوں۔ چلیں جی اب تبصرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ سرورق بس ٹھیک ہی لگا زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں شکیلہ سہیل کے جوابات بہت پسند آئے۔ آسیہ مرزا کا ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ ارسلہ بے وقوف صرف دولت کی چکا چوند میں اندھی ہو گئی ہے اس کے علاوہ اسے اور کسی چیز کی چاہ نہیں اور یہ کیا آب بس تم اتنی جلدی نادیہ کو بھول کر ارسلہ کی خوبصورتی میں کھو گئے تم اس لڑکی کو اپنے دکھ درد میں شامل کر رہے ہو جس کے نزدیک تم کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کا اب بلاوجہ کھینچا جا رہا ہے اس کی آخری قسط آنے والی تھی مگر ابھی تک نہیں آئی۔ شہرینہ کو جہانداد کا نہیں کریں گی ہماری رائٹر صاحبہ کیونکہ حمزہ نے ربیکا کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے شہرینہ کا حمزہ ہی رہے گا۔ عائشہ تنویر کا افسانہ ''قبول ہے'' پسند آیا۔ بالآخر حرا نے اتنے سال بعد عاقب کا پرپوزل قبول کر ہی لیا، ماہ رخ نے بہت اچھا کیا دونوں کو ملوا دیا۔

فوزیہ احسان کی تحریر اپنے نام کی طرح بہت اچھی تھی۔ ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں'' زونی اپنے ماں باپ کی زندگی کو دیکھ کر محبت کے وجود سے انکاری تھی اور آخر میں ارباز کی محبت نے اس کے دل میں محبت کا احساس اجاگر کر دیا لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ زونی ارباز کو ہی ملتی ویسے کہانی بہت پسند آئی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ قرۃ العین سکندر جب بھی لکھتی ہیں بہت ہی زبردست لکھتی ہیں۔ ان کے قلم میں ایسی روانی ہے جو پڑھنے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔ ''ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے'' جتنا پیارا نام اس سے زیادہ پیاری کہانی۔ اریبہ اور سنبل کا کردار بہت اچھا لگا اریبہ نے اپنے باپ کے اوپر لگائے جھوٹے الزام کو دھویا اور سنبل نے اپنے باپ کے خواب کو پورا کیا۔ حیدر نے سنبل کی محبت میں خود کو روگ لگایا اور عرشان اریبہ کی محبت میں ایک مرد ہو کر رو دیا۔ ویل ڈن قرۃ العین آپی۔ اتنا شاندار ناول لکھنے پر آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ ''دو اور دو پانچ'' مریم شہزاد نے کمال کا لکھا امیمہ نے ناصر کو خوب اچھا سبق سکھایا۔ ناصر کو ہر چیز میں پرفیکٹ بیوی مل گئی تھی اسے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ مصباح علی کی کہانیاں جب بھی پڑھتی ہوں تعریف کے لیے مجھے شایان شان الفاظ نہیں ملتے جو ان کی تحریروں کا حق ادا کر سکیں۔ کانچ سے سائبان پر ابھی تبصرہ محفوظ ہے۔ صبا بہار کی تحریر تو بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ ''بالٹی''

میں کتنا گہرا سبق پوشیدہ تھا۔ جو لڑکیاں ان چھوٹی چھوٹی بے جان چیزوں کے پیچھے اپنے اتنے قیمتی رشتے کھو دیتی ہیں وہ اس کہانی سے سبق ضرور سیکھیں۔ چیزیں استعمال کے لیے ہوتی ہیں جب کے رشتے سنبھال کے رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔

''کنار خواب جو'' فرح بخاری کے ناول کی پانچویں قسط بھی بہت پسند آئی اتنی اچھی اچھی جگہوں کی ہم گھر بیٹھے سیر کر لیتے ہیں۔ صدف آصف لکھیں اور وہ اچھا نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ''بیسن کی روٹی'' بالکل منفرد نام اور الگ کہانی۔ سمیع نے آیت کو اپنی زندگی میں شامل کر کے بالکل درست فیصلہ کیا۔ میمونہ صدف کا ناولٹ ''جاہل'' بہت پسند آیا۔ ذکریا جیسے مرد تو نایاب ہوتے ہیں جو ہر کسی کی قسمت میں نہیں ہوتے ارفع خوش نصیب تھی جو ذکریا جیسا ساتھی اسے ملا۔ شافی جیسے گھمنڈی اور مغرور لوگ بھی اس دنیا میں بستے ہیں۔ اس کہانی نے ایک بات سمجھا دی کے پڑھے لکھے جاہل انسان سے ان پڑھ بھلے۔ ارفع کو ذکریا تک آنا تھا تو شافی کو راستہ بنایا جب کے منزل صرف ذکریا تھا۔

''غیر ضروری سچ'' ام اقصیٰ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ہم لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ آج ہم کسی کو کہیں گے کل کو وہ ہی سب ہمیں بھی سننا پڑے گا۔ لوگوں نے یہ وطیرہ بنا لیا ہے۔ تابندہ حیات کا افسانہ کہاں پہ آ کر لٹے بس سو سو تھا۔ مستقل سلسلے سب اچھے تھے۔

''نامے میرے نام'' یہ واحد سلسلہ ہے جو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس سلسلے کی بدولت مجھے اتنی پیاری پیاری دوستیں مل گئی ہیں۔ زاہدہ جی ہماری دعا ہے اللہ پاک آپ کو جلد اولاد کی نعمت سے نوازیں۔ فائزہ جی جب اللہ پاک کا حکم ہوگا ہم آپ سے ملنے آجائیں گے۔ ساجدہ جی میں اپنی پریشانیوں میں کہانی ڈھونڈنا بھول گئی ڈیئر۔ حورالعین جی آپ کے دکھ پر ہمارا بھی دل رو دیا۔ اللہ پاک مرحومین کی مغفرت کریں۔ آمین۔ اقرا جی آپ نے یاد کیا ہم آ گئے۔ فوزیہ ثمر جی آپ کو میں نے بہت یاد کیا آپ کا تبصرہ تو کرن کی رونق ہے۔ اور دس اکتوبر کو آپ کی سالگرہ ہے ہماری طرف سے جنم دن بہت بہت مبارک ہو پیاری۔ عابدہ جی آپ کو ہمارا خط اچھا لگتا۔ ہے بہت شکریہ پیاری۔ دعا جی شعر پسند کرنے کا شکریہ۔

☆ ثناء جی! آپ نے کافی مہینوں بعد ''نامے میرے نام'' کی محفل میں شرکت کی ہے۔ آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ ہمیں ضرور بتایئے گا کہ کرن میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں، وہ آپ کو کیسی لگیں۔

حمیرا عثمانی...... جھاوریاں

سب سے پہلے تو ایک شکوہ کروں گی بہن یہ کرن ہی آخر اتنا لیٹ کیوں آتا ہے میں نے پانچ رسالے لگائے ہوئے ہیں ان میں سب سے آخری رخ روشن کرن کا ہوتا ہے۔ لو بتاؤ بھلا۔ مہینے کی 23 تاریخ کو ملا ظلم سا ظلم رسالہ حسب حال بہترین اور مکمل پیکج تھا سب سے پہلے قسطیں پڑھیں جنھوں نے بے قرار کر رکھا تھا۔

بھئی پلیز اب نگہت عبداللہ سے کہیں ہواؤں نے بہت رخ بدل لیے پلیز تھمنا سکھا دیں۔ آسیہ کا ناول ایسے ہے جیسے کوئی ڈرامہ آنکھوں کے سامنے چل رہا ہو سبک رفتاری مگر تسلسل ''کنارے خواب جو'' ہائے کنعان پر رہ رہ کر ترس آتا ہے۔ فرح بخاری سے کہیں اس کے ساتھ کچھ اچھا کیجیے۔ ''کانچ سے سائباں'' مصباح علی سید کا قلم ہو اور دل نہ چیر دے ایک بات بتائیں مجھے کیا آپ کی طرف سے سختی سے آرڈر ہوتا ہے قسط وہاں ختم کرنی ہے جہاں قاری نہ گھر کا رہے نہ گھاٹ ''کانچ سے سائباں'' قسط وہاں روکی جہاں سے دس راستے نکال رہی تھی۔ شاید یہ ہو...... شاید وہ ہو جائے۔ فرح بخاری بھی ایسے ہی روکتی ہیں حد نہیں ہوگئی۔ اب ہم آپ سے نہیں بولتے ہوں تو امتحان نہ لو ہم غریب ریڈرز کا۔ میمونہ صدف میری ہارٹ فیورٹ ان کی سبق آمیز تحریریں ہمیشہ دل کو چھوتی ہیں ایک فرمائش ہے ڈرامہ سیریل زیبائش کی ٹیم کا انٹرویو تو لیں اور پوچھیں تمہیں کیا پڑی تھی کنبے کا تماشا لگانے کی

ہاہاہا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح مزے دار۔

☆ حمیرا جی! انتظار کے بعد جو ملے اس کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بس ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ انتظار کے بعد ''کرن'' آپ کی امیدوں پر پورا اترے۔ ہم اپنے قارئین کے تہ دل سے مشکور ہیں کہ دیر سے ملنے کے باوجود وہ فوراً اسے پڑھ کر ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں۔

ردا عاطف...... پنڈی بھٹیاں

رسالے تو عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں لیکن کبھی اتفاق نہیں ہوا خط لکھنے کا وہ تو میری کولیگ نے بتایا کہ وہ بہت سہولت سے خط لکھ کر سینڈ کرتی ہیں تو مجھے بھی تجسس ہوا کہ ہم بھی قاری ہیں ہمارا بھی حق ہے صفحات پر۔ اب دیکھیں جگہ ملتی ہے کہ نہیں۔ بہر حال آپ بے شک جگہ نہ دیں لیکن مجھے اپنی رائے دینی تھی بطور خاص یہ خط مصباح علی سید کے لیے لکھا ایک تو وہ بہت دیر سے واپس آئیں خوش آمدید دوسرے پوچھنا تھا کیا اب ایسے ہی شاذ و نادر پڑھنے کو ملیں گی۔ مطلب پہلے تو وہ بہت مستقل تقریباً تینوں رسالوں میں حاضر رہتی تھیں بہر حال ان کی تحریر ''کانچ سے سائباں'' رواں انداز میں کوئی بڑا دھماکا چھپائے ہوئے لگ رہی ہے۔ ہائم اپنے نام کی طرح بہت اپنا اپنا لگا اور ردابہ بہت معصوم۔ پتا نہیں مصباح ان کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہی ہیں کیوں کہ ماضی اور حال اکٹھے چل رہا ہے دل مٹھی میں کہ ایسا کیا ہوا کہ ہائم حال میں ردابہ کے ساتھ کیوں نہیں۔ پلیز جدامت کیجیے گا۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' یہ تو اب انڈین سوپ سا بن گیا ہے اتنے کردار اور سب کو یاد رکھنا رشتوں میں رشتے پھنس جانا یہ بھئی نگہت عبداللہ کا ہی کام ہے جو گتھی کو سلجھا رہی ہیں۔ اس ماہ کے افسانے مجھے سارے اچھے لگے خاص طور پر یہ عائشہ تنویر آج کل کافی اچھا لکھ رہی ہیں۔ اپنے لفظوں سے دل جیتتی رہیں پیاری۔ اس ماہ کا انتخاب زبردست تھا۔

☆ ردا جی! بے شک ''کرن'' کی کامیابی میں ہماری رائٹرز کا بڑا ہاتھ ہے، جو بڑی محنت سے کہانیاں لکھتی ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ساتھ ان کے بھی بہت مشکور ہیں۔ مصباح سے جو آپ کو شکایت ہے، اس کا جواب تو مصباح ہی دے سکتی ہیں۔

صائمہ ہاشمی...... سلانوالی

کبھی خواتین میں بہت خط لکھے، فون کر کے اپنی رائے دیتی تھی لیکن پھر زندگی اپنی ڈگر پر لے چلتی ہے۔ اب تو بندر کی ڈگڈگی کا ناچ چل رہا ہے۔ اوپر سے ایسی نشے میں دھت سرکار کچھ کہو نہ کہو برابر ڈھٹائی ہے۔ اب آتے ہیں ڈائجسٹ کی طرف تو سارے خاندان میں سفر کرنے کے بعد آخر رسالہ مجھ تک پہنچا اندازہ لگالیں مجھ میں کتنا صبر ہے۔ ویسے میں نے سب سے پہلے ''کانچ سے سائباں'' کی قسط پڑھی۔ بڑی ہی مشکل جگہ روکی تھی کہ یہ لڑکا کون ہے کہانی اتنی رواں ہے کہ جب لاسٹ لائن پڑھی کون سی فائل۔ لو جی باقی آئندہ بڑا ہی غصہ آیا مجھے لگتا ہے کوئی بہت ہی چھاپا کٹنی جیسی فائل ہوگی مطلب اس کا ذکر آہستہ آہستہ مسلسل آرہا ہے کچھ تو ہے بھیا۔ خط لکھنے کی اہم ترین وجہ میمونہ صدف ہیں۔ کیا بات ہے ان کی کہانیوں کی اور اب تو ماشاءاللہ سے مسلسل کہیں نہ کہیں لکھ کر ہم جیسے دیوانوں کو قرار دے رہی ہیں ان کے ٹاپک بہت مختلف اور گھر کے قانون پر لاگو ہوتے ہیں۔ اگلی تحریر کا شدت سے انتظار ہے۔

☆ صائمہ جی! آپ نے خط لکھا ہم آپ کے مشکور ہیں لیکن آپ کا تبصرہ بڑا مختصر ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ہمیں آپ ''کرن'' کی تمام کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔

رانیہ یونس...... خیبر پختون خواہ

ج: رانیہ یونس جی! آپ نے ''کرن'' کی کہانیوں پر تو تبصرہ نہیں کیا اور اس میں شائع کرنے والی کوئی خاص بات نہیں تھی، اس لیے خط شائع نہیں کر رہے۔ آپ نے اپنی کہانی کے بارے میں پوچھا ہے۔ وہ ہمیں موصول نہیں ہوئی۔ آپ کہانی بھیجیں اگر اشاعت کے قابل ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

☆☆


کرن کتاب

ایشیائی خواتین کا سیکرٹ

چاول کا پانی

دنیا کے ہر ملک کی عرصہ دراز سے اپنی اپنی ثقافت اور روایات چلی آ رہی ہیں۔ پوری دنیا میں ایک نکتے پر تمام ہی لوگوں کا خصوصاً خواتین کا اتفاق ہے اور وہ ہے ''خوب صورتی۔''

دنیا بھر کی خواتین خوب صورتی میں اضافہ کے لیے زمانہ قدیم سے ٹوٹکوں کا سہارا لیتی آ رہی ہیں۔ قومیں خوب صورتی کے راز کو اپنی نسلوں کو بھی منتقل کرتی رہتی ہیں۔

ایشیائی خواتین اپنی بے داغ اور چمک دار جلد، ریشمی بالوں اور سلم اسمارٹ جسامت کے لیے مشہور ہیں۔ اگر آپ نے غور کیا ہو تو ایشیائی ممالک مثلاً چین، جاپان اور کوریا وغیرہ کی خواتین کی جلد صاف شفاف اور ہمیشہ چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ آج کی بات نہیں بلکہ صدیوں سے چین میں خواتین اپنی جلد اور مجموعی حسن کا اچھی طرح خیال رکھتی آئی ہیں لیکن سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ ایسا کیا کرتی ہیں جو ان کا چہرہ اتنا صاف اور چمکتا دمکتا رہتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چین کی عورتیں نت نئی مصنوعات کے بجائے کچھ قدیم ٹوٹکوں پر عمل کرتی ہیں۔ ان ٹوٹکوں اور نسخوں میں سب سے زیادہ جس غذائی جز کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ جز ہے ''چاول کا پانی''

چاول کے پانی میں بہت زیادہ مقدار میں وٹامنز آپ کی جلد کو خوب صورت بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

چال کا پانی بنانے کا طریقہ:۔

آدھا کپ چاول کو دو کپ پانی میں بھگو دیں۔ رات بھر بھیگا رہنے دیں اور اس کے چاولوں کو چھان کر پانی علیحدہ کر لیں۔ اس پانی کو خمیر کرنے کے لیے کمرے کے درجہ حرارت پر چھوڑ دیں۔ گرم اور مرطوب آب و ہوا اس پانی کو جلد ہی خمیر کر دے گی۔ یہاں تک کہ پانی دو سے تین دن میں گاڑھا ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس پانی میں ایک کپ سادہ پانی شامل کریں اور اس کو کسی ٹھنڈی جگہ یا فریج میں رکھ دیں۔

چاول کے پانی کے فوائد:۔

روئی کے گولے بنا کر اسے چاول کے پانی میں بھگو کر کلینزنگ کر سکتے ہیں۔ چینی خواتین بھی چاول کے پانی کا استعمال قدرتی ٹونر کے طور پر کرتی ہیں جس سے ان کی جلد نکھر جاتی ہے۔

☆ خون کے بہاؤ کو بہتر کرنے کے لیے دو منٹ چاول کے پانی کے ساتھ جلد پر مساج کریں اور اس کے بعد جلد کو ہوا میں خشک ہونے دیں تاکہ تمام اجزا آپ کی جلد میں جذب ہو جائیں۔ اسے آپ قدرتی موئسچرائزر کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔

☆ یہ پانی چہرے کے پورز کو بدن کرتا ہے اور چہرے کی چمک کو بڑھاتا ہے۔

☆ آپ اگر اسے ماسک کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ایک سوتی کپڑے کا ٹکڑا لیں، اسے چاول کے پانی میں بھگو کر چہرے پر رکھ لیں۔ ایک منٹ بعد اپنے چہرے پر سے ہٹا لیں۔

☆ آپ چاول کے پانی کو فیس واش کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ روزانہ چاول کے پانی سے منہ دھو لیں تاکہ چہرے سے کیل مہاسے، داغ دھبے ختم ہو جائیں۔ جلد بھی نرم و ملائم اور چمک دار ہو گی۔

☆ روز رات کو سونے سے پہلے روئی کے گولے سے چاول کا پانی آنکھوں کے آس پاس لگائیں، کچھ ہی دنوں میں سیاہ دائرے دور ہو جائیں گے۔

☆ اپنے سر کی جڑوں میں آہستہ آہستہ چاولوں کا پانی ڈالیں اور جڑوں کا مساج کریں۔ بالوں کے سروں کو آپ اس پانی میں ڈپ کر سکتی ہیں۔ تیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ ہفتہ میں دو مرتبہ استعمال کریں۔ یہ عمل آپ کے بالوں کو تیزی سے بڑھنے میں معاون ہو گا۔

☆ چاول کا پانی بہت اچھا ہیئر کنڈیشنر ہے۔ چاول کے پانی کو بالوں میں شیمپو کرنے کے بعد کنڈیشنر کی طرح استعمال کریں۔ اس سے بال جھڑنے کے مسئلے سے چھٹکارا ملے گا اور بال نرم اور ریشمی ہوں گے۔

فیشن

میرا ہیئر اسٹائل



لڑکیاں عموماً نت نئے ہیئر اسٹائلز کی جستجو میں رہتی ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ بال سنوارنے کے زیادہ سے زیادہ ایسے طریقے سیکھ لیں جو نہ صرف خوشنما ہوں بلکہ انہیں بنانا بھی آسان ہو۔ بالخصوص گرمی کے موسم میں بیشتر لڑکیاں بال کھولنے کے بجائے مختلف ہیئر اسٹائلز ضرور آزماتی ہیں کیونکہ بال بندھے ہونے کی صورت میں گرمی نسبتاً کم لگتی ہے۔ آج آپ کے لیے ایک ایسا پرکشش، سادہ اور آسان انداز پیش ہے جسے آپ یقیناً آزمانا چاہیں گی۔

یہ خوب صورت اسٹائل بنانے سے پہلے بالوں کو شیمپو کرکے قدرتی ہوا میں خشک کرلیں۔ اس اسٹائل کے لیے بالوں کو بلوڈرائی یا اسٹریٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ گویا یہ ہیئر اسٹائل اپنانے کے لیے آپ کو کسی ہیٹ اسٹائلنگ ٹول کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اس طرح آپ کے بال تپش کے نقصان دہ اثرات برداشت کرنے سے بچے رہیں گے۔

1۔ سب سے پہلے اپنے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کرلیں۔ اس کے بعد گردن کے اوپر درمیانی حصے کے بالوں کو پونی ٹیل کی صورت میں ایک ربر بینڈ سے باندھ لیں۔ جبکہ دونوں اطراف میں چھوڑے گئے بالوں کو چوٹیوں کی صورت میں گوندھ لیں۔

2۔ اب سائیڈ میں بنائی گئی دونوں چوٹیوں کو پونی کے گرد ایک بل دے کر ہیئر پنز کی مدد سے سیٹ کرلیں۔

3۔ تیسرے مرحلے میں پونی ٹیل کے بالوں کو اطراف میں گوندھی گئی چوٹیوں سمیت دو بل والی ڈھیلی چوٹی کی صورت میں باندھ لیں۔

4۔ اب دو بل والی ڈھیلی چوٹی کو ایک ڈھیلے ڈھالے جُوڑے کی شکل میں باندھ لیں جسے انگریزی میں ''میسی بن'' (Messy Bun) کہا جاتا ہے۔ اس جُوڑے کو پنز کی مدد سے سیٹ کرلیں۔

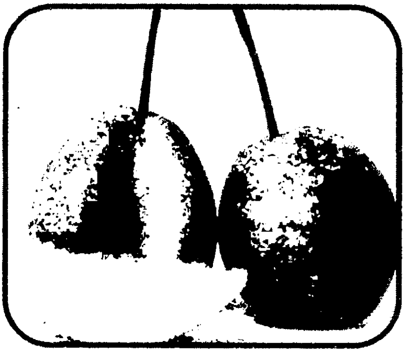


اس ماہ کا پھل

روزانہ صرف ایک ناشپاتی

ویسے تو کہا جاتا ہے کہ ایک سیب روزانہ ڈاکٹر کو دور رکھتا ہے مگر ایک ناشپاتی کو روز کھانا بھی مختلف امراض سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

کون ہوگا جسے اس گرم موسم میں رسیلی اور ذائقے دار ناشپاتی پسند نہ آئے؟ کیونکہ یہ پھل جسم کو ٹھنڈک فراہم کرتا ہے۔ یہ پھل مجموعی صحت کے لیے زبردست ہے۔ جس کی وجہ اس میں فائبر، اہم غذائی اجزا اور منرلز کا موجود ہونا ہے اور صرف ایک ناشپاتی روزانہ کھانا ہی صحت کو بہت زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے کافی ہے۔



☆ **جسمانی خلیات کا تحفظ:** ناشپاتی میں وٹامن سی، وٹامن کے اور کاپر موجود ہوتے ہیں جو جسم میں گردش کرنے والے فری ریڈیکلز سے لڑتے ہیں جو جسمانی خلیات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

☆ **امراض قلب اور فالج سے بچانے میں مددگار:** ناشپاتی میں موجود فائبر جسم میں کولیسٹرول کی سطح میں کمی لاتا ہے جس سے امراض قلب سے بچنے میں مدد ملتی ہے اور فالج کا خطرہ پچاس فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔

☆ **کینسر کی روک تھام:** ناشپاتی میں فائبر کی موجودگی آنتوں کے کینسر کا باعث بننے والے خلیات کی روک تھام کر کے اس مرض سے بچاتا ہے جبکہ روزانہ ایک ناشپاتی کھانا چالیس سال سے زائد عمر کی خواتین میں بریسٹ کینسر کا خطرہ چونتیس فیصد تک کم کر دیتا ہے۔

☆ **جسمانی مدافعتی نظام مضبوط بنائے:** اس میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس جسمانی مدافعتی نظام کو مضبوط بنانے کا کام کرتے ہیں، جس سے عام موسمی بیماریوں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ **ہڈیوں کے بھربھرے پن کا خطرہ کم کرے:** ناشپاتی ایسا پھل ہے جو ہڈیوں کی صحت کے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ یہ کیلشیم کو آسانی سے جذب کرنے میں مدد دیتا ہے۔

☆ **جسمانی توانائی بڑھائے:** ناشپاتی میں موجود گلوکوز فوری جسمانی توانائی فراہم کرنے والا جز ہے، یہ گلوکوز بہت تیزی سے جسم میں جذب ہوجاتا ہے اور جسمانی توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

☆ **نظام ہاضمہ کے لیے بہترین:** ایک درمیان ناشپاتی روزانہ درکار فائبر کا بیس سے پچیس فیصد حصہ فراہم کرتی ہے۔ یہ فائبر حل نہیں ہوتا تو آنتوں سے بہت آسانی سے گزر جاتا ہے۔ اس طرح فائبر کے باعث یہ نظام ہاضمہ کو بہتر کرنے میں مدد دیتا ہے۔

☆ **بلڈ پریشر کو قابو میں رکھے:** اس پھل میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس اور دیگر اجزاء بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

☆ **گلے کی تکلیف کے لیے بہترین:** اس پھل کا استعمال گرم موسم میں گلے کی خراش اور دیگر مسائل سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

☆ **جھریوں سے تحفظ:** وٹامن سی، وٹامن کے اور کاپر سے بھرپور یہ پھل فری ریڈیکلز سے لڑتے ہیں اور جلد کے خلیات کو نقصان سے بچاتے ہیں۔ جس سے جلد کو ہموار رکھنے اور جھریوں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ **حاملہ خواتین کے لیے مفید:** فولک ایسڈ حاملہ خواتین کے لیے بہت اہم ہے تاکہ بچے پیدائشی معذوری سے بچ سکیں۔ ناشپاتی میں بھی فولک ایسڈ موجود ہے اور دوران حمل اس کا استعمال مفید ثابت ہوتا ہے۔

لیکوریا

نسوانیت کا دشمن

سیلان رحم یا لیکوریا کوئی بیماری نہیں بلکہ کئی بیماریوں کا بطور نتیجہ اور ساتھ ساتھ یہ کئی نئے ہونے والے انفیکشن اور بیماریوں کی وجوہات ہوسکتی ہے۔ یہ ڈسچارج ہونے والا مادہ سفید اور بدبو کے بغیر ہو تو نارمل سی بات ہے لیکن یہ گاڑھا اور بدبو دار ہو تو لیکوریا ہے۔

علامات: اس کی علامات ہر خاتون میں مختلف ہوسکتی ہیں لیکن بعض میں ایک ساتھ کئی علامات بھی ہوسکتی ہیں جو یہ ہیں۔ پنڈلیوں اور ریڑھ کی ہڈی میں درد، پیٹ کے حصے میں بھاری پن، سستی اور کاہلی، خارش، قبض، بار بار سر درد، عمل انہضام کے مسائل، چڑچڑاپن، آنکھوں کے نیچے، جلد پر کالے پیچز عام علامات ہیں۔

وجوہات: خون کی کمی، پریشانی، صدمہ، حسد ورقابت، بدہضمی، خوف اور قبض کی وجہ سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ بہت سی خواتین ڈلیوری کے بعد اس مرض کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اس طرح کے معاملات یوائرین انفیکشن کی نشان دہی کرتے ہیں۔

گھریلو علاج: اکثر خواتین اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود زیادہ تر خواتین اپنا یہ مسئلہ ڈاکٹروں کو بھی بتانے سے گریز کرتی ہیں جس کی وجہ سے یہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ہم کچھ گھریلو ٹوٹکے بیان کررہے ہیں کہ جو خواتین ڈاکٹر کے پاس جانے سے ہچکچاتی ہیں اس سے استفادہ حاصل کرسکیں۔

☆ کیلا اس مرض میں مفید ہے۔ کیلا کھا کر دودھ میں شہد ملا کر پئیں۔ یا ایک کیلے پر چند قطرے اصلی گھی یا صندل کی لکڑی کا تیل لگا کر صبح و شام دس دن تک استعمال کرسکتی ہیں۔ اگر یہ بھی مشکل ہو تو صرف دو کیلے اور تین چمچے شہد ملا کر کھالیں۔

☆ بھنے ہوئے چنے، مصری یا گڑ، تھوڑا سا چند یا گوند اور چند دانے چھوٹی الائچی باریک پیس کر شیشے کی بوتل میں رکھ لیں اور ایک چمچہ صبح اور ایک چمچہ سونے سے پہلے کھالیں۔ مرض کی شدت میں دو چمچے کھاسکتی ہیں۔

☆ چار گلاس پانی میں دو سے تین چائے کے چمچے میتھی دانہ ڈال کر آدھے گھنٹے تک پکا کر چھان کر پی لیں۔

☆ رات میں ایک گلاس پانی میں ایک چمچہ ثابت دھنیا بھگودیں اور صبح خالی پیٹ پی لیں۔ بہترین نتائج کے لیے ایک ہفتہ تک استعمال کریں۔

☆ زیرہ بھون کر اگر خالی نہ کھایا جاسکے تو تھوڑی سی چینی ملا کر کھالیں۔

☆ تلسی کے پتوں کا رس اور شہد ہم وزن ملا کر صبح وشام پینے سے فائدہ ہوتا ہے، اگر شہد نہ ہو تو مصری لے سکتے ہیں۔

☆ دس گرام سونٹھ ایک گلاس پانی میں ڈال کر اتنا پکالیں کہ ایک چوتھائی پانی رہ جائے۔ چھان کر پی لیں۔ تین ہفتہ تک استعمال کریں۔

☆ روزانہ ایک کپ پانی میں آدھا کپ چاول بھگودیں۔ پانی چھان کر ایک چمچہ مونگ کا پاؤڈر حل کرکے روزانہ ایک بار پی لیں۔

☆ تلسی کے ایک چمچہ رس میں دو چٹکی پسا ہوا زیرہ ملا کر صبح وشام استعمال کریں۔

☆ ایک ایک چٹکی پسی ہوئی پھٹکری صبح، دوپہر، شام کو پانی کے ساتھ لیں۔

☆ نیم کی تین سے چار عدد نمبولیاں لے کر صبح نہار منہ کھائیں۔

☆ چھوٹی کشمش کے اکیس دانے روزانہ صبح کے وقت کھائیں۔ ناشتے سے پہلے یا بعد میں کسی وقت بھی کھاسکتے ہیں۔ اکتالیس دن ضرور کریں۔

لیکوریا خواتین کی عمر کے کسی بھی حصے میں متاثر کرسکتا ہے اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو یہ خواتین میں بانجھ پن اور ہڈیوں کی کمزوری جیسے مسائل کا باعث بنتا ہے۔

نفسیاتی اور معاشرتی مسائل

دل جیتیں اور خود کو فاتح ثابت کریں

اگر آپ اپنے موجودہ ماحول میں سب سے منفرد رہنا چاہتے ہیں اور لوگوں میں اپنی شخصیت کا مثبت اثر ڈالنا چاہتے ہیں تو پھر اس کے لیے آپ کو اپنا رویہ بہتر بنانا ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ آپ کا موجودہ رویہ خراب ہے لیکن ہمارا مطلب یہ ہے کہ بہتر چیز میں بھی بہتری ممکن ہے تو پھر کیوں نہ ہم اپنے انداز گفتگو اور دوسری تمام عادات جو کہ رویے کے زمرے میں آتی ہیں۔ انہیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے اپنی شخصیت کا بغور جائزہ لیں، کہیں آپ ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں جو گلاس کو آدھا بھرا ہوا سمجھ کر صبر و شکر کرنے کے بجائے آدھا خالی جان کر افسوس کرتے ہیں۔ اپنے انتہائی جذبات کو پوشیدہ رکھنا سیکھیں اور اگر آپ ایسا کرنے میں کامیاب ہیں تو پھر سمجھ لیں کہ آپ کی شخصیت اور آپ کا رویہ آپ کے مقابل پر بہتر اثرات مرتب کرسکتا ہے۔

خوب صورت مسکراہٹ:۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف مزاج رکھتے ہیں لیکن یہاں ہم ان تمام اقسام کے افراد کے لیے ایک ہی دوا تشخیص کررہے ہیں اور یہ دوا ہے ہنسی یا مسکراہٹ۔ کہتے ہیں کہ مسکراہٹ انسان کے چہرے کی قدر و قیمت میں اضافہ کردیتی ہے اور کبھی کبھی آپ کو ماحول میں لطافت پیدا کرنے کے لیے اچھے سینس آف ہومر کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ واقعی اس طرح کرنے سے ماحول میں ایک چمتکار سا ہوتا ہے اور چند لمحے قبل والا بے لطف ماحول یک دم سے زعفران زار بن جاتا ہے۔ مسکراہٹ کی اشد ضرورت ہے اس وقت سب سے زیادہ ہوتی ہے کہ جب آپ کا موڈ بے حد خراب ہوتا ہے۔

مشہور نفسیات دان مس یونیکا کہتی ہیں۔ ''اگر آپ ہنستے ہیں تو آپ کے ساتھ دنیا ہنستی ہے اور اگر آپ روتے ہیں تو آپ اکیلے روتے ہیں۔'' ایسی صورت میں یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس چیز کا انتخاب کرتے ہیں۔

وقت کی اہمیت: اگر آپ خود سے اس بات کی ضرورت محسوس کررہے ہیں کہ آپ اپنے رویے میں بہتری لانا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا اخلاق قدرے بہتر ہے اور آپ اپنی ہی شخصیت کے اندر موجود خامیوں کو تلاش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جو کہ بلاشبہ ایک بے حد مشکل کام ہے۔ وقت کی اہمیت سے کون ذی ہوش انکار کرسکتا ہے؟ آپ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اس وقت تک اپنی ذات سے خوش نہیں رکھ سکتے جب تک آپ انہیں مناسب وقت نہ دیں۔ چنانچہ آج ہی سے اس بات کا ارادہ کرلیں کہ اپنے پرانے دوستوں، فیملی ممبران اور دوسرے آفس کولیگز کو مناسب وقت دیں گے اور ان کی تمام شکایات دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

اس سلسلے میں بھی ہم آپ کو ایک مفید مشورہ دے سکتے ہیں اور یہ مشورہ ہے پیغامات کا۔ آج کے تیز اور ترقی یافتہ دور میں پیغامات نہایت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ اپنے عزیز و اقارب کو کارڈز وغیرہ بھیج کر بھی اپنی خواہشات اور نیک تمناؤں کا اظہار کرسکتے ہیں، اس طرح آپ اپنے چاہنے والوں کو اس بات کا احساس دلاسکتے ہیں کہ آپ ہر دم ان کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن ظاہر ہے اپنی ضروری مصروفیات کے باعث ان سے ملنے سے قاصر ہیں۔

صحت مند جسم، صحت مند دماغ:۔ ہمارے دماغ کا تعلق براہ راست جسم سے ہوتا ہے اور جسم کے صحت مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی خوراک، ورزش اور بہتر نشوونما پر غور کریں۔ ہمیشہ صحت مند غذا کو ترجیح دیں، اپنی نارمل غذا میں ہری سبزیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ دوسرے تمام کاروباری معاملات کی طرح صحت میں بھی اپنے ٹارگٹ بنائیں اور انہیں حاصل کرنے کے لیے سخت محنت اور توجہ سے غذا اور ورزش پر زور دیں۔

آپ کا ذہن جتنا زیادہ تندرست ہوگا، آپ کا رویہ اور اخلاق اتنا ہی بلند ہوگا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ جو لوگ دبلے پتلے ہوتے ہیں انہیں بے حد غصہ آتا ہے اور بزرگوں کی یہ بات آج جدید سائنس کی تحقیق نے سچ ثابت کردی ہے۔ کمزور جسم، ذہن کی علامت ہے اور کمزور ذہن والے لوگ اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔

کچن اور آپ

امن علی

س: "کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟"

ج: "میں اور میرے گھر والے کھانے کے لیے جیتے ہیں۔ ہمارا ماننا ہے کہ فل ہو کر کھائیں کیونکہ پینے کی چیزوں کے لیے جسم میں کریکز ہوتے ہیں اور میٹھے پر ہم سب جان دیتے ہیں۔ کسی قسم کا بھی میٹھا ہو، سب بہن بھائی ایسے ٹوٹ پڑتے ہیں، جیسے میٹھے پر مکھیاں، ہاہاہا۔ بقول امی کے میٹھا دکھا کر ہمیں آسانی سے اغوا کیا جا سکتا ہے۔ لوگ خوشی کے مواقع پر مٹھائی لاتے ہیں، ہم مٹھائی لا کر خوش ہوتے ہیں۔ مٹھائی بے شک روز آجائے گھر میں، ہمارا یہ حال ہوتا ہے۔"

ساڈے گھر آئی مٹھائی، لکھاں خوشیاں نال لے آئی

س: "گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟"

ج: "کچن سے دلچسپی بالکل بھی نہیں۔ امی نے زبردستی ذمہ داری ڈالی ہوئی تھی اور اب ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہاں ڈائجسٹ پڑھنے کی شوق نے کچن سے دلچسپی اور شوق کا مرض لگا دیا ہے کیونکہ بہنوں کی دی گئی ٹپس کہ باوضو ہو کر، درود شریف پڑھ کر، سر ڈھانپ کر کھانے پکانے سے کھانے بہت اچھے بنتے ہیں۔ بچے اور عزیز و اقارب شوق سے کھاتے ہیں۔ کھانے بدمزا نہیں پکتے، اس لیے اب شوق اور دلچسپی سے کچن میں جاتے ہیں۔"

س: "ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہی پکے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟"

ج: "ہائے۔ یہ کیا پوچھ لیا ظالم۔ مجھے تو آپ کے سوال سے ہی اختلاف ہے، آپ کو پوچھنا چاہیے تھا ضروری نہیں کہ کھانا ہر دفعہ ہی بدمزا پکے کبھی نتیجہ برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ تب گھر والوں نے کہا کہ یقین نہیں آتا کہ تمہیں کھانا بنانا آ گیا ہے ورنہ ہمارے منجھلے بھائی کہتے تھے کہ جو بدمزا کھانا پکے وہ ہماری بہنا نے پکایا ہے جب میں کہتی کہ میں نے نہیں پکایا تو کہتے کہ ضرور کھانے میں ڈوئی تم نے چلائی ہو گی جب میرا انکار ہوتا تو تسلی سے کہتے ضرور کچن میں تمہارا گزر ہوا ہو گا۔ تو سب ہنس کر یقین کر لیتے جب بہنوں، بھابیوں اور کزنز کے لیے چائے بنانے کے لیے اٹھتی تو سب کہتے ہیں تمہارے ہاتھ کی بنی چائے پی کر چائے کی عادت چھوٹ جائے گی۔ بہنوئی صاحب کہتے ہیں جو ہارٹ پیشنٹ ہیں کہ جن کھانوں سے ڈاکٹر نے منع کیا، آپی سے بنوا کر کھا لیتا ہوں تاکہ آسانی سے پرہیز کر لوں گا۔ امی کہتی تھیں کہ بوڑھی ہو گئی مگر کھانا بنانا نہ آیا۔ (یاد رہے یہ تبصرہ آج سے دس پندرہ سال پہلے کا ہے)

س: "کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھواں ہوا؟ اس سے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟"

ج: "دھواں کھانا بدمزا ہوتا ہے اور ہمارے کھانے کا دھواں ہونا ضروری نہیں۔ میں ہمیشہ فارغ وقت میں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں یعنی کام کے وقت کام اور تھکاوٹ کے بعد تروتازہ ہونے کے لیے مطالعہ۔"

س: "عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "ان" کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے، آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟"

ج: "میں بالکل اتفاق نہیں کرتی۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ میرا تجربہ مختلف ہے بعض اوقات آپ کی فرماں برداری، نیک سیرت، خوب صورتی، کم عمری اور کم گوئی کچھ بھی ان کے دل میں نہیں اتر پاتی۔"

س: "لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں۔"

ج: "ہم سے تو کوئی فرمائش نہیں کرتا تھا۔ ہم خود فرمائش کرتے کہ ہم سے بھی کوئی فرمائش کر کے کچھ پکوائے مگر......

حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا جائے

لیکن اب یہ حسرت نہیں رہی۔ درود شریف زندہ باد۔ میں سادہ کیک بہت اچھا بناتی ہوں۔ بیٹی اور بھابیاں، ان

کے شوہر اور بچے اسی کی فرمائش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے بڑے دیگچے میں ایک سلور یا اسٹیل کی کٹوری اوندھی کرکے رکھ دیں۔ ڈھکن دے کر دیگچے کو بند کریں اور آگ جلا کر گرم کریں۔ اب ایک برتن کو گھی لگا کر گریس کر کے رکھ دیں، تین کپ میدے میں دو چائے کے چمچے بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچہ میٹھا سوڈا اور آدھا چائے کا چمچہ نمک ڈال پانچ دفعہ چھان لیں۔ ایک اور برتن میں تین انڈوں کی سفیدیاں ڈال کر پھینٹ کر جھاگ بنالیں۔ اب اس میں دو کپ پسی چینی ڈال کر مزید پھینٹیں پھر اس میں زردیاں، آدھا کپ دودھ اور ایک کپ آئل ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور اب میدہ چھنا ہوا ڈال کر مکس کرلیں اور گریس کیے ہوئے برتن میں ڈال کر دیگچے میں رکھ کر (اوندھی کٹوری کے اوپر) ڈھکن بند کردیں۔ آنچ درمیانی کریں اور پچاس منٹ بعد چیک کرلیں، مزے دار کیک تیار ہے۔ اگر چاکلیٹ کیک بنانا ہے تو میدے کے تین بڑے والے چمچے نکال کر اس میں کوکو پاؤڈر ڈال دیں۔"

س: "پہلی ڈش کون سی بنائی تھی؟ اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے؟"

ج: "ساڑھے سات سال کی عمر میں مسور اور مونگ کی دال بنائی تھی۔ ہوا یوں کہ امی ابو چھوٹے بھائی کے ساتھ خالہ کے گھر فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شام میں امی ابو آئیں گے، سالن نہیں ہوگا تو میں بنالیتی ہوں۔ ہمسائی سے روٹیاں بنوالی تھیں' پسماندہ گاؤں تھا، پکا ہوا کچھ بھی نہیں ملنا تھا تو یاد کرکے کہ امی دال کیسے بناتی ہیں۔ دال چن کر دھوئی' دیگچی میں پانی ڈال کر نمک، مرچ مسالے ڈال کر دال پکائی مگر یہ کیا، تین چار گھنٹوں بعد بھی دال نظر ہی نہیں آرہی تھی کیونکہ پانی بے حدوحساب ڈال دیا تھا، میں رونے والی تھی کہ امی تو کتنی جلدی پکالیتی ہیں۔ دال نہ بنی مگر امی ابو جی واپس آگئے، بڑے تینوں بھائی ہنس رہے تھے کہ دال کہاں سے ڈھونڈیں۔ امی ڈانٹ رہی تھیں کہ جل جاتی تو' ابو خوش ہو رہے تھے کہ بیٹی ذمہ دار ہوگئی ہے۔ ابو جی فش پکوڑے لائے تھے۔ اس سے سب نے روٹی کھائی۔ یہ بات ہے کہ پہلی ڈش میں پانی کا ناکہ کھولا تھا تو یہ عادت ادھیڑ عمر تک رہی۔ ہر چیز میں نجانے کیوں پانی زیادہ سے زیادہ ڈل جاتا تھا، ہر چیز پتلی بن جاتی تھی۔ بھابھیاں اب بھی کہتی ہیں کہ آپ کا نعرہ لگایا اور شوربے والا سالن پک گیا۔ لیکن خیر اب تو دس سالوں سے میں پانی ناپ کے ڈالتی ہوں، اندازے سے نہیں۔"

س: "کون سی ڈش دیکھ کر گھر کے مردوں کو غصہ آتا ہے اور پھر ان کیا ردعمل ہوتا ہے؟"

ج: "گھر کے مردوں میں صرف ایک بیٹا ہے، جو مٹر اور پھلیوں کے علاوہ کوئی سبزی نہیں کھاتا۔ صرف دالیں کھاتا ہے۔ جب کوئی سبزی بنتی ہے تو اسے رائتہ یا آملیٹ بنا دیتی ہوں۔ وہ بس ایک ہی جملہ بولتا ہے کہ ماما کچھ اور نہیں ملا تھا پکانے کو۔ اچھلتا ہے اور غصہ کرتا ہے اور میں کہتی ہوں میری مستقبل کی بہو کو ہمارے گھر میں صرف دال پکنے کی ہی تکلیف ہوگی۔"

س: "ایسے کون سے رشتہ دار ہیں جن کی تواضع کے لیے آپ کو کچن میں جانا ناگوار گزرتا ہے؟"

ج: "پہلے ناگوار گزرتا تھا لیکن جب سے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے خوش ہوتا ہے، اس کے گھر مہمان بھیجتا ہے اور یہ حدیث بھی پڑھی کہ مہمان جاتے ہوئے میزبان کے گھر سے بلائیں لے جاتا ہے تو مہمانوں کا انتظار کرتی ہوں اور خوشی خوشی محدود بجٹ کے مطابق میزبانی کرتی ہوں۔"

س: "سسرال میں پہلی چیز کیا بنائی؟"

ج: "چاولوں کا زردہ بنایا تھا۔ تین کلو چاولوں کا کیونکہ محلے میں بانٹنا تھا لیکن وہ چاول تھوڑے بیٹھ گئے تھے پھر بھی اچھے بنے تھے۔"

س: "آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش؟"

ج: "بیسن کا حلوہ۔ سب لوگ شہری ہوں یا دیہاتی سب ہی پسند کرتے ہیں۔ ایک پاؤ گھی میں ایک پاؤ بیسن چھان کر بھونیں، جب ڈارک براؤن ہوجائے تو چینی بھی ایک پاؤ ڈالیں۔ چولہے سے اتار کر چمچہ چلائیں اور ایک کپ پانی ڈال لیں۔ میوہ جات جو بھی ڈالنے ہوں، صاف کرکے دھو کر ڈال دیں، چولہے پر رکھ کر ہلکی آنچ پر مسلسل چمچہ چلا کر بھونیں۔ جب حلوہ گھی چھوڑے تو اتار لیں، بہت ہی مزیدار حلوہ تیار ہے جو دماغ کی صحت کے لیے بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

کھٹی ارد کی دال

اجزاء:۔

ارد کی دال (ابلی ہوئی)	دو کپ
دہی	آدھا کپ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسا سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
بھنا بیسن	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	حسب ضرورت
ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک	گارنش کے لیے

بگھار کے لیے:

گھی	چار کھانے کے چمچے
ثابت لال مرچ	چار سے پانچ عدد
کڑی پتا	چھ عدد
پیاز سلائس	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ایک پیالے میں دہی، بیسن، نمک، پسی لال مرچ، ہلدی اور زیرہ اچھی طرح مکس کریں اور ابلی ارد کی دال میں مکس کردیں۔ پھر ایک کپ پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں، ساتھ ہی مسلسل چمچہ چلاتے رہیں۔ دس منٹ بعد آنچ دھیمی کر کے اتنا پکائیں کہ دال گاڑھی ہوجائے۔ اس میں لیموں کا رس ڈال کر مکس کرلیں۔ بگھار کے لیے گھی گرم کر کے ثابت لال مرچ، کڑی پتا اور پیاز سلائس سنہرا کر کے دال پر بگھار لگادیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک اور پسا گرم مسالا سے گارنش کر کے روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

مونگ کی دال کا حلوہ

اجزاء:۔

مونگ دال	ایک کپ
گھی	آدھا کپ
دودھ	ایک کپ
ہری الائچی	آدھا چائے کا چمچہ
زعفران ایسنس	چند قطرے
کشمش	دو کھانے کے چمچے
بادام	دو کھانے کے چمچے
کھویا	تین چوتھائی کپ

ترکیب:۔

مونگ کی دال کو رات بھر کے لیے بھگودیں، پھر پیس لیں۔ ایک پین میں گھی گرم کریں پھر اس میں پسی دال ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں۔ چمچہ مستقل چلاتی رہیں۔ جب دال سنہری ہوجائے تو الائچی ڈال دیں۔ دوسرے پین میں دودھ ابال کر اس میں چینی کو حل کرلیں اور حلوہ میں شامل کردیں اور ہلکی آنچ پر بھونتی رہیں۔ جب حلوہ لائٹ براؤن ہوجائے تو کھویا اور زعفران شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور چولہے سے اتارلیں۔ بادام اور کشمش سے گارنش کر کے پیش کریں۔



مکسڈ اچاری دال



اجزاء:۔

چنے کی دال	ایک چوتھائی کپ
مونگ کی دال	ایک چوتھائی کپ
ارہر کی دال	ایک چوتھائی کپ
مسور کی دال	ایک چوتھائی کپ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
پسی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
سرسوں	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی پیاز	دو کھانے کے چمچے
میتھی دانہ	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ

بگھار کے لیے:۔

کڑی پتے	بیس عدد
کٹا لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
گھی	آدھا کپ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

دالوں کو گلنے تک ابال کر گھونٹ لیں اور ایک پین میں ایک چوتھائی کپ گھی ڈال کر پیاز براؤن کریں۔ پھر نمک، پسی مرچ، ہلدی، پسا دھنیا اور تمام ثابت مسالے شامل کر کے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ بگھار کے لیے ایک چوتھائی کپ گھی کو گرم کریں اور ثابت لال مرچ، کٹا لہسن، کڑی پتا اور ثابت زیرہ شامل کریں اور دال پر ڈال کر پیش کریں۔

چنے کی دال بھری شملہ مرچ

اجزاء:۔

چنے کی دال	ایک پاؤ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا	آدھا کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	آدھا کھانے کا چمچہ
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	چار عدد
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
شملہ مرچ	آٹھ عدد
سونف	آدھا کھانے کا چمچہ
کلونجی	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانی)	دو عدد
کوکنگ آئل	ایک کپ

ترکیب:۔

دال کو ابال کر خشک کر لیں۔ اس کے بعد چنے کی دال میں تمام مسالے سوائے ہرا دھنیا کے اچھی طرح ملا لیں۔ اس کے بعد شملہ مرچ کو اوپر سے کاٹ کر اس کے اندر جو مسالا تیار کیا ہے اس کو بھر دیں۔ پھر شملہ مرچ کا منہ کٹے ہوئے حصے سے ٹوتھ پک لگا کر بند کر دیں۔ ایک کھلے منہ کی پتیلی میں جو مسالا رہ گیا ہے۔ اس کو نیچے بچھا کر اوپر شملہ مرچ رکھ دیں اور اوپر آئل ڈال دیں پھر دم پر رکھ دیں۔ پتیلی میں چمچہ نہیں چلائیں، کپڑے سے پکڑ کر ہلائیں۔ شملہ مرچ کا پانی خشک ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اور ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔